www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاہدہ طلعت

پتھر کا گداز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پتھر کا گداز

شاہدہ طلعت

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 ، 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انتساب

امی جان اور ابا جان کے نام.........

جنہوں نے مجھے بولنا، پڑھنا

اور لکھنا سکھایا۔

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل 2010ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

ڈیزائن .... ذاکر

کمپوزنگ .... کلاسکس گرافکس

قیمت .... -/300روپے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہاری نظریں ہر جگہ' ہر لمحہ میرا پیچھا کرتی ہیں۔ سوتے جاگتے' اُٹھتے بیٹھتے' کہیں بھی تو مجھے ان سے پناہ نہیں۔ وہ نفرت سے بھرپور طنز میں ڈوبی ہوئی نگاہیں میرے اردگرد چاروں طرف تھرکتی ہیں' اور استہزائیہ قہقہے لگاتی ہیں۔ ہاں میں جانتی ہوں تمہیں مجھ سے نفرت ہے' مگر کیوں......؟ اس سوال کا جواب شاید میں کبھی نہ پا سکوں۔ میں نے کئی بار چاہا تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نفرت کا بھرپور جواب دوں' لیکن جانے کیا ہوا' ہر بار میری آنکھیں جھک گئیں۔ شاید میں تمہاری آنکھوں کی چمک سے مرعوب ہو گئی' یا کوئی اور بات تھی' اور تمہاری آنکھیں مجھ پر ہنس رہی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں' تم کبھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ تمہارا ہونٹوں کو بھینچ کر حقارت سے مسکرانا کہ دوسرے تمہارے سامنے اپنے آپ کو بہت پست' بہت حقیر سمجھنے لگیں۔

یوں لگتا تھا' جیسے تمہاری نظروں میں ساری دنیا' سب لوگ بے حد حقیر ہوں' اور تم بہت اونچائی پر کھڑے ان کے گھٹیا پن پر ہنس رہے ہو۔ میں نے کئی بار چاہا تمہیں کوئی اہمیت نہ دوں۔ بالکل نظر انداز کر دوں۔ تم جو بے حد معمولی' بالکل عام سے شخص ہو' لیکن ہر بار تم نے میرے سامنے آ کر کہا۔

''سنو شہنیلا احمد! تم مجھے کبھی نظر انداز نہ کر سکو گی۔''

''اور میں تمہیں کبھی نظر انداز نہ کر سکی۔ تمہاری بظاہر بالکل غیر اہم' بے حد معمولی شخصیت اس طرح مجھ پر چھائی۔ اس طرح چھائی کہ مجھے اپنے چاروں طرف تمہارے سوا کچھ نظر نہیں آیا' اور تمہاری گہری سیاہ آنکھیں' جن میں نفرت چمک رہی تھی' کسی آسیب کی طرح

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھ سے لپٹ گئیں۔ میں نے تمہیں بھلانا چاہا لیکن مجھے اس احمقانہ خیال پر ہنسی آ گئی۔ میں نے چاہا اپنے آپ کو بھول جاؤں لیکن تمہاری سیاہ آنکھیں لپک کر میرے سامنے آ گئیں۔ اور مجھے یاد آ گیا کہ ہاں یہ میں ہوں جس سے تم نفرت کرتے ہو۔ میں نے کتاب کے مضمون میں پناہ لی اور مجھے ہر صفحے پر وہی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آ گئیں جن سے میں بچنا چاہتی تھی۔ میں نے دنیا کے شور و غل میں گم ہونا چاہا لیکن تمہاری آنکھیں میرا پیچھا کرتے کرتے نہ تھکیں۔ بالآخر میں ہار گئی۔ میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور اب سر جھکائے بیٹھی اپنی شکست کا سوگ منا رہی ہوں۔ آؤ...... اور مجھ پر ہنسو کہ میں جو اپنے کالج کی بیوٹی کوئین تھی اور کبھی کسی کی محبت بھری نگاہوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی اپنی شخصیت کے تمام تر حسن کے باوجود تمہارے سامنے تمہاری نفرت سے لبریز نگاہوں کے سامنے جھک گئی ہوں۔ حالانکہ میں نے ہمیشہ تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے نفرت ہی دیکھی اور یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ تمہاری نفرت سے بھرپور نگاہوں نے میرے دل کے تاروں کو چھو لیا نفرت نے محبت کو جیت لیا میں ہار گئی اب میں اپنے ریزہ ریزہ دل کو سنبھالنے کی کوشش میں بکھری جا رہی ہوں۔ تم نے مجھے ہر مقام پر ہرا دیا ہے وقار۔

میں نے پہلی بار تمہیں نوید کی سالگرہ پر دیکھا تھا۔ وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی۔ میں انجم شازیہ اور فرحانہ کے ساتھ ایک کونے میں کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ شازیہ نے اچانک میرے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"انجم...... نوید بھیا کے ساتھ یہ جنگلی سا لڑکا کون ہے؟"

"کیوں...... کیا کوئی خاص کام ہے اس سے۔" انجم نے شرارت سے پوچھا۔

"واہ...... مجھے کیوں کوئی کام ہونے لگا۔ تم ہر بات کا اُلٹ مطلب لیتی ہو۔" شازیہ نے بگڑ کر کہا۔

"تو پھر تم خصوصیت سے اسی کے متعلق کیوں پوچھ رہی ہو۔" انجم نے چھیڑا۔

میں نے ہنستے ہوئے مڑ کر دیکھا اور وہ تم تھے۔ بادامی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس سانولے سلونے سے سیاہ بال تمہاری پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ہونٹوں میں طنز آمیز سا کھنچاؤ تھا۔ کوئی بھی تو خاص بات نہ تھی تم میں وہاں اچھے سمارٹ مہذب اور شاندار اور چمکتے دمکتے لوگوں کے درمیان تمہاری شخصیت اس قدر غیر اہم اور معمولی تھی کہ شاید ایک نظر ڈال کر

پھر میں تمہاری طرف توجہ نہ دیتی لیکن اس لئے جب میں تمہارا جائزہ لے رہی تھی تم نے اچانک سر اُٹھایا اور تمہاری نظریں مجھ سے ٹکرائیں اور میں نے واضح طور پر اس نفرت کو محسوس کیا جو تمہاری آنکھوں میں نمودار ہوئی اور میں نے گھبرا کر چہرہ موڑ لیا۔

"عجیب احمق شخص ہو...... بھلا تمہارا مجھ سے کیا واسطہ یہ بلاوجہ کی نفرت کیوں؟" مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔

"تو پھر کیا تمہارے متعلق پوچھتی۔" شازیہ انجم سے اُلجھ رہی تھی۔ "اس کے سوا یہاں کون اجنبی ہے؟"

میں انہیں اُلجھتا چھوڑ کر وہاں سے ہٹ آئی۔ ایک بار پھر میں نے چور نظروں سے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہارے کپڑوں پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی تم بستر سے اُٹھ کر آ رہے ہو اور تمہارے روکھے پھیکے چہرے پر رعونت طاری تھی۔ اس قدر شدید سردی میں تم صرف کرتا شلوار میں تھے اور تمہارے جسم پر ایک جرسی تک نہ تھی۔

"اونہہ گنوار کہیں کے کسی محفل میں شریک ہونے کا سلیقہ نہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اصل میں اس طرح میں نے تم سے تمہاری نفرت بھری نگاہوں کا بدلہ لینا چاہا تھا لیکن جب میں حقارت سے تمہارے لباس کی شکنوں کو دیکھ رہی تھی میرے دل نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اسے شعور تو ہو مگر اس کے پاس گرم لباس نہ ہو شاید اُسے نہایت مجبوری کے عالم میں یہاں آنا پڑا ہو۔"

مجھے اپنے ڈھیروں سوئیٹر جیکٹ اور گرم کوٹ یاد آ گئے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ غصہ جو مجھے تم پر ہے رحم میں بدل گیا ہے اور مجھے اپنی توہین کا وہ احساس نہیں رہا جو تمہاری نگاہوں نے دلایا تھا۔ نوید ہر ایک سے تمہارا تعارف کراتا پھر رہا تھا کیونکہ تم وہاں بالکل اجنبی تھے۔ میں اس وقت ہما کو ڈھونڈ رہی تھی جب نوید اسے ساتھ لیے میرے پاس آیا۔

"نیل...... یہ میرے بہت ہی پیارے دوست وقار عالم ہیں اور یہ میری کزن شہلیہ احمد...... غالباً ان کا نمبر بیسواں ہے کیوں وقار۔"

"شاید......"

تمہارے لہجے میں دسمبر کی اس ٹھٹھرتی شام سے بھی زیادہ خنکی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

”کیا مطلب......؟“ میں نے نوید کو گھورا۔

”مطلب یہ کہ اس تھوڑے سے وقت میں وقار کو میں بیس انتہائی اہم اور یادگار زمانہ قسم کی بہنوں سے متعارف کرا چکا ہوں۔“

”خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

تم نے کہا‘ لیکن تمہارے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی جھلک بھی نہ تھی‘ اور تم کچھ بیزار بیزار سے لگ رہے تھے۔

”مجھے بھی......“ میں مسکرائی‘ لیکن تم اخلاقاً مسکرا بھی نہ سکے۔ تب ہی مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ تمہاری آنکھیں خاصی خوبصورت ہیں‘ اور آنکھیں ہی نہیں‘ تمہارے گھنے سیاہ بال بھی خاصے پُرکشش ہیں۔ تمہارا لانبا قد‘ اونچی پیشانی‘ کھڑی ناک اور خوبصورت آنکھیں‘ ان سب چیزوں کو تمہاری رنگت نے دبا دیا تھا۔ تمہاری رنگت پر تو فوراً ہی نظر پڑ گئی تھی‘ لیکن تمہارے نقوش کا حسن دھیرے دھیرے اُجاگر ہوتا تھا۔ جب میں خوب غور سے تمہیں دیکھ رہی تھی‘ تو ایک دم تم نے میری طرف دیکھا‘ اور تمہاری پیشانی پر بل پڑ گئے۔

ایک بار پھر تمہاری سیاہ پتلیوں میں تیرتی ہوئی نفرت کو میں نے صاف محسوس کیا‘ اور مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا۔ میں نے تو آج سے پہلے کبھی تمہیں دیکھا تک نہ تھا‘ تو پھر کیا تمہاری آنکھیں جھوٹ بول رہی تھیں‘ یا وہ صرف میرا واہمہ تھا‘ میں کچھ سمجھ نہ سکی۔ اور تم نوید کا بازو پکڑے آگے بڑھ گئے۔

پھر میں نے تمہیں پارٹی کے اختتام پر دیکھا۔ نوید تمہیں اپنا اوورکوٹ دے رہا تھا‘ اور تم انکار کر رہے تھے۔ میں کچھ فاصلے پر تھی‘ اس لئے تمہاری باتیں تو نہ سن سکی‘ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ تم نے اوورکوٹ لے لیا ہے‘ اور نوید تمہیں چھوڑنے دروازے تک جا رہا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد میں نوید کے ساتھ مل کر تحائف کے پیکٹ کھولنے لگی۔ مجھے یہ تجسس بھی تھا کہ تمہارا دیا ہوا تحفہ دیکھوں۔ شاید اس طرح میں تمہارے ذوق کا اندازہ لگانا چاہتی تھی یا حیثیت کا‘ خود میرے اپنے ذہن میں کوئی بات واضح نہ تھی‘ لیکن میز خالی ہوگئی اور تمہارا دیا ہوا تحفہ نظر نہ آیا۔

”تمہارے اس دوست نے تمہیں کچھ نہیں دیا؟“ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

”کس نے؟“ نوید نے چونک کر پوچھا۔

”اسی وقار عالم نے‘ جسے تم ساتھ لئے پھر رہے تھے۔“

”ارے ہاں......“ بینا میرے کندھوں پر جھک آئی۔

”یہ تم اسے کہاں سے پکڑ لائے؟“

”میں اپنے دوست کے متعلق اس انداز میں گفتگو بالکل پسند نہیں کرتا‘ سمجھیں۔“ نوید نے بینا کو گھورا‘ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”ایک مخلص دوست سے بڑھ کر قیمتی تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یوں بھی وقار ایسا آدمی نہیں کہ رسمی تکلفات میں پڑ کر وقت ضائع کرے۔ ہماری دوستی ان چیزوں سے بالاتر ہے۔“

”تاکہ پلے سے کچھ دینا نہ پڑے۔ ٹٹ پونجیا کہیں کا۔“ بینا نے چمک کر رہا۔

”خبردار جو میرے دوست کو کچھ کہا تو۔“ نوید کو غصہ آ گیا۔

”واہ بڑے آئے دوست بنانے والے۔ کیا سرخاب کا پر لگا ہے تمہارے اس کالے کلوٹے دوست میں۔“ بینا چڑ گئی۔

”تم کون سی گوری ہو۔“

نوید نے اس کے سانولے رنگ پر چوٹ کی۔

”تمہارے دوست کے سامنے تو میں گوری ہی لگتی ہوں‘ ایمان سے۔“

”اچھا بکو مت۔“

نوید نے اسے ڈانٹ دیا۔

تب ہی چوکیدار نوید کا اوورکوٹ لے کر آ گیا۔ تم نے نوید کے اصرار سے مجبور ہو کر اوور کوٹ لے تو لیا تھا‘ لیکن پھر کھڑے ہوئے چوکیدار کے ذریعے اسے واپس لوٹا دیا۔ نوید کا رنگ بدل گیا۔ اس نے غصے سے کوٹ ایک طرف پھینکا‘ اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

اس رات جب میں اپنی قیمتی بیڈ پر لیٹی‘ تو مجھے تمہارا خیال آ گیا۔ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ وہ بلاوجہ کی نفرت‘ جو تمہاری آنکھوں سے جھلک رہی تھی‘ میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ آخر میں نے تمہارا کون سا جرم کیا تھا؟ کون سا گناہ سرزد ہوا تھا مجھ سے؟ ایک دم مجھے جھنجھلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ آخر میں ایک اجنبی شخص کے متعلق کیوں سوچے جا رہی ہوں؟ میرا تم سے واسطہ ہی کیا۔ میں نے اُٹھ کر ہیٹر کا سوئچ آف کر دیا‘ کیونکہ کمرہ خاصا گرم

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوگیا تھا' اور کندھوں تک لحاف اوڑھ لیا' لیکن جب میں نے سونے کے لئے آنکھیں بند کیں' تو ایک بار پھر تم چپکے سے میری آنکھوں میں گھس آئے۔ اس کڑکڑاتے جاڑے میں تم کیسے گھر تک گئے ہو گے' جب کہ تمہارے جسم پر کوئی گرم کپڑا تک نہ تھا' میرا دل تمہارے لئے ہمدردی سے بھر گیا' اور تم کس قدر خوددار تھے کہ تم نے نوید کا کوٹ گیٹ پر سے ہی واپس لوٹا دیا' حالانکہ اگر تم اسے پہن لیتے تو کوئی حرج نہ ہوتا۔ آخر نوید تمہارا دوست تھا' بے حد مخلص اور بہت پیارا دوست' لیکن تم نے اپنے جنگلی پن میں اس کے خلوص کو مجروح کیا' اور اس کے جذبات کی پرواہ نہ کی۔

تم جیسا اکھڑ انسان بھلا دوستی کے لطیف جذبے کو کیا جانے۔ جب چوکیدار کوٹ لے کر آیا تھا' تو نوید کا کیا ذرا سا منہ نکل آیا تھا' جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ ہر کوئی تمہاری طرح پتھر کا بنا ہوا تو نہیں ہوتا نا۔ کچھ لوگوں کے جذبات شیشے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ بے چارہ دیدی! اور تم اس سردی میں گرم لباس کے بغیر پھر رہے تھے۔ کاش میں تمہارے لئے ایک جرسی بن سکتی۔ لمحے بھر کے لئے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی' اور مجھے ہنسی آ گئی۔ اللہ کیا مصیبت ہے' میں بھلا کیوں ایک اجنبی شخص کے متعلق اس طرح سوچے چلی جا رہی ہوں۔ اور پھر بننا تو دور کی بات' مجھے تو سلائیاں تک پکڑنا نہیں آتیں۔ اگر میں بننا سیکھ لوں تو' توبہ کیا فضول سی خواہش ہے۔ تم جیسے اکھڑ اور بداخلاق شخص کے متعلق اس طرح سوچنا کس قدر احمقانہ بات ہے' توبہ ہے میری۔ میں نے تکیے میں منہ چھپا لیا' اور تمہارے خیالات سے الجھتی جانے کب سو گئی۔

* + *

آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا' میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا۔ سنہری دھوپ درختوں پر چمک رہی تھی۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لئے میں لان میں آ گئی۔

"ہیلو......" نوید سنگھے کی باڑ کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔

"کیا حال ہے؟"

"فائن......" میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

"تم سیر کے لئے نہیں گئے۔"

"تمہارے بغیر بھلا کیا لطف آتا۔"

"اچھا...... بڑی محبت ہے مجھ سے۔"

"کیوں...... تمہیں کوئی شک ہے؟"

"تم پر شک کر کے مجھے اپنا ایمان تو خراب نہیں کرنا۔"

"لڑکی سمجھدار ہو۔" نوید نے مطمئن ہو کر کہا۔

"خیر نہاری کھانی ہے تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"او کے...... ابھی آئی دو منٹ میں۔ یوں بھی ابھی میں نے ناشتہ نہیں کیا۔" میں نے تیزی سے جاتے ہوئے کہا۔

ابھی تیار ہی ہو رہی تھی کہ نوید نے گاڑی کا ہارن بجانا شروع کر دیا' جلدی جلدی میں نے بال بنائے اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

"توبہ ہے تم سانس بھی نہیں لینے دیتے۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تمہارے دو منٹ نہیں ہوئے؟" نوید نے گھورا۔

"تم کسی فیشن پریڈ میں تو نہیں جا رہی تھیں' جو تیاری میں گھنٹہ بھر لگ گیا۔"

"تو کیا اسی طرح سلیپنگ ڈریس میں اٹھ کر چل دیتی' اور یہ بینا کہاں رہ گئی؟" میں نے نوید سے پوچھا۔

"وہ تو ابھی پڑی سو رہی ہے۔ رات دیر سے سوئی تھی نا۔"

"تو جگا لیتے نا اسے بھی' پھر وہ ناراض ہو گی۔"

"مجھے یہاں ہی بارہ نہیں بجانے تھے۔" نوید نے برا سا منہ بنا کر کہا' اور میں چپ ہو گئی۔

جب ہم حاجی بابا کے ہوٹل سے نہاری کھا کر باہر نکلے' تو نوید نے پوچھا۔

"کیا خیال ہے چائے کا ایک ایک کپ ہو جائے؟"

"ضرور...... نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"بڑی ندیدی ہو۔" نوید نے چھیڑا۔

"کھانے پینے کا معاملہ ہو اور تم انکار کر جاؤ...... ناممکن۔"

"مجھے کوئی کفرانِ نعمت کا مرتکب تو نہیں ہونا نا۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تب ہی میری نظر تم پر پڑی' اور میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ تم اس وقت بھی بادامی رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس تھے' اور تیز تیز قدموں سے سڑک کراس کر رہے تھے۔

''کیا بات ہے' وہاں ہی کیوں جم گئیں۔''

نوید نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے پکارا۔

''لیکن اس پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی' اس نے تمہیں دیکھ لیا۔

''اوہو...... یہ تو وقار ہے۔''

وہ گاڑی سے اتر آیا' اور لپک کر تمہارے قریب جا پہنچا۔ تم نے چونک کر سر اٹھایا۔ نوید کو دیکھ کر تمہارے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری' اور معدوم ہو گئی۔ تب نوید سے ہاتھ ملاتے ہوئے اچانک تمہیں میری موجودگی کا احساس ہوا' اور تمہاری نظریں لمحے بھر کے لئے میرے چہرے پر ٹک گئیں۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اس نفرت کو کھوجنا چاہا' جو میں نے اپنے لئے تمہاری آنکھوں میں دیکھی تھی۔ لیکن تمہاری آنکھیں گلابی ہو گئیں' اور ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''اللہ...... کیا ہو گیا ہے اس شخص کو' کیوں بلاوجہ میرا دشمن بنا ہوا ہے۔'' میں نے دل میں سوچا' اور چپکے سے تمہیں دیکھا۔ تم نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا لی تھیں' اور نوید سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا' اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

نوید اور وقار سڑک سے ہٹ کر گاڑی کے قریب کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ میں بظاہر انہیں نظر انداز کیے ونڈ سکرین سے باہر دور تک پھیلی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگی۔ لیکن میرے کان ان کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

''خدا کی قسم وقار...... میں تم سے بہت ناراض ہوں۔'' نوید منہ پھلائے کہہ رہا تھا۔

''مجھ سے کون ناراض نہیں ہے۔'' وقار نے کہا۔

''عموماً لوگوں کو مجھ سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے' اسی لئے میں کہتا تھا مجھ سے دوستی نہ کرو۔''

''تو تم مجھے اس کی سزا دینا چاہتے ہو...... کیوں؟''

''جو بھی سمجھ لو......'' وقار نے لاپروائی سے کہا۔

''بھائی وقار...... بات یہ ہے کہ مجھ میں اور جھاڑ کے کانٹے میں صفات کے لحاظ سے کچھ تھوڑا بہت ہی فرق ہے۔ اس لئے یہ مت سوچو کہ میں اس طرح تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں' سخت ڈھیٹ ہو۔''

''ذرہ نوازی ہے حضور کی۔''

''خیر ناراض کس بات پر ہو۔''

''اس بات پر کہ تم نے میرا کوٹ میرے منہ پر پھینک مارا۔ اس میں کوئی خطرناک جراثیم تو نہ لگے تھے' جو تمہیں لپٹ جاتے۔''

''اوہو۔'' وقار نے گہری سانس لی۔ ''اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تو سمجھا تھا۔''

''بات تو بہت بڑی ہے۔'' نوید نے اس کی بات کاٹی۔

''ذرا خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو' اگر میں یوں تمہارا کوٹ تمہارے منہ پر پھینک مارتا تو کیا تمہارے جذبات مجروح نہ ہوتے' دوست کا دوست پر کچھ حق ہوتا ہے آخر۔''

''دوست۔'' وقار ہونٹ بھینچ کر مسکرایا۔

''کیا یہ بھی اس دنیا کی مخلوق ہے...... اونہہ دوست۔'' وہ پھر ہنسا' اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''میں کسی قسم کے حق کو نہیں مانتا۔'' اس نے ترشی سے کہا۔

''چلو چھٹی ہوئی۔'' نوید نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں ہر قسم کے حق سے مستثنٰی قرار دیتا ہوں۔ کسی حق کو مانو نہ مانو' تمہاری مرضی۔ میں بہرحال تمہارا دوست ہوں۔''

''دوستی کا مفہوم سمجھتے ہو۔'' وقار نے نوید کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''آف کورس مائی لارڈ۔'' نوید نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ ''جان مانگو تو حاضر ہے۔ لگتا ہے ابھی تک تمہارا واسطہ کسی خالص قسم کے دوست سے نہیں پڑا۔ دراصل آج کل دوستی میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے' اور تم ڈالڈا کھاتے کھاتے دیسی گھی کا ذائقہ بھول چکے ہو' اور اب جب کہ تمہارے سامنے اچانک خالص و نایاب گھی آ گیا ہے' تو تم اسے بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈالڈا سمجھ رہے ہو۔ تمہیں سچے خلوص کی پہچان نہیں رہی۔“

”جو چیز میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں اسے پہچانتا کیسا......؟“

”کمال ہے یعنی جو چیز تمہاری آنکھوں کے بالکل سامنے ہے‘ تمہیں نظر نہیں آ رہی۔ ارے بھئی میں سخت قسم کا بلکہ خطرناک حد تک مخلص انسان ہوں...... سمجھے۔“

”اچھا......“ وقار نے بے یقینی سے کہا۔

”میرے دل میں خلوص نہ ہوتا تو تم کوٹ پہنتے نہ پہنتے میری بلا سے‘ لیکن میرا خلوص تھا‘ جس کی وجہ سے میرے دل کو تکلیف ہوئی‘ خود تم بھی سردی میں ٹھٹھرتے رہے‘ اور جو کہیں نمونہ وموتیہ ہو جاتا تو تمہارا تو خیر کیا بگڑتا‘ البتہ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔“

”واقعی میرا کیا بگڑتا۔“ وقار کو ہنسی آ گئی۔ ”تم سے پیچھا ضرور چھوٹ جاتا۔“

”پیچھا کہاں چھوڑتا میرے بھائی۔ تُو جہاں کہیں بھی جائے میرا سایہ ساتھ ہو گا۔ نوید نے لہک کر کہا۔ ”تاہم تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے۔“

”کروں گا‘ کیوں نہیں...... بلکہ میں دل ہی دل میں اپنی غلطی کا اعتراف کر چکا ہوں۔ اب تم کہو تو معافی بھی مانگ لوں۔“

”نہ...... نہ...... اس کی ضرورت نہیں۔“ نوید نے گرمجوشی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”چلو اسی خوشی میں تمہیں زبردست قسم کی ٹریٹ دوں۔“

”نہیں نوید! پھر کبھی سہی۔ اس وقت مجھے بڑا ضروری کام ہے۔“ وقار نے معذرت کی۔

”اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ میں تمہارے ضروری کام میں حارج نہیں ہونا چاہتا۔“

”تو پھر خدا حافظ۔“ وقار نے ہاتھ ہلایا۔

میری نظریں بے اختیار اس کی طرف اُٹھ گئیں‘ لیکن اس نے نظر اُٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھا‘ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سامنے والی گلی میں غائب ہو گیا۔ مجھے کچھ توہین کا سا احساس ہوا۔ یعنی میں اس قدر غیر اہم چیز ہوں کہ مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز میں نہ ڈالی جائے۔ اس سارے وقت میں اس نے کتنی بری طرح مجھے نظر انداز کیے رکھا۔ گویا اپنی شخصیت کے تمام تر حسن کے باوجود اس کی نظروں میں میری کوئی اہمیت نہیں۔

”کہاں گم ہو نیل......؟“

نوید نے اسٹیئرنگ موڑتے ہوئے کہا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ ”بس بیٹھی بور ہو رہی ہوں۔“

”اوہ مجھے افسوس ہے۔ دراصل باتوں میں تمہارا خیال ہی نہیں رہا۔“

”ہاں میرا خیال کیوں رہتا تمہیں۔ اس اُکھڑ اور بدمزاج شخص کے سامنے۔“ میں نے خفگی سے کہا۔

”اس کے اُکھڑپن پر نہ جاؤ نیل...... بہت عمدہ شخص ہے۔“

”ہو گا‘ مجھے کیا‘ ویسے تمہاری اس سے دوستی کیسے ہوئی؟“

”مجھے اس کا اُکھڑپن پسند آ گیا تھا۔“ نوید نے ہنس کر کہا۔ ”دراصل اس کے اُکھڑپن میں ایک گداز ہے‘ ایک حسن ہے۔“

”تمہیں تو کانٹوں میں بھی حسن نظر آتا ہے۔“ میں نے جل کر کہا۔

”ان میں بھی ایک شانِ دلبری ہوتی ہے۔“ نوید نے قہقہہ لگایا۔

”ویسے تم کیوں مرچیں چبا رہی ہو۔“

”میں تو مرچیں نہیں چبا رہی‘ ویسے تمہارا دوست ضرور تبولیاں کھا کر آیا تھا۔“

”آخر تم اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔“ نوید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہے۔“

”خاص بات یہ ہے کہ اس کی باتیں سن کر تو میرا مزاج تک کڑوا ہو گیا ہے۔“

”خوب...... گویا وہ دوسرے کے مزاج پر اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔“

”یہی تو مجھے ڈر ہے۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”اس کی صحبت میں تم بھی جنگلی بن جاؤ گے۔“

”تمہاری صحبت میں تو ابھی تک جنگلی نہیں بنا۔“ نوید نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کی صحبت مجھ پر کیا اثر کرے گی۔ وہ بے چارہ تو کبھی کبھار ملتا ہے۔“

”ہاں جی...... میں تو ایسی بری ہوں‘ پھر کیوں بولتے ہو مجھ سے۔“ میں نے ناراض ہو کر کہا۔

”دراصل تم سے باتیں نہ کروں تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔“ نوید نے معصوم سی صورت بنا کر کہا اور اپنی کوٹھی کے سامنے گاڑی روک دی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

”ابھی تم بینا سے نبٹنے کا سوچو۔ وہ برآمدے میں کھڑی ہے۔“ نوید منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

”اب ہنس کیوں رہی ہو۔“ نوید نے آنکھیں دکھائیں۔ ”سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔“

”واہ خوامخواہ ہی...... میں نے کب کہا تھا خود ہی تو اسے ساتھ لے کر نہیں گئے۔“

”اچھا یہ بتاؤ اسے عمدہ سے تحفے کا لالچ دوں یا شام کو پکچر دکھانے کا۔“ نوید نے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تم جانو...... میں تو چلی۔“

”ارے ارے یہ کیا......“ نوید نے بوکھلا کر کہا۔

”یعنی بجائے اس کے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں میری مدد کرو‘ گھر بھاگی جا رہی ہو۔“

”مجھے کیا پڑی ہے‘ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاؤں۔“

”سخت مطلب پرست بلکہ خودغرض ہو۔“ نوید نے جل کر کہا۔

”تسلیم...... تسلیم......“ میں نے جھک کر کہا‘ اور دوڑتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو گئی۔

برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دیکھا۔ بینا ویڈی سے الجھ رہی تھی۔

”ارے بینا خوب خبر لینا اس کی‘ یہ راستے بھر تمہاری برائیاں کرتا رہا ہے۔“

میں نے وہیں سے چلا کر کہا۔ نوید نے مڑ کر مجھے دیکھا‘ اور دور سے ہی گھونسا دکھایا۔ جواباً میں نے بھی مکا لہرایا اور ہنستی ہوئی اندر چلی گئی۔

بہت سارے دن بیت گئے‘ پھر تم کہیں نظر نہ آئے۔ نہ نوید نے تمہارا ذکر کیا۔ ایک دوبار میں نے سوچا بھی کہ نوید سے تمہارے متعلق پوچھوں‘ لیکن مجھ پر جھجک غالب آ گئی کہ اگر نوید پوچھ بیٹھا مجھے تمہارے متعلق اتنا تجسس کیوں ہے‘ تو بھلا میں کیا جواب دوں گی۔

”یہ بات نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی۔ یا میں تمہاری شخصیت سے امپریس ہو گئی تھی۔ تم میں امپریس کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دراصل تمہاری نفرت میں ڈوبی نگاہیں میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھیں‘ اور میں اس نفرت کا سبب کھوج لینا چاہتی تھی۔

میں نے بہت چاہا کہ تمہارے متعلق نہ سوچوں‘ اپنے دل کو بہت سمجھایا کہ بھئی اتنے بہت

سارے لوگ مجھے چاہتے ہیں‘ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ اگر ایک آدھ شخص نفرت کرتا بھی ہے‘ تو کیا فرق پڑتا ہے‘ لیکن میرے دل نے کہا۔ ”آخر کوئی وجہ بھی تو ہو نا۔“

”وجہ ہو نہ ہو‘ ہر شخص کو محبت اور نفرت کا حق ملنا چاہیئے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”اور پھر یہ جذبے تو انسان کے اپنے دل کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ میں کون ہوں کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینے والی۔ بس اب مجھے تمہارے متعلق کچھ نہیں سوچنا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں پھر تھوڑی دیر بعد ہی تمہارے متعلق سوچنے لگی۔ بھئی اللہ یہ کیا مصیبت ہے۔ میں نے اُلجھ کر کہا۔

آخر کوئی تک بھی ہو...... اس طرح ایک غیر متعلق شخص کے متعلق سوچنا۔ حد ہو گئی حماقت کی۔

دراصل تمہاری آنکھوں میں تیرتی ہوئی نفرت میرے دل میں کانٹا بن کر رہ گئی ہے۔

میں نے تجزیہ کیا‘ اور تمہارا ناقابل فہم رویہ میرے لئے چیلنج بن گیا ہے۔

”تو پھر اس چیلنج کو قبول کر لو نا‘ تم تو نفسیات کی طالبہ ہو۔“ کسی نے میرے اندر سے کہا۔

”اوہوں...... مجھے نہیں قبول کرنا یہ چیلنج۔“

میں نے گھبرا کر کہا۔ بھلا اس کھردرے سے بداخلاق شخص کی نفسیات سمجھ کر مجھے کیا مل جائے گا۔

وہ بے حد خوبصورت‘ گہری سیاہ آنکھیں میرے تصور میں جھلملائیں۔ اور مجھ پر ہنسنے لگیں۔ ہونٹوں کا تنفر آمیز کھچاؤ پھانس بن کر میرے دل میں چبھ گیا‘ اور وہ ضدی سا نٹ کھٹ جذبہ جو میرے دل میں جانے کب سے سر اُٹھا رہا تھا‘ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیوں...... آخر تم کس بات سے ڈرتی ہو۔“

”نہیں...... میں ڈرتی تو نہیں ہوں۔“ میں نے پسپا سے لہجے میں کہا۔ ”البتہ......“

”البتہ کیا......؟“

”البتہ یہ کہ مجھے غیر متعلق باتوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔“

میں نے سختی سے ڈانٹ کر کہا‘ اور ٹرانزسٹر پوری آواز میں کھول دیا۔

ان دنوں بینا اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اس لئے سخت بوریت تھی۔ میں کئی دن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے شاپنگ کے لئے جانا چاہتی تھی' لیکن اکیلے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور بینا تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ آخر اس دن تنگ آ کر میں اکیلی ہی نکل کھڑی ہوئی۔ خیال تو تھا کہ نوید کو ساتھ لے جاؤں گی' مگر نوید کو کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اس لئے مجھے اکیلا جانا پڑا۔ میں منت سماجت کر کے نوید کی گاڑی مانگ لائی تھی' اور وہ بے چارہ ٹیکسی میں گیا تھا۔ یوں بھی وہ میری بات کم ٹالتا تھا۔ دراصل ہم دونوں میں بہت پیار تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بینا کی پیدائش پر جب سعدیہ آنٹی بیمار ہو گئی تھیں' تو نوید کی دیکھ بھال امی نے ہی کی تھی۔ چھ ماہ بعد جب سعدیہ آنٹی اس قابل ہوئیں کہ بینا کے علاوہ نوید کو بھی سنبھال سکیں' تو اس وقت تک نوید امی سے اتنا مانوس ہو چکا تھا' کہ ذرا امی نظروں سے اوجھل ہوتیں' اور وہ رونے لگتا۔ سارا سارا دن وہ ہمارے ہاں رہتا' اور گھر جانے کا نام نہ لیتا۔ یوں بھی دونوں گھروں میں کون سی دوری تھی۔

دونوں کوٹھیوں کے مشترکہ لان کو سنتھے کی ایک باڑ الگ کرتی تھی' اور باڑ کے درمیان راستہ بنا ہوا تھا' تا کہ گیٹ سے نکلے بغیر ایک دوسرے کے ہاں آ جا سکیں۔ سعدیہ آنٹی نے بہت کوشش کی کہ نوید ان سے مانوس ہو سکے' مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہیں۔ جب بھی نوید کو گھر لے جانا چاہتیں نوید دوڑ کر امی کی گود میں چھپ جاتا۔ آخر انہوں نے تنگ آ کر نوید کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ کبھی موڈ میں ہوتا' تو اپنے گھر چلا جاتا ورنہ امی کا آنچل تھامے ننھے ننھے قدموں سے ان کے ساتھ دوڑتا پھرتا۔ آنٹی اکثر ہنس کر کہتیں۔

''شاکرہ لگتا ہے کہ نوید اصل میں تمہارا بیٹا ہے' جس نے غلطی سے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔''

تو یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں میں بہت پیار تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ بینا کی کوئی بات ٹال دے' لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا' کہ میں کوئی فرمائش کروں' اور نوید اسے پورا نہ کرے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ڈیڈی نے مجھے گاڑی چلانے سے منع کر رکھا ہے' اور ڈرائیور کو سختی سے روک دیا ہے کہ وہ مجھے ڈرائیونگ سیٹ کے قریب تک نہ پھٹکنے دے۔ اس کے باوجود جب مجھے ضرورت پڑتی یا ڈرائیونگ کا شوق چراتا' تو ایسے موقعوں پر نوید میرے بہت کام آتا' اور اپنی ننھی منی سی گاڑی مجھے پیش کر دیتا۔ اب بے چارے ڈیڈی کو کیا پتا کہ میں اپنا شوق بہرصورت پورا کر لیتی ہوں۔ اور یہ کہ میں گاڑی چلانے میں بہت پرفیکٹ ہو چکی ہوں۔ اب بھی جب نوید نے

معذرت کی کہ وہ میرے ساتھ نہیں جا سکتا' تو میں نے فوراً اس سے گاڑی مانگ لی۔ اس نے چابی میری طرف اُچھالتے ہوئے کہا۔

''چل بے بی...... تو بھی کیا یاد کرے گی۔ لیکن ذرا احتیاط سے چلانا' ایسا نہ ہو کہ مجھے تیرے ڈیڈی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔''

''تم بے فکر رہو ویدی...... میں محتاط رہوں گی۔''

''اچھا تو مجھے اگلے چوراہے تک ڈراپ کرتی جاؤ' وہاں سے ٹیکسی بآسانی مل جائے گی۔''

نوید نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میری مانو نوید تو چھوڑو اپنے ضروری کام' اور چلو میرے ساتھ۔''

''ضرورت چلتا...... مگر نیل...... حامد امریکہ جا رہا ہے' اور میرا اس سے ملنا ضروری ہے' بہت ضروری۔''

''اور تب تو مجبوری ہے۔''

''ایک بات تو بتاؤ نیل۔''

''پوچھو۔''

''یہ تمہارے ڈیڈی اتنے کنجوس کیوں ہیں؟''

''کیا...... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میری ڈیڈی نے بھلا کیا کنجوسی کی؟''

''تمہیں گاڑی جو نہیں دیتے...... ڈرتے ہیں نا کہ کہیں پٹرول نہ خرچ ہو۔''

''یہ بات نہیں ویدی...... اکلوتی اولاد ہونا بھی مصیبت ہے۔ انہیں مجھ سے اتنی محبت ہے کہ وہ ہر وقت میرے متعلق اوہام کا شکار رہتے ہیں۔ گاڑی اس لئے نہیں چلانے دیتے کہ میں کہیں ایکسیڈنٹ نہ کر بیٹھوں۔''

''اور میں جو تجھے گاڑی کی چابی دے دیتا ہوں' تو کیا مجھے تجھ سے محبت نہیں؟''

''ارے تم تو دل سے چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں' اور تمہارا پیچھا چھوٹے...... مجھ سے اور میری فرمائشوں سے۔''

''اچھا......'' نوید نے آنکھیں دکھائیں۔ ''اب مانگنا مجھ سے گاڑی' جب کام نکل جاتا ہے تو۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ تو میں تم سے مذاق کررہی تھی ویدی...... تم برا مان گئے۔"

میں نے جلدی سے کہا کہ کہیں وہ خفا ہو کر مجھ سے گاڑی نہ لے لے۔

"برا ماننے والی بات ہی ہے۔" نوید نے خفگی سے کہا۔

"تو معاف کردو نا' اچھے ویدی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔"

"چلو معاف کیا۔" نوید ہنس پڑا۔

"ڈیڈی کا یہ ہے کہ جب سے میرے ساتھ وہ معمولی سا حادثہ پیش آیا ہے' ان کے دل میں میرے متعلق ڈر بیٹھ گیا ہے۔"

"کون سا حادثہ؟" نوید نے چونک کر پوچھا۔

"وہی جب بریک لگانے کی کوشش میں گاڑی درخت سے جا ٹکرائی تھی' اور معمولی سا زخمی ہو گئی تھی۔ تم بھی تو میرے ساتھ تھے۔"

"اوہ مگر ان دنوں تم گاڑی چلانا سیکھ رہی تھیں' اور تمہیں اپنی پریکٹس بھی نہ تھی۔"

"ہاں...... مگر ڈیڈی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دوبارہ بھی مجھے کوئی اس قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ کہیں باہر جاتے ہیں تو بار بار فون کر کے میری خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار میں ضد کر کے گاڑی لے گئی تھی' تو سارا وقت لان میں ٹہلتے رہے' اور جب تک میں واپس نہ آئی انہیں چین نہ آیا۔ کبھی کبھی تو مجھے اُلجھن سی ہونے لگتی ہے' لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ اپنی محبت کی وجہ سے مجبور ہیں۔"

"بس بس اپنے ڈیڈی کی زیادہ وکالت نہ کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں انہیں۔ آخر کو وہ میرے چچا ہیں۔"

"مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ان کی جان پر بنی رہے۔ اس لئے میں ان کے سامنے ڈرائیونگ کی خواہش ظاہر نہیں کرتی۔ ورنہ میں چاہوں تو ذرا سی ضد کر کے ان سے گاڑی لے سکتی ہوں۔"

"بڑی ہمدرد ہو اپنے ڈیڈی کی۔"

"اور کیا تمہاری طرح نافرمان تو نہیں ہوں کہ اپنے ڈیڈی کی ذرا سی بھی خواہش پوری نہ کرسکوں۔"

میں نے طنز کیا۔

"ارے تم اسے ذرا سی خواہش کہتی ہو۔" وہ میری بات سمجھ کر بولا۔

"کیا یہ اچھا ہوتا کہ میں ڈیڈی کی خواہش پر میڈیکل لائن اختیار کر لیتا' اور پھر ہر سال نہایت ٹھاٹھ سے فیل ہوتا۔"

"ہاں ایسے ہی تو تم کوڑھ مغز ہو۔"

"ارے بھائی جب مجھے دلچسپی ہی نہیں تو پڑھتا کیا خاک' میری تو چیر پھاڑ کے نام سے ہی روح فنا ہوتی ہے۔"

"بڑے نازک مزاج ہونا' خیر اب کھسکو یہاں سے' وہ دیکھو خالی ٹیکسی جارہی ہے۔"

"ارے بھائی ٹیکسی والے ذرا روکنا۔" نوید نے کھڑکی میں سے سر باہر نکالتے ہوئے زور سے پکارا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی۔

"اچھا تو نیل...... میں چلا۔"

"جاؤ بھئی یہاں کون روک رہا ہے۔"

"تمہارا دل۔" نوید شرارت سے ہنسا۔

"خاک......" میں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"مگر یہ تو بتاؤ یہ تمہاری میرے دل تک کیسے رسائی ہو گئی؟"

"کب نہیں تھی۔"

"بڑی خوش فہمی ہے۔"

"اچھا تو کھاؤ میرے سر کی قسم کہ تمہارا دل مجھے روکنا نہیں چاہ رہا۔"

"ایسے ہی......" میں نے جھینپ کر کہا۔ "میں نہیں کھاتی قسم...... کوئی تک بھی ہو...... ویسے تمہیں میرے ساتھ ہی جانا تھا تو ٹیکسی کیوں روکی۔"

"یہ تم سے کس نے کہا۔" نوید نے چونک کر پوچھا۔

"تو پھر سیٹ ہی سے کیوں چپک گئے ہو۔"

"میرا خیال ہے سیٹ ہی میرے ساتھ چپک گئی ہے۔"

"ویدی کے بچے۔"

"نہیں ہیں...... خدا کی قسم نہیں ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے بوکھلا کر اس قدر بے ساختگی سے کہا' کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

"ارے اتنا حلق پھاڑ کر نہ ہنسو کہ میری ننھی منی گاڑی کی چھت ہی اڑ جائے۔"

"خدا کے لئے ویدی...... کیوں بے تکی ہانک رہے ہو۔" میں نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور ہارن بجانے لگا۔

"اچھا اب جاؤ...... ٹیکسی ڈرائیور مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔"

"اچھا...... مگر دھیان رہے میں کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ کا ذمے دار نہیں ہوں سمجھیں۔"

"سمجھ گئی۔" میں نے جھنجھلا کر گاڑی کا انجن بند کر دیا۔

"اور کچھ بکنا رہ گیا ہے تو وہ بھی بک دو۔"

"ہم بکتے نہیں فرمایا کرتے ہیں' مگر خیر...... باقی آئندہ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

وہ لپک کر ٹیکسی میں جا بیٹھا' اور وہیں سے ہاتھ لہرایا۔ میں نے بھی ہاتھ لہراتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"پاگل ہے ایک دم۔"

میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"باتونی کہیں کا...... مجھے کتنا تنگ کرتا ہے' مگر وہ مجھے کس قدر پیارا ہے۔ وہ بھی تو مجھ سے جان چھڑکتا ہے۔ شریر سا' مگر بے حد مخلص' میرا اپنا بھائی...... اس کے لئے میرے دل میں پیار اُمڈ آیا۔ میں نے نوید کے متعلق سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے گاڑی چلا دی۔ اس سے پہلے میں جب بھی ڈرائیو کرتی نوید میرے ساتھ ہوتا تھا۔ آج پہلی بار وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس لئے میں گاڑی بے حد احتیاط سے چلا رہی تھی۔ دراصل اس کی موجودگی میں جو ایک تحفظ کا احساس ہوتا تھا' کہ اگر گاڑی میرے کنٹرول سے باہر ہو گئی تو وہ اس کو سنبھال لے گا' اور مجھے جو لاپروا بنا دیتا تھا' وہ اس وقت نہیں تھا' اس لئے میں نے گاڑی کی سپیڈ بڑھانے کی کوشش نہ کی۔

اپنے لئے کچھ ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد میں نے سوچا کہ نوید کے لئے بھی کچھ لیتی چلوں' مگر کیا...... ابھی میں کچھ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ میری نظر سفید اون کی بنی ایک

خوبصورت مردانہ جرسی پر پڑی' اور وہ مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں نے فوراً نوید کے لئے خرید لی۔ جب میں چھوٹے بڑے پیکٹ سنبھالے دکان سے باہر نکلی تو مجھے تم نظر آئے۔ تم ایک گاڑی سے باہر آ رہے تھے۔ تمہارے جسم پر سلیپنگ ڈریس تھا' اور پاؤں میں بیڈ روم سلیپر۔ تم تیز تیز قدم اٹھاتے ندیم میڈیکل سٹور میں گھس گئے۔

"یہ شاندار مرسیڈیز کس کی ہے؟" میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔ شاید تمہارے کسی امیر دوست کی ہے۔ تم تو اتنے خوشحال نظر نہیں آتے کہ گاڑی رکھ سکو' مگر نہیں...... مجھے یاد آیا کہ کس طرح تم نے نوید کا کوٹ اسے واپس لوٹا دیا تھا' تم تو اتنے خوددار ہو' محض گاڑی میں بیٹھنے کے لئے تم اپنے دوست کے زیر بار احسان نہ ہو سکتے تھے...... تو پھر...... میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ تو پھر یقیناً تم کہیں ڈرائیور ہو گے۔ ہاں ٹھیک ہے تمہارا حلیہ بھی ڈرائیوروں جیسا ہے۔ میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں کہ مجھے سامنے کی چیز نظر نہیں آ رہی۔ اس وقت شاید تم اپنے مالک کے لئے کوئی دوا لینے آئے ہو۔

"اجی میں نے کہا راستہ دیجئے۔"

کوئی میرے کان کے قریب چیخا' تو میں چونک پڑی۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میں احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے ندیم میڈیکل سٹور کی طرف دیکھ رہی ہوں' اور اردگرد سے گزرنے والے لوگ مجھے عجیب نظروں سے گھور رہے ہیں۔ میں خفت سے سرخ پڑ گئی۔ لوگ کیا سوچتے ہوں گے' یہی نا کہ میرے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ میں کتنی دیر سے دروازے کے بیچوں بیچ آنے جانے والوں کا راستہ روکے کھڑی ہوں۔ میں تیزی سے باہر نکل آئی۔

سچ مچ میں بڑی احمق ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ مجھے بھلا کیا پڑی تھی' کہ وہاں کھڑے ہو کر ایک بالکل غیر متعلق شخص کے متعلق اندازے لگانے لگوں۔ حد ہو گئی۔ بڑی ماہر نفسیات بنی پھرتی ہوں۔ بدھو کہیں کی۔ میں نے دل ہی دل میں سارا غصہ خود پر اتارا۔ مجھے کتنی خفت اٹھانی پڑی تھی تمہاری وجہ سے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پھر میڈیکل سٹور کی طرف دیکھا۔ تم باہر آ رہے تھے' مگر جیسے تم کو کوئی بات یاد آ گئی' اور تم وہیں سے واپس لوٹ گئے۔

سردی اتنی شدید ہے اور تم بغیر کسی گرم کپڑا اوڑھے سلیپنگ سوٹ میں ہی اپنے آقا کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکم کی تعمیل میں دوڑے چلے آئے ہو۔ میرے دل نے سرزنش کی' مگر ہو سکتا ہے کہ تمہارے پاس گرم لباس نہ ہو۔ اس دن بھی تو...... ہاں یہی بات ہے...... میری آنکھوں کے سامنے سفید اون کی خوبصورت جرسی لہرائی۔ اگر...... اگر یہ جرسی میں تمہیں دے دوں تو۔ نوید کے پاس تو پہلے ہی بہت سی ہیں' اور تم اس سردی میں ٹھٹھر رہے ہو۔ مگر...... مگر کس تعلق سے...... میرا تم سے کیا واسطہ' اور تم بھلا اسے قبول کرو گے۔ تم جو اتنے خوددار ہو' بھئی کیا مصیبت ہے۔ اتنے سالوں بعد تو میں کوئی نیکی کا کام کرنے چلی ہوں' اور یہ خیالات ہیں کمبخت بڑھ بڑھ کر میری راہ روک رہے ہیں۔ مجھے نہیں سنتی کسی کی۔ یعنی ایک شخص سردی سے ٹھٹھر رہا ہے' اور میں محض اس لئے اس کی کوئی مدد نہیں کر رہی کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔ حد ہو گئی ہے خودغرضی کی۔

میں نے ایک بار پھر میڈیکل سٹور کی طرف دیکھا۔ تم ابھی باہر نہیں نکلے تھے۔ اپنی ہمدردی کے جوش میں بنا سوچے سمجھے تمہاری گاڑی کی طرف بڑھی اور کھلی کھڑکی سے جرسی کا پیکٹ اندر پھینک دیا۔ اپنے اس کارنامے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے میں واپس لوٹی' لیکن ابھی دو قدم بھی نہ چلی تھی کہ تم نے سامنے آ کر میرا راستہ روک دیا۔

''ذرا ٹھہریئے محترمہ۔''

میں ٹھٹک کر رک گئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی تم چونک پڑے' یا شاید میں نے ہی ایسا محسوس کیا۔

''آپ وہاں کیا کر رہی تھیں گاڑی کے پاس۔'' تم نے بڑی سختی سے پوچھا۔

''گاڑی کے پاس...... کون سی گاڑی...... اور یہ آپ نے میرا راستہ کیوں روک لیا؟''

میں نے سنبھل کر کہا۔

''آپ وہاں کھڑکی اندر جھانک رہی تھیں۔''

تم نے جھلا کر کہا۔

''کب......؟''

میں نے حیرت سے تمہیں دیکھا۔

''مجھے کیا پڑی ہے کہ میں کھڑکیوں سے جھانکتی پھروں۔''

میں صاف مکر گئی۔

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

تمہیں میرے انکار پر غصہ آ رہا تھا۔

''تو پھر اپنی آنکھوں کا علاج کروایئے جناب۔ ویسے یہ تو بتایئے کہ آپ نے وہاں کونسا قارون کا خزانہ چھپا رکھا ہے' جس کے چوری ہو جانے کا آپ کو ڈر ہے۔''

''آپ خوامخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

تم نے غصے سے کہا۔

''میں یا آپ۔''

میں نے طنز سے کہا۔

''کیا یہ میں ہوں' جس نے ایک بے بنیاد بات کا بہانہ بنا کر آپ کا راستہ روک رکھا ہے۔ جایئے مسٹر اپنا راستہ ناپیے۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔'' میرا لہجہ انتہائی اہانت آمیز تھا۔

تم نے بری طرح تلملا کر مجھے دیکھا' اور بنا کچھ کہے تیزی سے میرے سامنے سے ہٹ گئے۔

''شکر ہے کہ مجھے بروقت سوجھی...... ورنہ یہ حضرت جانے کب پیچھا چھوڑتے۔'' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دی' اور گاڑی کی طرف چل پڑی۔

✸✦✸

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھر آ کر میں نوید کا انتظار کرنے لگی' تا کہ اسے یہ سارا قصہ بتاؤں۔ اتنی شاندار ایکٹنگ کا خیال کر کے مجھے بار بار ہنسی آ رہی تھی۔ جب نوید آیا' تو میں لان میں اس کی منتظر کھڑی تھی۔

''ویدی...... ایک مزے کی بات بتاؤں۔'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''یہاں کب سے کھڑی ہو؟'' وہ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

''کوئی گھنٹہ بھر ہو گیا تمہارے انتظار میں ٹھٹھر رہی ہوں۔'' میں نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔

''پھر تو کوئی بڑی ہی دلچسپ بات ہو گی' ہے نا۔''

''ہاں وہ۔''

''ارے دم تو لینے دو...... میرا تو چلتے چلتے کباڑا ہو گیا۔ ٹیکسی راستے میں ہی کوئی دو میل اُدھر خراب ہو گئی' اور مجھے وہاں سے پیدل مارچ کرنا پڑا۔ توبہ کس قدر تھک گیا ہوں۔''

''ویدی آج میں......''

''کیا یہیں قلفی بننے کا ارادہ ہے۔'' وہ پھر بیچ میں بول پڑا۔

''چلو اندر چلو۔ میری جان کوئی ایسی فالتو نہیں ہے۔'' میں اس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں آئی۔

''تو بات یہ ہے نوید کہ آج میں......'' میں نے جلدی جلدی بے صبری سے کہنا شروع کیا۔

''ارے ہاں۔'' نوید کو جیسے ایک دم یاد آ گیا۔ ''آج ریکس میں ایک بڑی اچھی فلم لگی ہے' مگر آج تو بہت رش ہو گا' البتہ کل ہی ٹھیک رہے گا۔''

وہ جانتا تھا کہ میں اسے کوئی بات بتانے کے لئے بے چین ہو رہی ہوں' اور وہ مجھے ستانے کے لئے جان بوجھ کر سنی ان سنی کیے جا رہے تھا۔ زِچ ہو کر میں نے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے منہ پھلا لیا۔

وہ میگزین کے اوراق پلٹا کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہا' اور مسکراتا رہا۔

''کیا خیال ہے ایک کپ چائے مل جائے گی۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''جی...... یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے' اور میں کوئی آپ کی ملازمہ نہیں ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے یہ ہوٹل نہیں ہے' میرا گھر ہے' اور تم میرے چچا کی بیٹی ہو۔ اگر تمہاری جگہ بیٹا ہوتی تو۔''

''تو وہ ضرور آپ کو چائے پلا دیتی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مگر میں بیٹا نہیں ہوں اور' اپنے گھر جا رہی ہوں۔''

میں برا سا منہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

''مجھ سے مت بولو۔'' میں غصے سے بولی۔

''میں جانتا ہوں مجھے بتائے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہو گا اور رات بھر ڈراؤنے خواب ستاتے رہیں گے۔''

اس نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کرسی پر دھکیل دیا۔

''اب بتاؤ جلدی سے کیا بات ہے؟''

''وہ ویدی...... تمہیں پتا ہے آج میں نے بڑی نیکی کا کام کیا ہے؟'' میں نے ساری ناراضگی بھول کر فخر سے اکڑتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' نوید نے حیرت ظاہر کی۔

''اور نہیں تو کیا...... وہ تمہارا دوست ہے نا وقار۔ وہی جو اس دن تمہاری سالگرہ پر آیا تھا۔''

''ہاں ہاں...... مگر اس کا یہاں کیا ذکر۔''

''اسی کا تو ذکر ہے۔ پہلے پوری بات تو سن لو۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا بھئی سناؤ۔"

میں نے اسے سارا قصہ مزے لے لے کر سنایا۔ وہ خلاف معمول خاموشی سے سنتا رہا۔

"اب کہو۔" میں نے اسے دیکھا۔

"نیکی کا کام ہے کہ نہیں۔"

"ہاں ہاں...... تم تو حاتم طائی ہو۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ بے بی...... اس نیکی کے لئے تم نے خصوصیت سے اس کا انتخاب کیوں کیا۔"

وہ جب بزرگانہ موڈ میں ہوتا تھا' تو مجھے بے بی ہی کہہ کر پکارتا تھا۔

"اب تم تو الٹی سیدھی بکنے لگو گے۔ ورنہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ بے چارہ ٹھٹھر رہا تھا' اور مجھے اس پر ترس آ گیا۔"

"خوب۔" اس نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"مگر خصوصیت سے تمہیں اسی پر ترس کیوں آیا۔ ترس کھانے کے لئے کیا دنیا میں لوگوں کی کمی ہے۔ یہ اتنے بہت سے لوگ جو فٹ پاتھ پر چیتھڑوں میں لپٹے ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں ان کے لئے تو کبھی تمہارا جذبہ ہمدردی نہیں جاگا۔ وہ غریب تو پھر بھی معقول لباس میں تھا۔"

"ایں ہاں' کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" میں نے قدرے قائل ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ تمہارا دوست ہے' اور شاید اسی تعلق سے میں نے دوسروں کی نسبت اسے۔"

"ارے حاتم طائی کی قبر پر لات مارنی ہی تھی تو اپنا یہ کوٹ اُتار کر اسے دے دیا ہوتا۔ میری جرسی کیوں دے دی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا۔"

ہنسی اس کے ہونٹوں پہ پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"بڑے تھڑدِلے ہو۔ میرے جذبہ ہمدردی کو سراہنے کے بجائے الٹا لڑنے لگے۔ ایسا ہی جرسی کے لئے مر رہے ہو تو میں کل ہی۔"

"ہاں تم تو بڑی سخی ہو۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ "کیا کہنے تمہارے جذبہ ہمدردی کے۔"

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بڑا مان کر کہا۔ "خود تو کبھی توفیق نہیں

ہوتی کسی کو کچھ دینے کی اور لگے ہیں باتیں بنانے۔"

"ہنسنے کی تو بات ہی ہے اور ہنسوں گا بھی ضرور۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا' اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

"کچھ منہ سے بھی پھوٹو گے' یا بس یوں ہی۔" میں چڑ گئی۔ "آخر کوئی بات بھی ہو۔"

"بات...... ارے کیا لاجواب حماقت کی ہے۔ خدا کی قسم جواب نہیں تمہارا بھی۔"

"ویدی......" میں نے اسے گھورا۔

"احمق...... جس غریب کے لئے تمہارا جذبہ ہمدردی جاگا ہے' وہ چاہے تو اس پورے شہر کو خرید سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"لاکھوں روپے تو وہ صرف ٹیکس کے ادا کرتا ہے۔ اور اس کی کوٹھی اس قدر شاندار ہے کہ لوگ اسے دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔ تم نے "عالم وِلا" کا نام سنا ہو گا۔"

"تو کیا وقار......" حیرت سے میری سانس رکنے لگی۔

"ہاں...... عالم ولا وقار کی ہی ملکیت ہے۔"

میرا سر گھومنے لگا۔ "خدایا اسے اگر میری حماقت کا پتا چل جائے تو...... خدا کے لئے ویدی اسے کچھ نہ بتانا۔" میں نے التجا کی۔

"نہیں...... میں تو ضرور بتاؤں گا' کس قدر محظوظ ہو گا وہ یہ سب کچھ سن کر۔"

"تمہیں میری قسم ہے ویدی۔" میں روہانسی ہو گئی۔

"اچھا اچھا۔ اب رونے نہ بیٹھ جانا۔"

"مگر ویدی...... کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہے۔" میں نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"عجیب لڑکی ہو' جب میں سچ بولتا ہوں تو جھوٹ سمجھ لیتی ہو' اور جھوٹ بولوں تو تمہیں فوراً یقین آ جاتا ہے۔"

"تو پھر اتنا جھوٹ بولتے ہی کیوں ہو۔"

"اچھا اب لیکچر دینے نہ بیٹھ جاؤ' میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔"

"ہاں ایسے ہی تو تم نازک ہو۔" میں نے جل کر کہا' اور وہاں سے اٹھ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بھئی حد ہو گئی۔ کیا شاندار حماقت سرزد ہوئی ہے مجھ سے۔" میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے مجھ میں ذرا سی بھی عقل ہوتی' تو وہ شاندار کارنامہ سرانجام دینے سے پہلے کچھ سوچتی۔ اصل میں کتابیں پڑھ پڑھ کر میرا دماغ خراب ہو گیا ہے' اور میری عقل کہیں جنگل میں گھاس چرنے تشریف لے گئی ہے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے خیالات بھی عجیب بے تکے سے ہیں۔ بالکل تمہاری طرح یعنی تم اتنی اعلیٰ حیثیت کے مالک ہو' اور تمہاری پرسنیلیٹی اتنی اتنی بے چاری سی کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اصل میں تم خود اپنے آپ کو مسخ کر رہے ہو۔ ورنہ سلیقے کے لباس میں تمہاری شخصیت نکھر سکتی ہے۔ ارے لوگ تو اپنی دولت سے خود کو نمایاں کرتے ہیں' اور تم ہو کہ بوسیدہ پردوں کے پیچھے چھپ رہے ہو۔ آخر کیوں..... تم کیسے انسان ہو' جسے اپنی بھی پروا نہیں۔ مجھے تمہارے متعلق بڑا تجسس ہو رہا تھا' اور میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا میں نوید سے تمہارے متعلق تفصیل سے بات کروں گی۔ دو تین دن تک تو میں سوچتی رہی' پھر ایک دن اسے موڈ میں دیکھ کر تمہارا ذکر چھیڑ دیا۔

"کیوں..... کیا پھر تمہارا جذبہ ہمدردی ابھرا ہے۔" نوید نے آنکھیں نچائیں۔ "بھئی آخر بات کیا ہے۔ تم اس میں بہت دلچسپی لے رہی ہو۔"

"فضول بکواس نہیں۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "میں اس وقت نفسیات کی ایک طالبہ کی حیثیت سے تم سے مخاطب ہوں۔ مجھے تمہارا یہ دوست نفسیاتی کیس لگتا ہے۔"

"اور میرے متعلق کیا خیال ہے.....؟"

"تم تو ہو ہی سرے سے پاگل۔"

"تو یہ خیال ہے تمہارا۔" نوید نے آنکھیں دکھائیں۔

"اصل میں تمہارے اپنے دماغ کی کوئی رگ ڈھیلی ہے' اس لئے تمہیں ہر کوئی نفسیاتی کیس لگتا ہے۔"

"ارے نہیں ویدی بھیا..... میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تم تو بہت پیارے' بڑے ہینڈسم ہو' خاندان بھر میں سب سے عقلمند' اور لڑکیاں تو تم پر مرتی ہیں۔"

"شکریہ....." نوید نے گردن اکڑا کر کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس کے متعلق کچھ زیادہ

نہیں بتا سکوں گا۔"

"کیوں..... کیا وہ تمہارا دوست نہیں ہے؟"

"دوستی کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس کے نجی حالات کا کھوج لگاتا پھروں۔ ویسے بھی میری اس کی دوستی زیادہ پرانی نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔ وہ اپنی ذات سے اتنا لاپروا کیوں ہے؟"

"بس وہ فطرتاً ایسا ہی ہے' بے حد لاپروا' بہت لاابالی' آدمیوں میں تنہا' اور اپنے آپ میں تنہا۔ اپنی ذات میں گم اور اپنی ذات سے لاپروا۔ آدم بیزار اتنا کہ کسی کو قریب نہیں آنے دیتا۔ اکھڑ اتنا کہ کوئی اس کے قریب نہیں آتا' تاہم آدمی مخلص ہے۔"

"اگر وہ ایسا ہی آدم بیزار ہے تو تمہارے ساتھ اس کی دوستی کیسے ہوئی؟"

"ارے ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔"

"تو اب بتا دو نا۔"

"یہ آپ کے اس خادم کا کمال ہے۔" نوید نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"مگر تم بوجھ نہ سکو گی۔"

"اچھا بھلا انسانوں کی طرح باتیں کرتے کرتے تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔"

"زبان میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔"

اس نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

"ویدی پلیز۔"

"تمہیں یاد ہو گا' جب میں اپنے دوستوں حماد' ظفر اور خرم وغیرہ کے ساتھ پکنک پر گیا تھا' تو چپکے سے گاڑی لے کر بھاگ آیا تھا' اور ان چاروں کو پیدل چلنا پڑا تھا۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں تم نے بتایا تھا۔" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اس دن سے ہی موقع کی تلاش میں تھے' اور انہوں نے بڑی لمبی لمبی قسمیں کھائی تھیں کہ مجھ سے بدلہ ضرور لیں گے' لیکن میں بھی محتاط تھا۔ دو تین بار تو بچ نکلا' لیکن آخر ایک دن پھنس ہی گیا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیسے......؟" میں مارے تجسس کے آگے جھک آئی۔

"ہوا یوں کہ اس دن ہم گھومتے پھرتے ایشراز کی طرف جا نکلے۔ خرم نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ کچھ کھا پی لیا جائے۔

"ضرور بشرطیکہ بل کی ادائیگی تم کرو۔" ظفر نے اس کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس اس وقت صرف پانچ روپے اور دس پیسے ہیں۔" خرم نے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"تم ہامی تو بھرو۔ ہم تمہیں اُدھار دے دیں گے۔" حماد نے کہا۔ خرم کچھ سوچنے لگا۔

"ارے تم کس ازلی کنجوس کے پیچھے پڑ گئے ہو' کہیں بے چارے کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔" میں نے اسے غیرت دلانے کے لئے کہا۔

"اچھا تم پیسے نکالو۔ بل میں ادا کر دوں گا۔" خرم نے چالاکی سے کہا۔

اس پر ہم نے شور مچا دیا' اور اس کی بے ایمانی پر خوب برا بھلا کہا۔

"اچھا" اس نے تنگ آ کر کہا۔ "کیا یاد کرو گے کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔ اب جلدی سے پیسے نکالو۔"

"پہلے وعدہ کرو کہ یہ رقم واپس کر دو گے۔" میں نے پیش بندی کے طور پر کہا۔

اس نے خوب قسمیں کھا کر ہمیں یقین دلایا کہ وہ پوری ایمانداری کے ساتھ ایک ایک پیسہ ہمیں واپس کر دے گا' اور ہم نے اپنی جیبیں اس کے سامنے خالی کر دیں۔ خرم بڑے شاہانہ موڈ میں تھا۔ اس نے بہت سی چیزیں منگوا لیں۔ ابھی ہم کھا پی رہے تھے کہ اچانک حماد کو یاد آیا کہ اسے تو پانچ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے' اور بے حد ضروری' وہ افسوس کرتا ہوا بغیر چائے پیئے چلا گیا۔ ظفر کو چائے پیتے پیتے کونے والی میز پر اپنا کوئی شناسا بیٹھا ہوا نظر آ گیا' اور وہ چند منٹوں کے لئے معذرت کر کے چلا گیا۔

"کیا خیال ہے اور چائے منگوائی جائے؟" خرم نے پوچھا۔

"ہاں منگوا لو...... مگر ذرا سٹرانگ ہو اور خوب گرم۔" بیرے کو چائے کا آرڈر دے کر خرم باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ جوں ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوا' میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے چونک کر کونے والی میز کی طرف دیکھا' ظفر وہاں نہیں تھا' اور مجھے

یقین تھا کہ خرم بھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ بیرا چائے لایا تو میں نے اسے بل لانے کے لئے کہا' اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہاں میری جان پہچان کا کوئی شخص نہ تھا' جس سے میں اُدھار لے سکتا' اور میرے پاس جو کچھ تھا' وہ میں پہلے ہی خرم کو دے چکا تھا۔ مجھے ان پر بہت غصہ آ رہا تھا' لیکن ان سے تو میں بعد میں نپٹ لیتا۔ فی الحال مجھے اس مصیبت سے بچنے کی ترکیب سوچنا تھی۔"

وہ سانس لینے کے لئے رکا۔

"پھر کیا ہوا......؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ میرا اشتیاق دیکھ کر اِدھر اُدھر کی ہانکنا شروع کر دیتا' اور اصل موضوع کو بھول جاتا۔

"میں جو کچھ بھی کرتی' تم اپنی بتاؤ۔"

"پہلے ایک کپ چائے تو پلاؤ۔"

"پہلے تم اپنی بات ختم کرو۔"

"پٹرول کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ پہلے چائے۔"

"لعنت ہو تمہاری چائے پر۔"

میں دل ہی دل میں کھولتی اس کے لئے چائے لائی۔ جب تک وہ چائے پیتا رہا' میں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"ذرا بتاؤ تو مجھے اس وقت کیا یاد آ رہا ہے؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"کیا......؟" میں نے بے دلی سے کہا۔

"ایک ایسی بلی جو کسی پر جھپٹ پڑنے کے لئے تیار ہو۔"

"کیا بات بنی بھلا۔"

"اس وقت تمہارے تیور ایسے ہی ہیں۔"

"قسم ہے جو اب میں تم سے کوئی بات بھی کروں۔" میں غصے سے اٹھی۔

"ارے میں تو مذاق کر رہا تھا' تم برا مان گئیں۔ اچھا تم مجھے بلی کہہ لو۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بس اب ٹھیک ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"اب بتا بھی چکو۔"

"خیر تو میں منیجر سے ملا' اور اسے بتایا کہ میرے چند بے تکلف دوستوں نے مجھے کس طرح احمق بنایا ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا کوئی ملازم میرے ساتھ بھیج دے' تاکہ میں بل ادا کر سکوں۔ منیجر نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ابھی پچھلے دنوں اسی طرح ایک شخص ان کے ملازم کو جل دے کر نکل گیا تھا' اور اب وہ اس قسم کا کوئی رسک نہیں لے سکتے۔

"تب تو یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ میری یہ رسٹ واچ رکھ لیں۔ میں بعد میں رقم دے کر اسے واپس لے جاؤں گا۔" میں نے رسٹ واچ اُتار کر بیرے کے ہاتھ میں رکھ دی۔

ابھی وہ تذبذب میں ہی تھا کہ بیرے نے آ کر کہا۔

"صاحب انہیں جانے دیں۔ ان کا بل ادا کر دیا گیا ہے۔"

"کیا...... کس نے بل ادا کیا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کی ساتھ والی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے تھے۔ انہوں نے' دیکھئے وہ باہر جا رہے ہیں۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا' تو مجھے کسی شخص کی پشت نظر آئی۔ منیجر نے رسٹ واچ مجھے واپس دے دی اور معذرت کرنے لگا۔ میں اس کی بات سنے بغیر تیزی سے باہر لپکا تاکہ اس شخص کو دیکھ سکوں' جس نے اس انتہائی نازک وقت پر میری مدد کی ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف جا رہا تھا' جہاں گاڑیاں پارک تھیں۔ میں نے لپک کر اسے جا لیا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔

"کیا بات ہے...... آپ نے میرا راستہ کیوں روک لیا؟" اس نے تند نظروں سے مجھے گھورا۔

"دیکھئے صاحب...... یہ کیا ادا ہے کہ ایک تو آپ نے بل کی رقم ادا کر دی' اور پھر اپنی شکل دکھائے بغیر بھاگے جا رہے ہیں۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

میں نے اِرد گرد دیکھا۔ بیرے نے واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کسی غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

"کیا آپ اس کی تصدیق یا تردید کے لئے ذرا دیر کو میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔" میں نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا مصیبت ہے......" وہ جھنجھلا گیا۔ "کیا آپ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے۔"

"مشکل ہے۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر کوئی میرے قریب سے بھی گزر جائے' تو میں اسے دوست بنائے بغیر نہیں چھوڑتا اور آپ نے تو اس نازک وقت میں میری مدد کی ہے۔"

وہ ذرا سا مسکرایا۔

"فرض کیجئے میں نے ہی بل ادا کیا ہے تو پھر......"

"پھر یہ کہ اپنا ایڈریس دے دیجئے تاکہ میں آپ کی رقم مع شکریے کے واپس کر سکوں۔"

"جائیے صاحب اپنا راستہ ناپئے۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔" اس نے سختی سے کہا۔

"آپ کا کیا خیال ہے میں اس طرح آپ کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"آپ خوانخواہ گلے پڑ رہے ہیں۔" اس نے ترشی سے کہا۔

"تو پھر آپ مجھے گلے کیوں نہیں لگا لیتے۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"فقط آپ کی دوستی۔"

"عجیب انسان ہو۔"

"خیر اتنا بھی نہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"بات یہ ہے مسٹر کہ میں ہوں انتہائی آدم بیزار قسم کا آدمی' نہ میں دوست بنتا ہوں' نہ دوست بناتا ہوں۔" اس نے مجھے سمجھایا۔

"اور میں دوست بنائے بغیر نہیں چھوڑتا' کیونکہ دوست بنانا میری ہابی ہے۔"

غرض اس نے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کی' لیکن مجھے اس کا اکھڑ انداز کچھ ایسا بھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا تھا کہ اسے دوست بنا کر ہی چھوڑا' اور یہ تھی وقار عالم سے میری پہلی ملاقات۔'' نوید چپ ہو گیا۔

''سچ ویدی...... تمہاری ہمت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ کیسے لٹھ لے کر بے چارے کے پیچھے پڑ گئے۔''

''تو اور کیا کرتا۔ اس کے بغیر وہ ماننے والا ہی کب تھا۔''

''دوستی بھلا ڈنڈے کے زور پر کی جاتی ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''ہاں کبھی کبھی ضرورتاً یا مجبوراً۔''

''اور اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟''

''بہت عمدہ...... البتہ کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے ایک دم تلخ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہوتا۔ اس نے مجھے اپنے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا۔ ساری باتیں میں نے اِدھر اُدھر سے سنی ہیں۔''

''کیسی باتیں؟''

''یہی اس کی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق' اور اس کی بے تحاشا دولت کے متعلق' اصل میں لوگ اس کی دولت سے مرعوب ہو کر اس کی طرف کھنچتے ہیں اور جب ادھر سے لفٹ نہیں ملتی تو باتیں بناتے ہیں۔ وہ لوگوں میں زیادہ گھلتا ملتا نہیں' اور عموماً تنہا ہی نظر آتا ہے' اور ہاں ایک خاص بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ وہ لڑکیوں سے الرجک ہے۔''

''کوئی تلخ تجربہ۔''

''پتا نہیں۔'' نوید نے شانے اُچکائے۔ ''میں نے سنا ہے کلب میں کچھ لڑکیوں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی' مگر وقار نے انہیں بری طرح دھتکار دیا۔''

''ہاں وہ ایسے ہی لگتا ہے' حد درجے کا خشک اور انتہائی اکھڑ۔''

''لیکن وہ باہر سے جتنا سخت نظر آتا ہے' اندر سے اتنا ہی نرم ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''بس میرا اندازہ ہے۔''

''آدمی کسی قدر الجھا ہوا لگتا ہے۔'' میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

''تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے؟''

''تم جانتے ہو میں کوئی ماہر نفسیات نہیں۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بچپن کی غلط تربیت کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے اس کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ گئی ہے' اور اس نے اپنی بکھری ہوئی شخصیت کو ایک خول میں چھپا لیا ہے۔''

''اتنی بات تو کوئی بچہ بھی بتا سکتا ہے۔''

نوید نے میرا تمسخر اڑایا۔ ''کچھ اور بتاؤ۔''

''ایسے لوگ اپنے آپ سے جتنے لاپروا لگتے ہیں' اپنی ذات کے بارے میں اصل میں اتنا ہی حساس ہوتے ہیں...... اور......'' میں کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

''جی ارشاد......'' اس نے مذاق کیا۔

''اور یہ کہ تم انتہائی ڈھیٹ اور احمق ہو۔''

''کیا......؟'' وہ زور سے چیخا۔

میں دوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''اور ہاں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔'' میں نے مڑ کر کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بہت پیارے اور ہینڈسم ہو تو بالکل غلط کہا تھا۔ تم سے تو پیاری میری مانو ہے' اور تم تو بالکل باگڑ بلے لگتے ہو۔''

وہ مجھے مارنے کے لئے میرے پیچھے دوڑا۔ میں اس کو منہ چڑاتے ہوئے بھاگ آئی۔

اس دن سارا وقت میرا ذہن تم میں اُلجھا رہا۔ تمہاری شخصیت مجھے بڑی پُر اسرار لگ رہی تھی۔ تم جو کروڑ پتی تھے' لیکن تمہارے جسم پر ڈھنگ کا لباس نہ تھا۔ آخر کس چیز نے تمہیں اپنی ذات سے لاپروا کر دیا ہے۔ تم عورتوں سے الرجک تھے مگر کیوں؟ تم لوگوں سے بدظن تھے مگر وجہ؟'' میں جتنا تمہارے متعلق سوچتی اتنا ہی اُلجھتی جاتی۔ تم مجھے کھنڈرات میں چھپے ہوئے خزانے کی طرح پُر اسرار مگر پُرکشش لگے اور میرا دل چاہا کہ میں اس خزانے کو کھوج لوں۔ میں نفسیات کی طالبہ تھی' اور مجھے اپنی ذہانت کا کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ اس زعم میں لوگوں کے متعلق اُلٹے سیدھے اندازے لگاتی رہتی تھی۔ اکثر نوید بھی میرے اس دلچسپ کھیل میں شامل ہو جاتا' اور میرے غلط سلط اندازوں پر خوب قہقہے لگاتا۔

تمہاری شخصیت نفسیات کی ایک طالبہ کے لئے خاصی امپریس کرنے والی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آدمی جیسا بھی ہو' جو کچھ بھی ہو' اس کا دل ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ الگ بات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ وقت اور حالات کی گرد اس خوبصورتی کو چھپا دے۔ لیکن گرد کتنی بھی دبیز ہو' اسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ صاف کرنے والے ہاتھ ہوں۔ کیا تمہارے گھر میں کوئی نہیں جو تمہارا خیال رکھ سکے' جو تمہیں بیزاری اور سرد مہری کے اس آہنی خول کے پیچھے سے باہر کھینچ لائے۔ پتا نہیں کس حادثے نے تمہیں اتنا سخت کر دیا ہے' تو بھی بھلا مجھے کیا مل جائے گا۔ مجھے تم سے اپنی لیاقت کا سرٹیفکیٹ تو لینا نہیں۔

بس بہت ہو چکی...... یعنی میں نے پھر ایک پورا دن تم پر ضائع کر دیا۔ حماقت کی بات ہے کہ نہیں۔ ارے تم کیسے بھی ہو' کچھ بھی ہو' تمہیں سمجھ کر مجھے لینا کیا ہے۔ میں جو یہ فضول باتیں سوچتی رہتی ہوں' تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میرے پاس ضائع کرنے کے لئے بہت سا وقت ہے' گو کہ مجھے اپنی اس چھوٹی سی کھوپڑی پر بہت ناز ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دماغ کے کچھ اسکرو ڈھیلے ہیں' اور جو تھوڑی بہت عقل بھی تھی' وہ اس نفسیات کے چکر میں ختم ہو رہی ہے۔ سچ مچ نفسیات پڑھنے والے آدھے پاگل ہوتے ہیں۔ میں نے انتہائی خلوص سے سوچا اور نفسیات مابعد النفسیات پر جھک گئی۔

شروع شروع میں مجھے اپنی اس چھوٹی سی حماقت کا بہت خیال رہا' جو تمہارے سلسلے میں مجھ سے سرزد ہوئی تھی' اور یہ سوچ سوچ کر مجھے ہنسی آتی رہی کہ جب تم نے اپنی گاڑی میں وہ سفید جرسی دیکھی ہوگی تو تم نے کیا سوچا ہوگا' کبھی نوید مجھے چھیڑنے کے موڈ میں ہوتا تو اسے اس جرسی کی یاد ستانے لگتی' جو میرے جذبہ ہمدردی کی نذر ہو گئی تھی' اور جب وہ اس نادیدہ جرسی کی یاد میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہوتا' تو تمہاری تحقیر آمیز نگاہیں میرے تصور میں جھلملانے لگتیں اور مجھے اپنی اس احمقانہ حرکت پر ہنسی آ جاتی۔

اللہ...... مجھے ترس بھی آیا تو اس مغرور رئیس پر' جو اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں' اور وہ خوامخواہ کی ہمدردی' جو میں نے بے کار میں تم پر ضائع کی...... اور اگر تم یہ سب جان لیتے تو...... میرے اللہ بھلا اس دنیا میں مجھ سے بڑا احمق بھی کوئی ہے' بھئی حد ہو گئی۔ لوگ دنیا میں بڑی بڑی حماقتیں کرتے ہیں' اور بھول جاتے ہیں۔ اور میں ہوں کہ...... زندگی اتنی معمولی چیز تو نہیں کہ اسے خوامخواہ ہی اپنی حماقتوں پر کڑھنے میں صرف کر دیا جائے۔ پھر جب آدمی کے پاس یاد رکھنے کے لئے بہت سی دلچسپ باتیں ہوں' تو اسے ایک غیر اہم سا واقعہ بھولنے میں کون سا وقت لگتا ہے۔

زندگی کی گہما گہمیوں اور دلچسپیوں میں یہ واقعہ آہستہ آہستہ میرے ذہن سے اُتر گیا۔ اور میں تمہیں اور تمہاری نگاہوں کی نفرت کو قریب قریب بھول گئی۔ کم از کم اس وقت تو میرے ذہن میں تمہارا کوئی خیال نہ تھا' جب میں فوزیہ کی شادی میں شرکت کے لئے بڑے اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔

اب مجھے کیا خبر تھی کہ وہاں ایک بار پھر تم سے سامنا ہو جائے گا۔ پھر یہ کیا ضروری تھا کہ ہماری گاڑی اسی دن خراب ہو جاتی۔ مگر سب کچھ یونہی ہونا تھا۔ اس لئے کہ تقدیر کے ان دیکھے ہاتھ جو طلسمی جال ہمارے اِردگرد بن رہے تھے' انہیں توڑ ڈالنا نہ میرے بس میں تھا' نہ تمہارے اختیار میں۔

ہاں تو اس دن میں نے تمہیں سیٹھ داؤد کی لڑکی فوزیہ کی شادی پر دیکھا۔ اس وقت ساری لڑکیاں فوزیہ کے اِردگرد جمع تھیں' اور خوب چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی کہ بارات آنے کا شور مچا اور لڑکیاں فوزیہ کو چھوڑ کر بارات دیکھنے کے لئے بھاگیں۔ اس افراتفری میں میرا پاؤں غرارے کے پائنچے میں اُلجھ گیا' اور میں گرتے گرتے بچی۔ جب میں نے سنبھل کر نظریں اٹھائیں' تو میری نظر تم پر پڑی۔ تم اس سارے ہنگامے سے الگ تھلگ ایک کونے میں کھڑے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ تمہارے ہاتھوں میں سونے کا خوبصورت نقشین لائٹر تھا' اور جسم پر نفیس تراش خراش کا بے حد قیمتی تھری پیس سوٹ۔

گو تمہارے چہرے پر وہی ازلی و ابدی بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود تم شاندار لگ رہے تھے۔ پھر شاید تمہیں میری نظروں کا احساس ہو گیا تھا' کیونکہ تم نے چونک کر سر اُٹھایا' پھر مجھے دیکھ کر تمہاری پیشانی پر بل پڑ گئے' اور آنکھوں میں نفرت گھلنے لگی۔ تم نے سگریٹ پھینک دیا' اور تیز تیز قدم اُٹھاتے لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئے۔ میں مارے رنج کے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جانے کیوں میرے دل پر چوٹ سی پڑی تھی' اور توہین کے احساس سے آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ میں نے زمین کی طرف دیکھا' جہاں تم نے سگریٹ پھینکا تھا۔ غالباً تم نے اس کا ایک آدھ کش ہی لگایا تھا' اور پھر اسے اپنی نفرت کا سمبل بنا کر چھوڑ گئے تھے۔ سگریٹ کا دھواں بل کھا کھا کر اوپر کو اُٹھ رہا تھا' جیسے چیخ چیخ کر تمہاری نفرت کا اعلان کر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے سگریٹ اُٹھا لیا' اور اسے رگڑ کر بجھا ڈالا۔ شاید اس طرح میں نے نفرت کی اس آگ کو سرد کرنے کی لاشعوری کوشش کی تھی' جو تمہارے دل میں سلگ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہی تھی۔

رات گئے واپسی ہوئی۔ مجھے بینا اور سعدیہ آنٹی کے ساتھ نوید کی گاڑی میں جگہ ملی۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ گاڑی نے ایک دو جھٹکے کھائے' اور رک گئی۔

"کیا ہوا......؟" آنٹی نے چونک کر پوچھا۔ "تم نے گاڑی کیوں روک دی؟"

"غالباً انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔" نوید نے بتایا اور ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکال کر انجن پر جھک گیا۔ تب ہی عقب سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے لحہ بھر کے لئے سڑک کے اس حصے کو روشن کر دیا۔ گاڑی کے بریک چرچرائے' اور وہ ذرا دور جا کر رک گئی۔ اگلے ہی لمحے تم نوید کے قریب کھڑے تھے اور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تمہارے چہرے کا ایک ایک نقش صاف نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے نوید...... کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی؟" تم نے پوچھا۔

"ہاں انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے' مگر سمجھ میں نہیں آ رہا۔" نوید نے متفکر ہو کر کہا۔

"اوہ...... شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" تم نے کہا' اور مڑ کر اپنے شوفر کو پکارا۔ تمہارا باوردی شوفر گاڑی سے اتر کر اٹین شن ہو گیا۔

"دیکھو' ادھر انجن میں کیا خرابی ہے؟" تم نے شوفر کو حکم دیا' اور جب وہ انجن چیک کرنے لگا' تو تم نے کہا۔

"رات کافی بیت چکی ہے' اور تمہارے ساتھ عورتیں بھی ہیں۔ تم میری گاڑی لے جاؤ۔ میں تمہاری گاڑی میں چلا جاؤں گا۔"

"لیکن اگر گاڑی ٹھیک نہ ہو سکی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا' صفدر اچھا ڈرائیو ہی نہیں اچھا میکینک بھی ہے۔" تم نے یقین دلایا۔

"مگر تمہیں خوامخواہ تکلیف ہو گی۔" جانے کیوں نوید ہچکچا رہا تھا۔ حالانکہ وہ کسی قسم کے تکلف کا قائل نہ تھا۔

"صفدر! گاڑی ٹھیک ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟" تم نے شوفر سے پوچھا۔

"سر کم سے کم آدھ گھنٹہ۔" صفدر نے مؤدب ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے تم اسے گیراج میں لے جانا۔" تم نے اسے ہدایت کی۔ "اور اوزاروں کی ضرورت ہے تو گاڑی سے نکال لو۔"

"او کے سر۔"

"چلو میں تم لوگوں کو خود ڈراپ کر دیتا ہوں۔ اپنی گاڑی صبح منگوا لینا۔"

تم نے قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا' جیسے اب مزید کوئی بات سننا نہیں چاہتے۔ نوید کے کہنے پر ہم تمہاری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اندر سے بے حد آرام دہ اور شاندار تھی۔ اندر باہر کے سرد موسم کا کوئی اثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ ٹیپ پر اتنے مدھم سُروں میں ساز بج رہا تھا' کہ آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ تم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اندر کی لائٹس آف کر دیں اور ٹیپ بند کر دیا۔ جانے کیوں' تب آنٹی نے پہلی بار تمہیں مخاطب کیا۔

"بیٹے رات گئے تمہیں تکلیف دیتے ہوئے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔"

"اور اب آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔" تم نے بے حد شائستگی سے کہا۔

تمہارے مہذب لہجے پر چونک کر میں نے تمہیں دیکھا' کیا یہ تم ہی ہو وقار عالم...... تم...... نوید کے بے حد اکھڑ اور اُجڈ دوست' مگر میری نظریں تمہاری پشت سے ٹکرا کر جھک گئیں' اور اس اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہ آ سکا۔ بینا مسلسل سرگوشیاں کر رہی تھی۔ مگر میرا دھیان تمہاری طرف تھا۔ تم آنٹی کی باتوں کا جواب بہت اخلاق' بڑی نرمی سے دے رہے تھے' اور اس اندھیرے میں تمہاری خوبصورت آواز کا جادو پوری طرح جاگ رہا تھا۔ میں بہت حیران تھی کہ تم اور یہ نرم لب و لہجہ' کہیں میرے کان دھوکا تو نہیں کھا رہے' وہ تمہاری آواز کا کھردرا پن کہاں گیا۔

"بیٹے کبھی کبھی اپنے گھر والوں سے بھی ملاؤ۔ مجھے اچھے لوگوں سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

آنٹی نے کہا' مگر تم چپ رہے۔

"اچھا یوں کرو' کل شام کی چائے تم سب ہمارے ساتھ پیو۔" آنٹی نے پھر کہا۔

"میرے والدین حیات نہیں ہیں۔" تم نے مدھم لہجے میں کہا۔ "میں اکیلا رہتا ہوں۔"

"اوہ......" آنٹی چپ ہو گئیں۔

"تو گویا ابھی تک تم نے شادی نہیں کی۔" میں نے بے تکے پن سے پوچھا۔ حالانکہ تم خاصے بڑے لگتے ہو' کم از کم ایک آدھ بچے کے باپ...... تم نے گاڑی گیٹ کے سامنے روکی تو آنٹی تمہارا شکریہ ادا کرنے لگیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں آپ کے لئے غیر سہی' مگر آپ بار بار مجھے اس کا احساس تو نہ دلائیں۔" تم نے سنجیدگی سے کہا۔

ایک بار پھر مجھ پر حیرت کا دورہ پڑا۔ تو تم ایسی باتیں بھی کر سکتے ہو۔ کمال ہے۔ میں نے سوچا۔

"نہیں بیٹے ...... نوید کے دوست تو مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں۔' آنٹی نے بے حد شفقت سے کہا۔ "میں نے انہیں کبھی غیر نہیں سمجھا۔"

"تب ہی آپ میرا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟"

"ارے بیٹے یہ تو اچھے اخلاق کا تقاضا ہے۔ غیریت نہیں۔"

"اچھا تو آپ نوید کا بھی شکریہ ادا کرتیں۔" تم نے پوچھا۔

تو آنٹی لاجواب ہو گئیں۔ پھر جب تم جانے لگے تو آنٹی نے بے حد اصرار سے تمہیں رکنے کے کہا۔ مگر تم نے کہا۔

"رات بہت بیت چکی ہے۔ آپ ان تکلفات میں پڑنے کے بجائے جا کر آرام کریں۔"

"اچھا تو تم کل آ رہے ہو نا۔ ضرور آنا بیٹے۔ مجھے انتظار رہے گا۔"

"جی میں حاضر ہو جاؤں گا' مگر کل نہیں ...... پرسوں۔ کل مجھے کچھ کام ہے۔" تم نے جواب دیا' اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

اس رات میں پھر تمہارے متعلق سوچتی رہی۔ تم آنٹی سے کتنی نرمی' کتنے سلیقے سے باتیں کر رہے تھے' کیا یہ چیز تمہاری فطرت کے خلاف نہ تھی۔ ایک اُکھڑ اور بدمزاج شخص سے اتنے نرم رویے کی توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ کیا تم نے نوید کی خاطر اپنے رویے میں تبدیلی کی تھی' یا محض آنٹی کے احترام میں اپنی طبیعت پر جبر کرتے رہے۔ تم تو آدم بیزار مشہور ہو اور کسی کو ذرا بھی لفٹ دینے کے قائل نہیں۔ پھر تم نے اپنے مزاج کے خلاف اتنی شائستگی کیوں برتی' اور یہی نہیں تم نے پھر آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اپنی تمام تر بدمزاجیوں اور اُکھڑ پن کے باوجود۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہ تھی۔

اور اس دن جب تم ویدی کے گھر آ رہے تھے میری کیفیت عجیب سی تھی۔ میں تمہارے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی' لیکن میرے قدم بار بار ویدی کے گھر کی طرف اُٹھتے تھے۔ میں تم

سے ملنا نہیں چاہتی تھی' لیکن کوئی چیز مجھے تمہاری طرف کھینچ رہی تھی۔ پر کوئی چیز میرے پاؤں کی زنجیر بھی بن رہی تھی۔ میں رک رک جاتی۔ بینا صبح سے کئی بار مجھے بلا چکی تھی' مگر ہر بار میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ خفا ہو کر گئی تھی کہ ویسے تو دن میں بیسوں بار چکر لگاتی ہو' اور آج میں بلا رہی ہوں' تو تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے۔

"بھئی آج موڈ نہیں بن رہا۔" میں نے کاہلی سے کہا۔ "پھر روز روز چکر لگانا کوئی ضروری ہے۔ کسی بھلے آدمی نے کہا ہے۔

"قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا"

"میری بلا سے ...... مت آؤ"

اس نے ناراض ہو کر کہا' اور روٹھ کر چل دی۔ میں نے اسے منانے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ پھر مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ خیر اسے منانا کیا مشکل ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔

ایک بار تم آ کر چلے جاؤ۔ پھر میں اسے خود منا لوں گی۔ تو یہ طے ہے وقار عالم کہ میں تمہارے سامنے قطعاً نہیں آؤں گی۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ میں نے فیصلہ کیا' اور اس دن سگریٹ پھینکتے ہوئے کس قدر بیزاری اور نفرت سے تم نے رُخ موڑا تھا' جیسے مجھ پر نظر پڑتے ہی پگھل جاؤ گے' راکھ ہو جاؤ گے۔ میں پھر سوچنے لگی۔ پھر بھلا اس نفرت کی کوئی تک بھی ہے۔ اس طرح تم مجھ پر کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ کیا یہ کہ تم میری صورت نہیں دیکھنا چاہتے' اور یہاں کون تمہاری وید کے اشتیاق میں مرا جا رہا ہے۔ تم میں کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا کہ میں...... اور میں بھی کوئی ایسی گری پڑی نہیں ہوں کہ تمہارے توہین آمیز رویے کے باوجود بار بار تمہارے سامنے آؤں۔ مجھے اپنی انا بہت عزیز ہے' اور میں جتنی حساس ہوں' اتنی ہی خوددار بھی۔ شاید تمہیں اپنی دولت پر بہت گھمنڈ ہے۔ اسی لئے تم اپنے سوا کسی کو کچھ نہیں سمجھتے' اور تمہاری سرد اور مغرور نگاہوں میں نفرت ہے اور حقارت ہے۔

مگر مجھے بتاؤ اس دولت کا کیا فائدہ' جس نے تمہیں اپنی ذات کے حصار میں قید کر دیا ہے' اور تم بے چارے اتنے بے بس' اتنے قابل رحم کہ نہ تو اس حصار کو توڑ کر باہر نکل سکتے ہو' نہ دوسروں کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہو سکتے ہو۔ تم تو اپنے ہی قیدی ہو اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بیگانہ' بس اپنے آپ میں جیے جا رہے ہو۔ جیسے تمہیں کسی سے کوئی واسطہ کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطلب نہیں۔ حالانکہ تم بھی اسی دنیا کا حصہ ہو۔ مگر تم نے اپنے آپ کو کاٹ کر الگ کر ڈالا ہے' اور تم سمجھ رہے ہو کہ تم بہت اونچے' بہت منفرد' بہت قابل فخر ہو۔ مگر تم اتنے تنہا' اتنے اکیلے' اتنے قابل رحم ہو کہ تم پر ترس آتا ہے۔ لوگوں نے تمہیں اپنی ذات کے اندر تنہا چھوڑ دیا ہے' تاکہ تم تنہا ہنسو اور تنہا روؤ...... اور یہ کتنی بڑی سزا ہے' اور یہ سزا تمہیں اس لئے ملی ہے کہ تم آدمیوں سے الرجک ہو' اور ان کی خوشیوں اور غموں سے بے نیاز۔

حالانکہ تم ان میں سے ہو' مگر تمہیں اپنی ہی خوشبو دیوانہ رکھتی ہے' اور تم آنکھیں بند کیے اپنے ہی گرد گھومے جا رہے ہو' مگر میں یہ سب کیا سوچنے لگی۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے' کہ تم سے نہیں ملنا تو پھر بات ختم...... خوامخواہ فضول سوچوں میں اپنا وقت ضائع کر دیا۔ ارے سوچنے کے لئے دنیا میں ایک سے ایک دلچسپ موضوع بھرا پڑا ہے' اور میں ہوں کہ ایک بالکل غیر دلچسپ' انتہائی بور اور حد درجے کے خشک موضوع پر سوچ کر اپنے کور ذوق ہونے کا پورا پورا ثبوت دے رہی ہوں۔ لگتا ہے میرا دماغ پٹڑی سے اتر گیا ہے' اور جو یہی حالت رہی تو سمجھو لو کہ گدو بندر پہنچنے کا پورا پورا سامان ہو گیا۔

اور پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ میں نے فیروزی شیڈڈ ستاروں والی ساڑھی کا انتخاب کیا۔ اونچا جوڑا بنایا' اور ہلکے سے میک اپ کے بعد جب میں کانوں میں فیروزی نگینوں والے آویزے ڈالنے لگی' تو میرے دل نے چپکے سے پوچھا۔

"آخر یہ اہتمام کیوں...... کہیں یہ سب کچھ تمہارے لئے تو نہیں؟" مگر میں نے بڑے یقین سے اپنے آپ سے کہا۔

"کہ نہیں' میں کوئی ادھر تھوڑی جا رہی ہوں۔ بس ساڑھی پہننے کو جی چاہا سو پہن لی۔ اور ساڑھی کے ساتھ جوڑا تو بنانا ہی تھا۔"

غرض اس قسم کی تاویلوں سے میں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا' مگر جانے کیا بات تھی نہ پینٹنگ میں جی لگ رہا تھا' نہ مطالعے میں' بیزار ہو کر میں نے کتاب پٹخ دی اور برآمدے میں نکل آئی۔ تھوڑی دیر تک میں باڑ کے اوپر سے نوید کے لان میں جھانکتی رہی' جو بالکل ویران پڑا تھا' پھر واپس کمرے میں آ گئی۔ سنگھار میز کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا۔

"بینا سچ ہی کہتی ہے۔ ہر لباس مجھ پر سجتا ہے' اور مجھے لباس پہننے کا سلیقہ ہے۔"

جب میں جی ہی جی میں اپنے آپ کو اور اپنے حسنِ ذوق کو سراہ چکی تو آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی' لیکن میرے اندر عجیب سی بے چینی تھی۔ ایک بار پھر میں برآمدے میں نکل آئی' اور ملحقہ لان کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے؟" ممی نے مجھے بار بار برآمدے کا چکر لگاتے دیکھا تو پوچھا۔

"نہیں تو......" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ جیسے میرے اندر کوئی چور ہو۔

"تو کیا تم کہیں جا رہی ہو؟"

"اوہ نہیں ممی...... میں کہیں نہیں جا رہی۔"

"تو پھر ضرور تمہارا نوید سے جھگڑا ہو گیا ہے۔" ممی ہنسیں۔

"تب ہی تم صبح سے ادھر نہیں گئیں اور اب اس کے لئے بے چین ہو رہی ہو۔"

"نہیں ممی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" مجھے ان کے اندازوں پر ہنسی آ گئی۔ "میں ذرا نوید کو دیکھ رہی تھی' مگر وہ نظر نہیں آ رہا۔"

"تو اندر جا کر دیکھ لو نا...... یہاں کھڑے ہو کر سوکھنے سے فائدہ۔"

"سوچ تو رہی ہوں۔" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔ "مگر شاید وہ گھر پر نہ ہو۔"

"تو کون سا تمہیں کوسوں چلنا پڑے گا۔ جا کر دیکھ لو۔" ممی نے لاپروائی سے کہا۔

اور ابھی میں نہ جانے کا کوئی معقول سا بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ مجھے نوید نظر آ گیا۔ اس نے مجھے باڑ کے اوپر سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور وہیں سے چلایا۔

"اے تاک جھانک کرنا شریفوں کا کام نہیں۔"

"میں کب تاک جھانک کر رہی ہوں۔ خوامخواہ ہی۔ میں تو...... میں تو......" میں نے بات بنانا چاہی۔

"ہاں...... تم تو پھول چن رہی تھیں...... ہے نا۔" نوید نے لقمہ دیا۔

"ہاں......" میں نے بلا سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔

نوید زور سے ہنس پڑا۔

"مگر تمہارے ہاتھوں میں تو کوئی پھول نہیں۔ شاید ابھی تمہاری نگاہِ انتخاب پر کوئی پورا نہیں اترا۔ ہے نا...... اور اور یہ تو بتاؤ یہ پھول ہیں کس کے لئے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے پاس آ کر سرگوشی کی۔ ''سچ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ پتا تو چلے آخر یہ اتنا تردد ہو کس کے لئے رہا ہے۔''

وہ جان بوجھ کر ستا رہا تھا۔

''تمہارے لئے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''شکریہ......'' وہ کھلکھلایا۔

''نوازش' کرم' شکریہ' مہربانی۔''

''بکے جاؤ خوامخواہ ہی۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔

''اور یہ تم صبح سے کہاں چھپی بیٹھی ہو۔ کیا بینا سے لڑائی ہو گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو ہماری لڑائی کیوں ہونے لگی۔ ہم کوئی تمہاری طرح لڑاکا ہیں۔''

''تو پھر...... اچھا میں سمجھا ضرور تمہارے سسرال والے آ رہے ہیں۔''

''قسم سے ویدی بھائی...... میں مار بیٹھوں گی۔''

''ہاں ایسی ہی تو...... تم رستم زماں ہو۔ ایک پھونک ماروں تو ہوا میں اڑتی نظر آؤ۔''

''اب یہیں کھڑے باتیں بناتے رہو گے۔ اندر آ جاؤ۔''

''مجھے وقار کا انتظار ہے۔ تم آ جاؤ۔ گپ شپ رہے گی۔''

''اوہوں...... مجھے تو بڑا ضروری کام ہے۔''

''اپنا ضروری کام پھر کر لینا۔ میں بڑا سخت بور ہو رہا ہوں۔''

''تو پھر میں کیا کروں۔'' میں نے لاپروائی ظاہر کی۔

''چلتی ہو سیدھی طرح کہ نہیں۔'' نوید نے آنکھیں دکھائیں۔

''خدا کی قسم گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔''

اور میں نہ نہ کرتی بھی اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

''کیا خیال ہے کیرم کی ایک بازی ہو جائے۔'' اس نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''ہو جائے...... مگر پہلے میں آنٹی اور بینا سے تو مل لوں۔''

''کیا ضروری ہے؟''

''بالکل...... بہت ضروری ہے۔''

''تو پھر جاؤ مل آؤ' مگر پہلے ایک بات سن لو۔''

''کیا......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آج بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔''

''وہ تو میں ہوں ہی ہمیشہ سے۔'' میں اترائی۔

''ویسے تمہارا شکریہ۔''

''اب زیادہ اتراؤ نہیں۔ ایسی خوبصورت بھی نہیں ہو۔''

''اور ایسی بدصورت بھی نہیں ہوں۔''

میں نے ہنس کر کہا اور آنٹی سے ملنے چلی گئی۔ آنٹی سے معلوم ہوا کہ بینا کچن میں مصروف ہے۔ جا کر دیکھا تو بڑی پلیٹ ہاتھ میں پکڑے چاٹ کھا رہی تھی۔

''بینا رانی...... میں کچھ مدد کروں۔'' میں نے دبے پاؤں اس کے قریب جا کر کہا۔

''ارے...... تم کہاں سے ٹپک پڑیں؟'' وہ اچھل پڑی۔

''تو تم نہیں آ رہی تھیں۔''

''بس آ گئی...... تمہاری خاطر۔'' میں نے احسان کرنے والے انداز میں کہا۔

''بہت مہربانی...... یہ چاٹ تو دیکھو کیسی بنی ہے۔'' اس نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔

میں نے چاٹ چکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''اچھی ہے مگر اتنی اچھی نہیں' عمدہ ہے مگر اتنی عمدہ نہیں' لذیذ ہے مگر اتنی لذیذ نہیں۔''

''بس بس رہنے دو بہت ہو چکی تعریف۔'' بینا نے برا سا منہ بنایا۔

''ابھی تو میں نے تمہید ہی باندھی ہے' پر تم کہتی ہو تو۔''

''بس اتنا ہی کافی ہے۔'' بینا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تم نے دیکھا میں نے ڈرائنگ روم کی سیٹنگ بدلی ہے۔''

''دیکھا تو نہیں' دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے بے نیازی سے کہا' اور پلیٹ اسے پکڑا دی۔

✱✦✱

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈرائنگ روم میں نوید بڑے ٹھاٹھ سے صوفے پر بیٹھا انگلش میگزین دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

"کیا شان ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ چھینتے ہوئے کہا۔ "بڑے پڑھاکو ہو رہے ہو۔"

"شکر ہے تمہیں فرصت تو ملی۔" نوید نے ناراضگی سے کہا۔ "اگر کچھ باتیں رہ گئی ہوں تو وہ بھی کر آؤ۔"

"باتیں تو بہت رہتی ہیں' پر یہ تم خوامخواہ منہ نہ پھلا لیا کرو' چلو کیرم بورڈ نکالو۔"

"مجھے نہیں کھیلنا اب۔"

"نہ کھیلو...... مگر اپنا موڈ تو ٹھیک کر لو۔ تمہارا دوست کیا سوچے گا۔"

"میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے' اور تمہیں یہ میرے دوست کی فکر کیوں پڑ گئی؟"

"وہ سمجھے گا تم کسی لڑکی سے پٹ کر آ رہے ہو۔"

"کیا......" نوید چلایا۔ "باز آ جاؤ...... ورنہ......"

"وہ ویری...... اصل میں تمہاری فیگر ہی اتنی شاندار ہو رہی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ اس کے علاوہ اور کوئی خیال سوجھ ہی نہیں سکتا۔"

"تم اپنا خیال اپنے پاس ہی رہنے دو۔" نوید نے خفگی سے کہا۔

"بہت خفا ہو۔ معافی نہیں ملے گی۔" میں نے مسکین سی صورت بنائی۔

نوید نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر زور سے ہنس پڑا۔

"ملے گی...... مگر ایک شرط پر۔"

"وہ کیا......؟"

"ایک پیالی چائے پلا دو۔ ذرا سٹرانگ سی۔"

"بڑے خود غرض ہو۔ دوست کے آنے سے پہلے چائے پی لو گے۔"

"وہ بات یہ ہے نیل کہ میرے سر میں بڑے زور کا درد ہو رہا ہے۔ سچ میں مرا۔" اس نے مریضوں جیسی صورت بناتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"یہ ایکٹنگ چھوڑ دو۔ دھوکے باز کہیں کے۔ میں چائے لا رہی ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور سنو اب تھوڑی دیر کے لئے مرنے کا پروگرام ملتوی کر دو۔"

"اوکے' لیکن ذرا جلدی۔ ورنہ میں اپنے پروگرام پر عملدرآمد کر بیٹھوں گا۔" اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

میں نے اسے تسلی دی اور کچن میں چلی گئی۔

جب میں چائے لے کر واپس آئی تو نوید ڈرائنگ روم میں نہ تھا۔

"نوید...... نوید......" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پکارا۔ "بھئی یہ کیا طریقہ ہے۔ مجھے چائے کے لئے کہہ کر خود غائب ہو گئے۔"

میں غصے میں واپس پلٹی تو ایک دم کسی سے بری طرح ٹکرا گئی۔ پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں خود بھی گرتے گرتے بچی۔

"تم نے تو اسے جلا ڈالا ہے نیل۔" نوید کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں نے بوکھلا کر نظریں اٹھائیں۔ تم پردہ تھامے عین میرے سامنے کھڑے تھے۔ کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت اور خاموش۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گئی اور تمہارے منجمد چہرے پر پھسلتی ہوئی میری نظریں تمہارے پاؤں پر جم گئیں۔ میں نے بمشکل اپنی ہمت مجتمع کی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

تم کچھ کہے بغیر اپنے پاؤں پر جھک گئے۔ جب تم نے بھیگا ہوا موزہ اتارا تو میں نے دیکھا تمہارے پاؤں پر ننھے ننھے آبلے پڑ گئے تھے۔ میں گھبرا گئی۔ آنٹی سے برنال لینے کے لئے دوڑی۔ جب میں برنال لے کر واپس آئی تو تم آرام سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے نوید سے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے تمہارے قریب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قالین پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ذرا اپنا پاؤں ادھر کیجئے۔"

مگر جانے کیوں میری آواز کانپ رہی تھی۔

"وہ کیوں......؟" تم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پھر میرے ہاتھوں میں برنال دیکھ کر تم خود ہی سمجھ گئے۔

"لایئے...... مجھے دیجئے میں خود ہی لگا لوں گا۔"

تم نے خلافِ معمول نرمی سے کہا' اور میرے ہاتھ سے ٹیوب لے لی۔ تب ہی آنٹی اور بینا اندر داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا بیٹے...... کیا پاؤں زیادہ ہی جل گیا۔" آنٹی نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ بس یوں ہی معمولی سا۔" تم نے تعظیماً اٹھتے ہوئے کہا۔

"دکھاؤ تو بھلا۔" آنٹی تمہارے پاؤں پر جھک گئیں' اور برنال تمہارے ہاتھوں سے لے کر پاؤں پر لگانے لگیں۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ میں خود لگا لوں گا۔" تم نے اپنا پاؤں پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔

"چپکے بیٹھے رہو۔" آنٹی نے شفقت سے ڈانٹا۔

"یہ آپ کی بڑی زیادتی ہے۔" تم نے احتجاج کیا۔

مگر آنٹی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے زبردستی تمہارے پاؤں پر برنال لگا دی۔

"دیکھو چند دن پانی سے احتیاط کرنا' کہیں یہ بگڑ نہ جائے۔" آنٹی نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

میں نادم سی پلکیں جھکائے چپکی بیٹھی رہی۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ چپکے سے سب کی نظر بچا کر بھاگ جاؤں۔ لیکن اس ڈر سے کہ اگر میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو سب میری طرف متوجہ ہو جائیں گے' میں وہیں ٹکی رہی۔

"ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھی ہو۔" اچانک نوید کو میرا خیال آ گیا۔

"نہیں تو......" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں کیوں رونے لگی۔"

"واہ یہ ہنس رہی ہو کہ رو رہی ہو۔" نوید کا انداز مضحکہ اُڑانے والا تھا' مگر میں اس سے اُلجھنے کے بجائے چپ ہو گئی۔

"لگتا ہے کوئی سکرو ڈھیلا ہو گیا ہے۔ کیوں۔ آخر بات کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ خوامخواہ ہی میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" میں نے چڑ کر کہا۔ اس کا اس طرح سب کو میری طرف متوجہ کر دینا مجھے کھل رہا تھا۔

"پیچھے کب میں تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔" اس نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"ویدی کے بچے۔" میں روہانسی ہو گئی۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو اسے۔" آنٹی نے ڈانٹا۔

"آدمی بنو۔"

"آدمی تو میں ہوں اللہ کے فضل سے۔" نوید نے دبی زبان میں کہا۔ اور آنٹی کی نظر بچا کر میرا منہ چڑا دیا۔ بینا چائے لانے کے لئے اُٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھ گئی' جب وہ ٹرالی میں سارا سامان سجا چکی تو میں نے اس سے کہا۔

"سنو بینا...... میں گھر جا رہی ہوں۔"

"کیوں...... پاگل ہو گئی ہو کیا۔" وہ ٹرالی دھکیلتے دھکیلتے رُک گئی۔

"بات یہ ہے بینا کہ مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔ میری غلطی کی وجہ سے بے چارے کا پاؤں جل گیا۔"

"بھئی تو دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے ہو۔ غلطی تو دونوں کی ہے۔" بینا شرارت سے ہنسی۔

"مگر پاؤں صرف اس کا جلا ہے بینا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے جان بوجھ کر اسے جلایا ہے۔"

"کیوں خوامخواہ ہی...... تمہاری اس سے بھلا کیا دشمنی ہے۔"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ مگر وہ یہی سمجھے گا۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"احمق ہو تم......" اس نے فیصلہ صادر کیا۔

اب میں کیا بتاتی کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں نے تو پہلے دن ہی تمہاری آنکھوں میں نفرت کھوج لی تھی' جو آدمی کے اندر سے اُٹھتی ہے' اور جس کا بظاہر کوئی سبب بھی نہ تھا۔ تم سچ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچ مجھے اپنا دشمن سمجھتے تھے' اور تو مجھے اس بے بنیاد دشمنی کا کوئی جواز نظر نہ آتا تھا' تاہم میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ تم میرے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ پھر بھلا میں کیسے مان لیتی کہ تم نے اسے محض اتفاق سمجھا ہو گا۔ تمہاری آنکھیں تو ویسے بھی بغیر کسی وجہ کے زہر اگلتی رہتی ہیں۔ اب تو تمہیں ایک جواز بھی مل گیا ہے۔ میں نے سوچا۔

اور مجھے تمہارے سامنے جاتے ہوئے ڈر سا لگنے لگا۔

"نہیں بینا تم جاؤ میں۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم ایک مفروضہ قائم کرو اور اسے بنیاد بنا کر بھاگ جاؤ۔" بینا نے بگڑ کر کہا۔ "سیدھی طرح چلتی ہو کہ بلاؤں نوید بھیا کو۔ وہ خود تم سے سمجھ لیں گے۔"

"اسے کاہے کو زحمت دیتی ہو' میں چل رہی ہوں۔" میں نے اس خیال سے کہ کہیں وہ سچ مچ نوید کو آواز نہ دے دے اور تمہارے سامنے میرا تماشا بن جائے' جلدی سے کہا۔

"اب ہوئی نا بات۔" وہ مسکرائی اور ٹرالی دھکیلنے لگی۔

"آنٹی اگر آپ اہتمام نہ کرتیں اور محض اپنے ہاتھوں سے چائے کا ایک کپ بنا کر پلا دیتیں' تو یہ میرے لئے ایک بہت بڑی سعادت ہوتی۔" تم نے ٹرالی مختلف چیزوں سے بھری دیکھ کر کہا۔

"دراصل وقار بھائی! ہمارا کھانے پینے کا موڈ بن رہا تھا' سوچا ہمارے ساتھ آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا۔"

"ہاں بیٹے تکلف مت کرو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

"تکلف میں نے کیا ہے یا آپ نے۔ میں تو اپنا ہی گھر سمجھ کر آیا تھا' مگر آپ نے تو انتہا کر دی۔"

تمہارا لہجہ شکایتی تھا۔

"بھئی وقار کفرانِ نعمت نہ کرو۔" نوید نے گلاب جامن منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب چیزیں تمہیں انصاف کے لئے پکار رہی ہیں۔"

"اور ہم ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے وقار بھائی آپ کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔" بینا نے کہا۔

"بیٹے مجھے ڈر ہے کہ تم دیکھتے ہی رہ جاؤ گے اور پیٹو منٹو میں سب چٹ کر جائیں۔" آنٹی شفقت سے مسکرائیں۔

"ہاں وقار بھائی! جلدی جلدی ہاتھ پاؤں ہلائیے۔ ورنہ آپ گھاٹے میں رہیں گے۔" بینا نے لقمہ دیا۔

"ہاتھ پاؤں نہیں...... ہاتھ منہ۔"

نوید نے فوراً تصحیح کی اور ایک سموسہ اُٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔ تم ذرا سا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

چائے مجھے بنانا پڑی کیونکہ بینا میز کے دوسرے سرے پر تھی۔ چائے کا کپ تمہیں دیتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ گیا۔

"ذرا سنبھل کر۔" ویدی نے ہانک لگائی۔ "اب کہیں کسی اور کو نہ جلا دینا۔"

"ویدی کے بچے۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ایک تو میں پہلے ہی اتنی شرمندہ ہو رہی ہوں' اوپر سے تم طعنے دے دے کر مار ڈالو۔"

"میں کب تمہیں مار رہا ہوں۔ خوامخواہ ہی۔" ویدی نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔

"ویدی بھائی اسے تنگ مت کرو۔ اس نے پہلے ہی کافی اثر لیا ہوا ہے۔" بینا نے شرارت سے کہا۔

"ابھی ابھی کہہ رہی تھی کہ کاش چائے مجھ پر گر جاتی۔ بلا سے میں جل جاتی۔ وقار بھائی تو بچ جاتے۔"

اس کی بیہودگی پر میرا چہرہ جل اُٹھا۔ بے اختیار میری نظریں تمہاری طرف اُٹھیں۔ تمہاری آنکھوں میں کتنی بے پناہ حیرت تھی' مگر دیکھتے ہی دیکھتے تمہارے چہرے کے تاثرات بدل گئے' اور تم نے اس قدر نفرت اور حقارت سے مجھے دیکھا کہ میں اپنی نظروں میں گر سی گئی۔ خدایا...... کیا سمجھا ہو گا تم نے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"کیا واقعی یہ نیل کہہ رہی تھی۔ یہ خود غرض لڑکی۔" نوید میری طرف دیکھ کر ہنسا۔

"اور نہیں تو کیا......" بینا نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ "نیل سے پوچھ لو خود ہی۔"

"کیوں نیل......؟" نوید کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھی۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور میری حالت یہ کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ پانی پانی ہوئی جا رہی تھی‘ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔

’’چچ چچ......‘‘ نوید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ’’تو نوبت بہ اینجا رسید۔‘‘

اس نے بظاہر سرگوشی کی‘ مگر آواز اتنی اونچی تھی کہ کمرے کے باہر کوئی ہوتا تو وہ بھی سن لیتا۔ کمبخت کو آنٹی کا بھی کوئی لحاظ نہ تھا۔ یوں بھی وہ بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آتا بک دیتا تھا۔ میں مارے غصے کے کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی‘ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی تم ایک دم بول پڑے۔

’’یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ جسے آپ اتنی اہمیت دے رہی ہیں۔‘‘ میں نے چونک کر تمہیں دیکھا۔ تم کپ پر جھکے ہوئے تھے‘ اور تمہارے چہرے پر ناگوار سے تاثرات تھے۔ پتا نہیں تمہارا اشارہ کس بات کی طرف تھا‘ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔

’’کون سی بات؟‘‘ بینا نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

’’یہی کپ کا ہاتھ سے چھوٹ جانا۔‘‘ تمہارا لہجہ انتہائی خشک تھا۔ ’’یہ کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں کہ جس پر بحث کی جائے۔ ایسا اتفاق ہی ہو جاتا ہے۔‘‘

پھر تمہارا لہجہ بدل گیا۔

’’میرا مطلب ہے کہ آپ خوانخواہ انہیں شرمندہ کر رہے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بات پر۔‘‘

تمہارے لہجے کی نرمی میں بھی ہلکی سی کرختگی تھی‘ جسے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ جانے کیوں مجھے شوگر کوٹیڈ گولیوں کا خیال آ گیا‘ جو اوپر سے میٹھی مگر اندر سے کڑوی ہوتی ہیں۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم نے یہ نرم الفاظ کتنی مشکلوں سے اپنے منہ سے نکالے ہیں‘ مگر میری شرمندگی کے خیال [illegible] نہیں‘ بلکہ محض مروتاً یا پھر نوید کی خاطر۔

[illegible] موڈ بھانپ کر فوراً موضوع بدل دیا۔ میں آنٹی [illegible] نے [illegible] [illegible] زبردست عادی تھیں [illegible] کو اس [illegible] تک نہ لگائی تھی۔ [illegible] گلوریاں بنا کر ملازمہ کے ہاتھ اندر [illegible] تمہارا سامنا کرنے [illegible] نہ تھی۔ میں چپکے سے واپس جانے لگی‘ مگر اسی وقت آنٹی [illegible] کسی کام سے باہر نکلی تھیں‘ مجھے دیکھ لیا۔

’’کہاں جا رہی ہو بیٹی......؟‘‘ انہوں نے پوچھا۔

’’جی......وہ......گھر......‘‘ میں انہیں غیر متوقع طور پر دیکھ کر گھبرا گئی۔

’’ابھی نہیں بیٹے۔ میں نے وقار کو رات کے کھانے پر روک لیا ہے۔ تم بھی مت جاؤ۔ بلکہ رات کو ادھر ہی رہ جانا۔‘‘

’’مگر آنٹی میں تو......‘‘ میں نے انکار کرنا چاہا۔

’’اگر مگر کچھ نہیں۔‘‘ انہوں نے شفقت سے میرا بازو تھام لیا۔ ’’تم نہیں جاؤ گی۔‘‘

اور میں ان کے محبت بھرے اصرار کے سامنے مجبور ہو گئی۔ سارا وقت میں اور بینا کچن میں مصروف رہیں۔

بینا اپنی رو میں بولے چلی جا رہی تھی‘ اور میرا دھیان رہ رہ کر تمہاری طرف جاتا تھا۔ تم جو اپنی تمام تر اکھڑ مزاجی اور بیزار کن شخصیت کے ساتھ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ڈرائنگ روم میں موجود تھے‘ اور مجھ سے بلاوجہ کی دشمنی پالنے پر آمادہ تھے۔ بھلا کوئی پوچھے تو کیوں‘ مگر کس کی شامت آئی تھی کہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتا۔ پھر وہیں شامی کباب بناتے بناتے میں نے ان سارے چہروں کو یاد کرنے کی کوشش کی‘ جو کبھی میری شرارتوں کا شکار ہوئے تھے۔ یا جن کے ساتھ میں نے کبھی کوئی زیادتی کی تھی‘ حالانکہ وہ ساری شرارتیں معصوم اور بے ضرر تھیں۔

مگر تم جیسے منتقم مزاج شخص سے کیا بعید تھا کہ تم کسی بے ضرر سی شرارت کو عمر بھر کی نفرت کی بنیاد نہ بنا ڈالتے‘ مگر ماضی کی راہوں پر مجھے کہیں بھی تمہارا پرتو نظر نہ آیا۔ ہاں یہ یقینی بات تھی کہ تم میرے لئے مکمل اجنبی تھے۔ اس دن نوید کی سالگرہ سے پہلے میں نے تمہیں کہیں نہیں دیکھا تھا۔ بس پھر یا تو تمہارا دماغ خراب تھا‘ یا میرے ذہن میں ہی کچھ فتور آ گیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے کہ تمہاری آنکھیں ویسے ہی شعلے اگلتی ہوں۔ پھر بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہاری نفرت پر ریسرچ کرتی پھروں‘ بھئی قطعاً یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے‘ تم جانو تمہارا کام‘ میں نے قطعی انداز میں سوچا اور مطمئن سی ہو گئی۔

کھانے کی میز پر تمہیں نظر انداز کیے بینا اور ویدی کی دلچسپ نوک جھوک سے محظوظ ہوتی رہی۔ مگر تم کون سا میری طرف متوجہ تھے۔ تمہاری ساری توجہ آنٹی‘ بینا تمہیں بھی بخش نہیں رہی تھی۔ ویدی کے ساتھ ساتھ وہ تمہیں بھی تختہ مشق بنائے ہوئے تھی‘ مگر تم برا مانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بجائے ہولے سے مسکرا دیتے' اور انتہائی مہذب انداز میں اتنا برجستہ جواب دیتے کہ بینا کو جھینپ کر خاموش ہو جانا پڑتا۔ انتہائی گھریلو قسم کی بے تکلف فضا تھی۔ اور میں اس ماحول میں انتہائی تکلف سے بڑی لیے دیے انداز میں بیٹھی تھی۔ گویا وہ سارے لوگ میرے لئے اجنبی ہوں' اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے تھا۔

بیچ بیچ میں ویدی مجھے بھی مخاطب کر لیتا' اور اپنی فطری ذہانت اور شوخی سے کام لیتے ہوئے میں خود ہی اسے جواب دیتی کہ کہیں وہ میری خاموشی کو محسوس نہ کرے' مگر خیر گزری' کسی نے میری خاموشی پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ پانی لیتے ہوئے میں نے چپکے سے تمہیں دیکھا' تم مسکرا رہے تھے' مگر مسکراہٹ تمہارے ہونٹوں پر کتنی اجنبی تھی۔ دھوپ کی اس کرن کی طرح' جو گنجان بادلوں سے سہم سہم کر جھانکتی ہے۔

بینا نے شامی کباب تمہاری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وقار بھائی...... آپ تو کچھ بھی نہیں لے رہے۔ یہ شامی کباب لیجئے نا۔ نیل نے بنائے ہیں۔ بڑے مزے کے بناتی ہے۔"

"نہیں بس...... میں بہت کھا چکا۔"

تم نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ تمہارے لہجے میں وہ مخصوص سی تلخی گھل گئی' جو تمہاری شخصیت کا خاصا تھی' یا پھر شاید یہ محض میرا احساس تھا۔ کیا میرے نام کا اعجاز ہے میں نے سوچا۔

"کیوں وقار بیٹے۔ تم اب بھی تکلف سے کام لے رہے ہو۔" آنٹی نے بے حد شفقت سے کہا۔

"ارے نہیں مما جانی میں تو......" تم کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ تمہیں شاید اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

"آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟"

تم نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"یوں ہی بے ساختگی میں منہ سے' مما جانی نکل گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"ارے نہیں بیٹے' ایسی کون سی بات ہے۔" آنٹی ہنس پڑیں۔ "تم بھی تو میرے بیٹے ہی ہو۔"

تم تھوڑی دیر چپ چاپ اپنے سامنے دیکھتے رہے۔

"اس گھر میں آ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے' جیسے میں اپنوں میں ہوں۔" تم نے دھیرے دھیرے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"آج ایک مدت کے بعد مجھے اتنی خوشی نصیب ہوئی ہے۔ یہ گھریلو ماحول ملا ہے' ورنہ ہر جگہ بناوٹ' ہر جگہ تکلف' کہیں بھی تو خلوص نہیں' اپنائیت نہیں' بس تصنع ہی تصنع۔" تم نے ایک لمبی سانس لی' اور پھر آنٹی کی طرف جھکے۔

"آپ جانتی ہیں میں آپ سے یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں۔ جب کہ میں بہت کم گو' بہت خاموش طبع ہوں۔ دراصل میں نے آپ کے انداز' آپ کے لب و لہجے میں اس چیز کو پایا ہے' جسے لوگ ممتا کہتے ہیں۔ کہیں میں غلط تو محسوس نہیں کر رہا۔"

تم نے ملتجی نظروں سے آنٹی کی طرف دیکھا۔ میں خاموشی سے تمہیں دیکھتی رہی۔ اس وقت تمہارے چہرے کے تاثرات ایسے ہو رہے تھے' جیسے تم نے کوئی کھوئی ہوئی چیز اچانک پا لی ہو' مگر تذبذب سا ہو کہ آیا یہ چیز واقعی تمہاری ہے' یا کسی اور کی۔ تم اس بچے کی طرح لگ رہے تھے' جو بھرے ہجوم میں کھو گیا ہو' اور ہر اس عورت کے پیچھے دوڑنے لگتا ہو' جس میں اسے اپنی ماں کی شباہت نظر آئے۔ مجھے تم پر ایک دم ڈھیر سارا ترس آ گیا۔

تم جو دولت مند ہونے کے باوجود اتنے قلاش تھے۔ میری ممتا اس ننھے بچے کے لئے ابل پڑی۔ جو تنہا تھا' اکیلا تھا' اور ڈر رہا تھا۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ اے کاش میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔ اے کاش! میرا جی چاہا کہ میں ان ساری محبتوں کو کھوج لوں' جو تم سے چھن گئی تھیں' اور جنہوں نے تم سے اپنا آپ چھین لیا تھا' اور وہ ساری محبتیں لا کر تمہاری جھولی میں ڈال دوں' اور تم سے کہوں...... یہ لو اپنا کھویا ہوا سرمایہ...... اب اسے خوب سنبھال سنبھال کر رکھنا اور پھر اونچے اونچے پہاڑوں پر منجمد برف کو پگھلتا ہوا اور ننھے ننھے شگوفوں کو مسکراتا ہوا اور دھوپ کی پہلی کرن کو بکھرتا ہوا دیکھوں۔

تب ہی آنٹی نے بڑھ کر تمہاری پیشانی چوم لی۔

"بیٹے! مجھے بھی لگ رہا ہے' جیسے تم میرے اپنے بیٹے ہو۔ جیسے میرے ایک نہیں دو بیٹے ہوں۔"

"آپ مجھے بالکل مما جانی کی طرح لگی تھیں۔ وہی شفیق انداز' وہی اُمڈتی ہوئی ممتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے بعد تو میں اس لہجے کے لئے ترس گیا' وہ زندہ ہوتیں تو میں آپ کو ان سے ملاتا۔'' تمہارے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

''بیٹے...... مجھے اپنی ماں ہی سمجھو۔''

آنٹی نے محبت سے کہا۔

''تو......تو کیا میں آپ کو مما جانی کہہ سکتا ہوں۔''

''تم نے آنٹی کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے جھک کر پوچھا۔ اس وقت تمہارے انداز میں کس قدر معصومیت تھی۔

''ضرور بیٹے ضرور۔'' آنٹی نے ایک بار پھر تمہاری پیشانی چوم لی۔

''وہ تمہاری جذباتی حالت سے بہت متاثر ہو رہی تھیں۔ تم نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے آنٹی کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔

''اگر یہ خواب ہے تو میں اس خواب سے جاگنا پسند نہیں کروں گا۔'' تم ہولے سے بڑبڑائے۔

اس وقت تمہاری کیفیت کتنی عجیب ہو رہی تھی۔ کسی سحر زدہ انسان کی طرح تم اپنے آپ میں نہ تھے۔ یوں لگتا تھا کسی وقتی تاثر سے تم اپنی شخصیت گم کر بیٹھے ہو اور یہ تم نہیں ہو کوئی اور ہے' جو تمہارے بھیس میں بیٹھا ہے۔ اس وقت تمہارے چہرے کی کرختگی میں عجیب قسم کی نرمی گھل گئی تھی' اور تم اس قدر مختلف لگ رہے تھے کہ حد نہیں۔ یوں جیسے کسی نے ہپناٹائز کر کے تمہیں' تمہاری شخصیت اور تمہارے کردار کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہو۔ یا شاید تم اس خول سے باہر نکل آئے تھے' جو تم نے خود اپنے گرد بنا رکھا تھا۔

''ارے وقار بھائی! امی نے آپ کو بیٹا بنا لیا ہے۔''

بینا نے خوش ہو کر کہا۔

''اس لحاظ سے آپ میرے بھائی ہوئے ہے نا۔ کتنے مزے کی بات ہے۔ اب نوید بھیا جھگڑے تو مجھے انہیں منانا نہیں پڑے گا۔''

''ارے جا جا...... تو کب میری بہن ہے تجھے تو ممی نے کوڑے کے ڈھیرے اُٹھایا تھا۔'' نوید نے چڑایا۔

''اور آپ کو کون بھائی بناتا ہے' جیسی کہیں کے' میرے بھیا تو وقار بھائی ہیں' کیوں

وقار بھائی!''

بینا نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے تمہاری طرف دیکھا۔ دونوں کی نوک جھوک سے تمہیں اس جذباتی کیفیت سے نکلنے میں مدد مل گئی' اور میں نے دیکھا تم اس گہری دھند سے باہر نکل آئے ہو' جس میں اچانک پھنس گئے تھے۔

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں گڑیا۔ میں تمہارا بھائی ہی تو ہوں۔''

تم نے اس قدر محبت سے کہا' جیسے تمہارا وجود ہی محبت کے خمیر سے اٹھایا گیا ہو۔ جیسے نفرتوں سے تمہارا دور کا بھی واسطہ نہ ہو' اور تمہاری آنکھیں کس قدر محبت سے لبریز تھیں' جیسے ان میں کوئی نفرت بھرا جذبہ سما ہی نہیں سکتا۔

اُس رات میں پھر دیر تک تمہارے متعلق سوچتی رہی۔ تمہاری باتیں رہ رہ کر میرے کانوں میں گونجتیں' اور تمہاری صورت نگاہوں میں جھلملاتی...... تم جو اوپر سے بھوری چٹانوں کی طرح سخت اور کھردرے تھے' اندر سے کتنے نرم اور حساس تھے۔ پھر تم اچانک برسوں کے بنائے ہوئے اس خول سے باہر کیسے آ گئے...... مجھے حیرت تھی۔

تم تو انتہائی اَن سوشل قسم کے آدمی ہو' ساری دنیا سے کٹے ہوئے۔ اور لوگ تمہیں آئرن مین کہتے ہیں۔ پھر میں تمہاری شخصیت کے اس روپ کو کیا سمجھوں۔ تم تو اتنے آدم بیزار ہو' ان لوگوں میں گھل مل کیسے گئے۔ میں نے بے حد حیران ہو کر سوچا۔ تب تمہارے متعلق سوچتے سوچتے مجھے ایک ایسا تکلیف دہ خیال آیا کہ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔

اگر تم اَن سوشل نہیں ہو' اور لوگ محض جھوٹ بکتے ہیں' تو پھر تم نے اس سارے وقت مجھے کیوں نظر انداز کیے رکھا۔ تم سارا وقت بینا' نوید اور آنٹی سے باتیں کرتے رہے۔ اور مجھ سے ایک بات بھی نہ کی۔ کیا میں ایسی ہی نظر انداز کر دینے والی چیز ہوں۔ میرے ساتھ تمہارا یہ رویہ کیا معنی رکھتا ہے۔

درد کی ایک مدھم سی لہر میرے دل سے اُٹھی' اور معدوم ہو گئی۔ تم میرے اتنے قریب تو نہ تھے کہ تمہاری بے توجہی مجھے پریشان کر ڈالتی۔ پھر تم جیسے بھی تھے' جو کچھ بھی تھے' اپنے لئے تھے۔ مجھے تمہارے متعلق سوچنے کا کیا حق حاصل تھا۔

میں تمہاری توجہ کے لئے مری نہ جا رہی تھی۔ یہ تو بس یوں ہی' جانے کیسے تم میری سوچوں میں در آئے تھے۔ اصل میں یہ سوچ کی بیماری ہے ہی بہت بری۔ کیا اُلٹے سیدھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خیالات آتے ہیں۔ اگر کوئی ان سوچوں کا ریکارڈ رکھنے لگے تو...... توبہ...... کیسی پاگل سوچ ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

آخر اِن بے تکے خیالات کی کوئی حد بھی ہے کہ نہیں۔ اور لوگ جھوٹ نہیں کہتے تم سچ مچ انتہائی اُجڈ اور جنگلی ہو' اور بالکل بھی نارمل نہیں۔ اور تہذیب تو تمہیں بالکل بھی چھو کر نہیں گزری' اور یہ کہ خیالات کی اس عجیب و غریب دھما چوکڑی کے باوجود مجھے اپنی نیند بہت عزیز ہے' اور کسی لینڈ لارڈ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اتنی رات گئے میرے خیالوں میں اودھم مچائے۔ میں نے ان اودھم مچاتی سوچوں کو ڈپٹ ڈپٹ کر کونوں کھدروں میں پھینکا اور اطمینان سے سو گئی۔

✸✦✸

تمہاری حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ آنٹی تم پر جان نچھاور کرتیں۔ بینا تمہارا نام لے لے کر جیتی' اور رہاں نوید تو اس کا خلوص تو یوں بھی ہر ایرے غیرے کے لئے چھوٹا پڑتا تھا' تم تو پھر بھی اس کے دوست تھے۔ میرے ساتھ تمہارا رویہ بہت عجیب تھا۔ شروع شروع میں تم مجھ سے بہت کھنچے کھنچے رہتے۔ پھر شاید تمہیں اندازہ ہو گیا کہ مجھے اس گھر میں بینا اور نوید جتنی اہمیت حاصل ہے' اور میں وہاں بہت دخیل ہوں۔ تو تمہارے رویے میں تھوڑی سی نرمی آ گئی' اور تم رسمی طور پر مجھ سے ایک آدھ بات کر لیتے۔ یعنی اب تم پہلے کی طرح مجھے قطعاً نظر انداز کرنے کے بجائے' ہاؤ ڈو یو ڈو جیسا ایک آدھ جملہ میری طرف اچھال دیتے۔ یا اگر تمہیں آنٹی یا بینا وغیرہ نظر نہ آتیں تو تم اِن کے متعلق پوچھ لیتے' اور بس......

ہماری گفتگو کبھی ایک یا دو جملوں سے زیادہ نہ بڑھی۔ تاہم اتنا تھا کہ تم نے نہ بولنے کی قسم توڑ دی تھی' اور یہ بات میں نے بطورِ خاص نوٹ کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت تمہاری یہ کوشش ہوتی کہ تمہاری نظریں مجھ پر نہ پڑیں۔ دیوار کی طرف تکتے ہوئے یا پھولدان کو گھورتے ہوئے یا کسی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے تم بے حد آہستگی سے پوچھتے۔

''آپ کیسی ہیں شہنیلا......؟''

یوں جیسے تم مجھ سے نہیں پھولدان میں لگے ہوئے پھولوں سے سرگوشی کر رہے ہو۔ یا کسی ماورائی مخلوق سے مخاطب ہو۔ اور پھر مجھ سے یوں لاتعلق ہو جاتے' جیسے وہ جملہ بھی بھولے سے تمہارے ہونٹوں سے پھسل پڑا ہو۔ اگر کبھی اتفاقیہ تمہاری نظر مجھ پر پڑ جاتی تو تمہارے چہرے کے نقوش ایک دم سخت پڑ جاتے' اور آنکھوں میں نفرت سلگنے لگتی۔ وہی انجانی سی نفرت' جو میں نے پہلے دن تمہاری آنکھوں میں بھڑکتے دیکھی تھی۔ اور جس کے متعلق میں سوچ سوچ کر تھک چکی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوید کے ہاں تمہاری بے تحاشا آمدورفت سے مجھے بہت اُلجھن ہوتی' اور ایسی عجیب و غریب چویشن میں بھلا اُلجھن کیوں نہ ہوتی۔ میں حتی الامکان یہی کوشش کرتی کہ میرا تم سے سامنا نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ نوید مجھے زبردستی کھینچ لاتا' اور میں بے بس ہو جاتی۔ اگر نوید وغیرہ سے میرا اتنا قریبی دلی تعلق نہ ہوتا تو میں ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دیتی۔

مگر یہاں تو اس قدر قربت تھی کہ میں نے کبھی ان کے اور اپنے گھر میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا تھا' بلکہ وقار کی آمد سے پہلے تو تقریباً سارا سارا دن میں اُدھر ہی گھسی رہتی تھی' اور رات گئے کہیں گھر واپس ہوتی تھی۔ مگر اب تمہارے سامنے کسی فالتو پرزے کی طرح پڑے رہنا مجھے کس قدر ناپسند تھا' اور پھر اس احساسِ توہین کو مسلسل برداشت کیے جانا کہ تم ایک انتہائی ناپسندیدہ ہستی کی صورت میں اس شخص کے سامنے موجود ہو' کچھ دل گردے کا کام تھا کہ نہیں...... اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس خیال سے عہدہ برآ ہونا پڑتا۔

✱✦✱

''نیل پیاری...... ایک بات تو بتاؤ۔''

بینا نے تیزی سے چلغوزے چھیلتے ہوئے کہا۔

اس وقت میں قالین پر اوندھی لیٹی ٹیپ ریکارڈر پر پرانے گیت سن رہی تھی' اور وہ اپنے اردگرد تصویروں کے البم پھیلائے بیٹھی تھی۔

''کیا......؟'' میں نے ٹیپ سے کیسٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وقار بھائی کا رویہ تمہارے ساتھ بڑا عجیب سا ہے۔ یعنی کہ تم محفل میں موجود ہو' اور وہ ہیں کہ تمہیں نظرانداز کیے جا رہے ہیں۔ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''ضرور ہوگی......'' میں نے لاپروائی سے کہا' اور ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھینچ لی۔

''تو پھر بتاؤ نا کیا وجہ ہے......؟'' اس نے تصویروں کے البم ایک طرف ہٹا دیئے۔

''یہ تو تم اپنے وقار بھائی سے پوچھنا۔'' میں اطمینان سے چلغوزے چھیلتی رہی۔

''ہوں...... یعنی کوئی بات ہے ضرور...... کیوں......؟'' اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

''بات......'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''اس بات پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے۔''

''اچھا تو اب تمہیں شعر بھی یاد آنے لگے۔'' اس نے چٹکی لی۔ ''گویا معاملہ واقعی نازک ہے۔ ذرا سنا تو وہ شعر۔''

''بے حد حسب حال شعر ہے۔'' میں نے محظوظ ہو کر کہا۔

''سنو......''

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے ان کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

''خوب بھئی بہت خوب......'' بینا نے تالی بجا کر داد دی۔

''بہت خوبصورت شعر ہے۔ ذرا پھر تو پڑھو۔'' میں نے شعر دہرایا۔

''ان کے یعنی وقار بھائی کے......'' بینا نے شرارت سے مجھے گھورا۔ ''تو اب وہ ''اُن'' بھی ہو گئے۔''

''بکو نہیں......'' میں نے جھینپ کر کہا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اس بلاوجہ کی دشمنی کا سبب معلوم نہیں۔''

''سوچنے کا مقام ہے' کوئی بلاوجہ تو دشمن نہیں بنتا۔'' بینا نے سوچ میں ڈوب کر کہا۔

''ارے ہاں...... کہیں یہ وہی بات تو سچ ثابت نہیں ہو رہی کہ محبت اور نفرت درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ دونوں بالکل الگ الگ جذبے ہیں' ایک دوسرے کے متضاد جذبے' پر تمہارے یہ وقار بھائی اتنے لطیف احساسات کے مالک نہیں لگتے البتہ ایک اور بات ہو سکتی ہے۔''

''بھلا کیا......؟'' بینا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارے یہ وقار بھائی انتہائی درجے کے منتقم مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اُس دن' جو میرے ہاتھ سے چائے کا کپ اُن کے پاؤں پر گر گیا تھا۔ تو انہوں نے یہ بات اپنے دل میں رکھ لی۔ حالانکہ وہ محض اتفاق تھا۔'' میں نے مزے لے کر کہا۔

''نہیں نیل...... وقار بھائی اتنے کم ظرف نہیں کہ ایسی چھوٹی سی بات کو اتنا مائنڈ کریں۔ شاید......'' وہ کہتے کہتے چونک پڑی۔

''اوہ وقار بھائی......'' اس نے میرے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے مڑ کر دیکھا' تم دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے میرے قریب آ گئے۔ تمہارا چہرہ ہمیشہ کی طرح سخت اور سنجیدہ تھا۔ تم بینا سے باتیں کرنے لگے۔ نوید اس وقت گھر پر نہیں تھا' اور آنٹی غالباً کچن میں تھیں۔

"بینا...... ذرا ایک گلاس پانی تو پلاؤ۔" تم نے اچانک کہا۔

"ابھی لائی......" بینا اُٹھ کر چلی گئی۔

"آپ ابھی بینا سے کیا کہہ رہی تھیں۔" تم نے میز پر بازو پھیلاتے ہوئے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ "یہی نا کہ میں منتقم مزاج ہوں۔"

"جی......" میں نے چونک کر تمہاری طرف دیکھا۔ تم اپنی خوبصورت آنکھوں میں بے پناہ نفرت لیے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں......" میں نے سنبھل کر کہا۔ "آپ کے رویے کی اور کوئی توجیح......"

"تو پھر سن لیجئے میں واقعی منتقم مزاج ہوں۔" تم نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ "اور اگر کوئی میرے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کرے تو اسے ایک ٹھوکر سے ہٹا دیتا ہوں۔"

"آپ بے شک ایسا کر سکتے ہیں۔" میں نے تمہارے سخت لہجے کا کوئی نوٹس نہ لیتے ہوئے اطمینان سے کہا جیسے' ہمارے درمیان بڑے دوستانہ انداز میں گفتگو ہو رہی ہو۔

"لیکن اوّل تو میں آپ کے راستے میں حائل نہیں...... اور اگر ایسا ہو بھی تو میں کوئی ایسا پتھر نہیں ہوں' جسے ٹھوکر لگاتے ہوئے آپ کے پاؤں زخمی ہوں...... باقی جہاں تک آپ کی منتقم مزاجی کا تعلق ہے' آپ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ چائے کا ایک کپ میرے پاؤں پر گرا دیں۔ اس سے زیادہ تو میں نے آپ کا کچھ بگاڑا نہیں۔" میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"آپ بینا کو بہکا رہی تھیں...... اور یہ کوئی مذاق نہیں۔" تمہارا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا۔

"بینا بچی نہیں ہے' اور میں محض اپنی رائے ظاہر کر رہی تھی۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو میرے متعلق اس سے بھی میری رائے رکھ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"آپ سمجھتی ہیں۔" تم نے کچھ کہنا چاہا' مگر اُسی وقت بینا آ گئی اور تم ہونٹ بھینچ کر رہ

گئے۔ پانی کا گلاس تم نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ لیکن تمہارا غصہ شاید ابھی کم نہ ہوا تھا۔ میرا تو جی چاہا کہ بینا سے ایک گلاس اور پانی لانے کے لئے کہوں' مگر تمہارے تیور دیکھ کر حوصلہ نہ ہوا۔

"کیا بات ہے وقار بھائی! آپ کا موڈ کچھ ٹھیک نظر نہیں آ رہا۔"

بینا نے تمہیں غصے میں دیکھ کر پوچھا۔

"گویا موڈ نہ ہوا حساب کا سوال ہو گیا' جو غلط بھی ہو سکتا ہے اور ٹھیک بھی۔"

نوید نے پردے کے بیچ میں سے سر نکالتے ہوئے دخل اندازی کی۔ اس کی بروقت آمد نے ماحول کے تکدر کو بہت حد تک دور کر دیا۔ تمہاری پیشانی کے بل بھی آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ میں نے چپکے سے کھسک جانا چاہا' مگر ویدی نے مجھے دیکھ لیا اور پکڑ کر زبردستی بٹھا لیا۔

"ارے ہاں وقار بھائی...... ابھی ابھی آپ کے آنے سے پہلے نیل کو ایک شعر یاد آ رہا تھا۔" چائے میں چینی ملاتے ملاتے اُسے ایکدم یاد آیا۔

"شعر......" ویدی نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ہاں......" بینا معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "بھلا سا شعر تھا۔ ہاں یاد آیا۔

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے ان کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہو گئی

وہ لہک لہک کر گانے لگی۔

میں بری طرح جھینپ گئی۔ اس بینا کی بچی کو بھی اس وقت شعر یاد آیا تھا۔ اسے بھلا کیا پتا کہ ابھی ابھی کیا معرکہ ہو چکا ہے۔ تیسری جنگِ عظیم چھڑنے میں بس ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ شعر سن کر خدا جانے تم نے کیا سوچا ہوگا۔

"چچ چچ......" نوید نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "بھائی وہ کون غارت گر دین و ایمان ہے جو اپنی بے بی سے ناراض ہو گیا۔ کہو تو اسے گردن سے پکڑ لاؤں تمہارے حضور۔"

وہ ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے بولے جا رہا تھا' اور تمہارے دل پر اللہ جانے کیا بیت رہی تھی۔

"تو پھر لاؤ اپنی گردن...... اور جھکا دو میرے حضور میں۔" میں نے چڑ کر اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ارے واہ...... میری گردن کوئی فالتو ہے۔" اس نے سر پیچھے کھینچ کر کہا۔

"ویسے نیل...... یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ اپنا علاج کرواؤ ورنہ سڑکوں پر فلمی ہیروئن کی طرح گاتی پھرو گی۔ رُوٹھ گھیو رے بلم ہرجائی...... میں تو مر گئی مر گئی مر گئی رے......"

نوید نے باریک آواز بناتے ہوئے جھوم جھوم کر کہا۔ غصے کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔ کمبخت کا انداز ہی ایسا تمسخرانہ تھا۔ آواز میں نسوانی لچک پیدا کرنے کی کوشش میں اس کی آواز کہیں سے موٹی، کہیں سے باریک ہوئی جا رہی تھی۔

"تم ایسی باتیں کہاں سے سیکھتے ہو؟" بینا نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تین سال سے یونیورسٹی میں کوئی بھاڑ تو نہیں جھونک رہا۔" اس نے سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔

"تو یہی باتیں سیکھنے کے لئے یونیورسٹی جاتے ہو۔" وقار نے مسکرا کر پوچھا۔

"اور کیا آج کل بیک وقت گانے اور رونے کی مشق کر رہا ہوں۔ پھر دیکھو کتنا بڑا ہیرو بنتا ہوں۔"

"منہ دیکھا ہے کبھی آئینے میں......" میں نے چڑایا۔

"کئی بار دیکھا ہے۔" اس نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔ جیسے کوئی بہت بڑا کام سرانجام دیا ہو۔ "سچ کہو اتنا سویٹ، اتنا چارمنگ ہیرو ہے کوئی پوری فلمی دنیا میں۔"

"کوئی نہیں۔" میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

"مجھے دیکھ کر تو یہ سب ہیروز زبردست قسم کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

"اور کیا......" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "تمہارے سامنے بھلا ان کا چراغ جل سکتا ہے؟"

"پتا ہے پچھلے دنوں سارے بڑے بڑے ہیروز وفد کی صورت میں میرے پاس آئے۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "بھائی کیوں ہماری روزی پر لات مارتے ہو، فلمی دنیا میں آ کر۔" وہ حسبِ معمول بے پر کی ہانک رہا تھا۔

"اور پھر تمہاری آنکھ کھل گئی۔" میں نے جلدی سے لقمہ دیا۔

"کیا...... کیا...... یعنی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

اس نے گھونسا تانا، مگر اس کا گھونسا تنا رہ گیا، کیونکہ اسی وقت آنٹی آ گئیں۔ جب تم اور ویدی ان کی طرف متوجہ ہوئے تو میں چپکے سے باہر نکل آئی، اور پھر اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا۔

"اللہ...... اس شخص کو تو خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے مجھ سے۔" میں نے تمہارے رویے پر غور کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ بھلا کوئی اتنی معمولی سی بات پر بھی یوں اُلجھ پڑتا ہے۔ اگر میں نے تمہیں منتقم مزاج کہہ دیا تھا، تو کون سی قیامت آ گئی تھی۔ کس قدر دھونس دے رہے تھے تم۔ گویا میں تمہاری زرخرید ہوں، اور مجھے بھلا اتنی انکساری برتنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، اور تمہیں حق کیا پہنچتا تھا، ایسی باتیں کہنے کا۔ نوید کی وجہ سے میں تھوڑا سا لحاظ کر گئی ورنہ خوب جواب دیتی۔ کس قدر تلملا رہے تھے تم۔ میں نے جی ہی جی میں محظوظ ہو کر سوچا، اور پھر گھنٹوں تمہاری اور اپنی گفتگو یاد کر کے خوش ہوتی رہی۔

اس دن نوید، میں اور بینا سر جوڑے کالج میں ہونے والے ہنگاموں کے متعلق زور شور سے بحث کر رہے تھے کہ تم آ گئے۔ تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ میں نے اُٹھنا چاہا۔ مگر نوید نے جھک کر میرا بازو تھام لیا۔

"مجھے پتا ہے اب تم اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرو گی۔" اس نے زور سے کہا۔

"وہ ویدی بھائی...... مجھے بڑا ضروری کام ہے۔" میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"چپکی بیٹھی رہو۔ ورنہ میں وقار سے یہ پوچھ بیٹھوں گا کہ تم سے اس کا کون سا ایسا رشتہ قائم ہو گیا ہے کہ تم پردہ کرنے لگی ہو۔" اس نے انتہائی بدتمیزی سے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"بکو مت......" میں سرخ پڑ گئی۔

"تو پھر آزما کر دیکھ لو۔" اس نے مجھے چیلنج کرنے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن میں نے اُٹھنے کی کوشش نہ کی، اور نفی میں سر ہلا دیا، کیونکہ وہ ایسا ہی منہ پھٹ تھا کہ اس سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔ نوید نے ہنستے ہوئے میرا بازو چھوڑ دیا۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ تمہاری سیاہ آنکھوں میں نفرت یوں تیر رہی تھی، جیسے گہرے پانیوں میں ڈوبتا ہوا تاریک بجرہ جس کی ساری روشنیاں گل ہوں، اور جو بس اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو۔ مگر بظاہر تم نے بڑے اخلاق سے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

’’کہیے مزاج شریف......‘‘

’’فائن......‘‘ میں نے رسمی سا جواب دیا۔ اور تم نوید و بینا سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نوید نے ٹرانزسٹر پوری آواز سے کھول رکھا تھا‘ اور گانے کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ میں نے ٹرانزسٹر کی آواز مدھم کر دی‘ اور وہیں بیٹھ کر گھٹنوں پر کریسٹ ویکلی کا نیا پرچہ رکھ لیا۔ میں پوری طرح تم سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں‘ میرا کوئی خاص دھیان نہیں تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کسی بات پر بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ نوید بڑے جوش میں تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر اور میز پر مکے مار مار کر تم کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’کیوں خوامخواہ اپنی انرجی ضائع کر رہے ہو۔‘‘ تم نے ہنس کر کہا۔ ’’اس طرح تو میں قائل ہونے سے رہا۔‘‘

میں نے چپکے سے تمہیں دیکھا۔ وہ ازلی بیزاری جو تمہارے چہرے کا نمایا جزو تھی جانے کس کونے کھدرے میں جا چھپی تھی۔ تمہارے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ تھی‘ اور آنکھوں میں زندگی کی چمک۔

شاید تم اپنے آپ میں لوٹ رہے ہو۔ میں نے سوچا۔ تم جو گھریلو ماحول کو ترسے ہوئے تھے۔ تمہیں ایسے ہی پُرخلوص اور ہمدرد لوگوں کی ضرورت تھی۔

’’اگر میرے دلائل کے زور سے یہ میز ٹوٹ جائے‘ تو پھر تو تم قائل ہو جاؤ گے نا کہ محبت بہت بڑی طاقت ہے۔‘‘ نوید نے میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے انتہائی بونگے پن سے کہا۔

’’دیکھو نوید......‘‘ تم سنجیدہ ہو گئے۔ ’’میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں۔ یہ محبت وحبت کا فلسفہ بالکل بیکار ہے۔‘‘

’’کسی عقلمند آدمی نے کہا ہے کہ زندگی محبت کرنے کے لئے بہت کم ہے۔‘‘

’’مگر بغیر کسی غرض کے تم سے کوئی بھی محبت نہیں کرے گا۔ یہ وہ کھوٹا سکہ ہے‘ جو دنیا کے کسی بازار میں بھنایا نہیں جا سکتا۔‘‘

’’تو یہ لیلیٰ مجنوں‘ ہیر رانجھا‘ شیریں فرہاد وغیرہ کی داستانیں ہیں‘ یہ لوگ جو محبت میں مر کر امر ہو گئے تو کیا یہ......‘‘ نوید نے کچھ کہنا چاہا۔

’’یہ محض داستانیں ہیں‘ اور ایسی باتیں قصے کہانیوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔‘‘ تم نے اس کی بات کاٹ دی۔

’’تو تمہیں کسی جذبے کی سچائی پر یقین نہیں۔ گویا دنیا کے سارے جذبے‘ ساری محبتیں جھوٹی ہیں۔‘‘

’’ہاں......‘‘ تم نے قطعی انداز میں کہا۔ ’’دنیا کے سارے جذبے جھوٹے ہیں‘ ماسوا ایک کے...... اور وہ ہے ممتا کا جذبہ‘ ماں ہمیشہ تم سے بے لوث پیار کرے گی‘ بغیر کسی غرض کے‘ بغیر کسی لالچ کے...... سورج کی طرح سچی اور آسمان کی طرح پائیدار محبت...... باقی سب جھوٹ ہے‘ فریبِ نظر ہے۔‘‘

’’اور انسانی ہمدردی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘ نوید نے پوچھا۔

’’اچھی چیز ہے۔‘‘ تم طنز سے مسکرائے۔ ’’مگر صرف تحریروں اور تقریروں میں نظر آتی ہے۔ لوگ اسے ڈھال بنا کر اپنے گھناؤنے کردار کو چھپاتے ہیں۔ یہ لیڈرز‘ ادیب‘ سیاستدان سب گفتار کے غازی ہیں‘ کردار کے نہیں۔‘‘

’’میں ایسا نہیں سمجھتا......‘‘ نوید نے اختلاف کیا۔ ’’دنیا بڑی بڑی مثالوں سے بھری پڑی ہے‘ بلکہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو انسانی ہمدردی پر ہی دنیا قائم ہے۔‘‘

’’اچھا پھر ایک مثال ہی بتا دو۔ کیا تم نے انسانی ہمدردی کا کوئی عملی مظاہرہ کبھی دیکھا ہے۔ ایسی ہمدردی جو خلوص نیت پر مبنی ہو۔ جس کا مقصد نمائش نہ ہو۔ جو بے غرض ہو۔‘‘ تم نے کہا۔

’’آ ہم ......‘‘ نوید کچھ سوچنے لگا۔ اُسی وقت اس کی نظر مجھ پر پڑی‘ تو وہ مسکرا دیا۔

’’ہاں انسانی ہمدردی کی ایک مثال تو اس وقت میرے سامنے ہے۔‘‘

وہ چہکا۔ اُسے شاید کوئی شرارت سوجھ رہی تھی۔

’’کون سی......؟‘‘ تم نے پوچھا۔

’’یہ اپنی نیل ہے نا......‘‘ وہ میرے متعلق ہی کچھ کہنے والا تھا‘ میں اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔

’’خبردار ویدی جو آگے ایک لفظ بھی کہا تو...... مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ اپنی باتوں کے درمیان مجھے گھسیٹو......‘‘ میں نے غصے سے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"واہ تم اتنے غصے میں کیوں آ گئیں۔ میں تو صرف یہ کہنے لگا ہوں کہ میں نے سچی انسانی ہمدردی تم میں دیکھی ہے۔"

"خوب......" تم ہونٹ بھینچ کر مسکرائے۔

"کیسی ہمدردی...... بات کرنا نہ آئے تو چپ ہو جایا کرو۔ خوامخواہ بونگیاں مارتے رہتے ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کچھ اُلٹا سیدھا بک دے گا' تو خوامخواہ شرمندگی ہوگی۔ مگر وہ بھلا کب باز آنے والا تھا۔ جھٹ سے بولا۔

"ارے یہ انسانی ہمدردی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اِدھر اُدھر لوگوں میں جرسیاں بانٹتی پھرتی ہو۔ وہ سفید جرسی یاد نہیں' جو اس دن تم نے کار میں......"

میری نظریں بے اختیار تمہاری طرف اُٹھیں۔ تم ایکدم چونک کر سیدھے ہو گئے تھے۔

"ویدی کے بچے!" میں غصے سے چیخ اُٹھی۔ "اب تم بولنا مجھ سے۔"

اور میں جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نوید مجھے آوازیں دیتا رہ گیا' لیکن میں نے اپنی کوٹھی میں آ کر دم لیا۔ خدایا...... میرا دل دھڑکے جا رہا تھا' کیا تم سمجھ گئے ہو کہ وہ جرسی میں نے......مگر اتنی پرانی' اتنی چھوٹی سی بات تمہیں کیسے یاد آ سکتی ہے۔ پتا نہیں تم نے اس جرسی کا کیا کیا...... تمہیں حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی کہ اچانک یہ کہاں سے ٹپک پڑی۔ مگر اب تو...... خیر تم اتنے عقلمند بھی نہیں ہو۔ اور جو تم کچھ جان بھی گئے ہو' تو مجھے اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بہادری سے سوچا۔ میں نے کوئی ڈاکا نہیں ڈالا۔ اور تم کوئی ایسی خوفناک چیز نہیں ہو کہ میں...... اور ہرگز بھی تم سے مرعوب نہیں...... میں نے فیصلہ لیا۔

نوید سے میری بول چال بند تھی۔ اس دن کے بعد میں تمہارے سامنے بھی نہیں آئی۔ نوید کی وجہ سے مجھے کس قدر شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم نوید نے میرے وہاں سے آنے کے بعد تمہیں کیا بتایا۔ وہ دو تین بار مجھے ملنے آیا' لیکن مجھے اس پر اس قدر غصہ تھا کہ میں نے اسے دیکھتے ہی کمرے کا دروازہ بند کر لیا' اور وہ بیچارہ دروازہ پیٹ پیٹ کر چلا گیا۔ اس دن جب آنٹی نے مجھے بلا بھیجا' تو میں انکار نہ کر سکی۔ راستے میں تم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے کترا کر گزر جانا چاہا' مگر تم ایکدم میرے سامنے آ گئے۔ میں نے بے ساختہ نظریں اٹھائیں۔ تمہارے چہرے پر وحشت برس رہی تھی' اور ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے' اور تمہاری آنکھیں...... توبہ...... کیسی لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

"تم اس دن وہاں میری گاڑی کے پاس کیا کر رہی تھیں۔" تم نے سلگتی نظروں سے مجھے گھورا۔

"کہاں...... کب......؟" میں نے بوکھلا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کب......" تم نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"میں نہیں جانتی' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ شاید ہوش میں نہیں۔" میں بری طرح سہم گئی۔

"ہاں میں نشے میں ہوں۔" تم نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ وہ جرسی میری گاڑی میں کیسے آ گئی تھی؟"

تم اس قدر اونچا بول رہے تھے کہ میں نے ڈر کر برآمدے کی طرف دیکھا' اگر بینا' نوید یا آنٹی میں سے کوئی باہر نکل آیا تو کیا سوچیں گے وہ لوگ۔ بھلا تمہیں کیا حق پہنچتا تھا اس طرح ڈانٹنے کا' اور آنٹی ضرور برا مانتیں' اور تمہاری پوزیشن ان کی نظروں میں خراب ہو جاتی۔ کچھ بھی ہو تم ان کے منہ بولے بیٹے سہی' مگر میری حیثیت بھی تم سے کچھ کم نہ تھی۔ بلکہ میری محبت کی جڑیں تو زیادہ مضبوط اور کہیں زیادہ گہری تھیں' مگر اس وقت تم یہ سب کچھ نہیں سوچ رہے تھے' تم تو اپنی قہر برساتی آنکھوں میں دنیا جہاں کی نفرت لئے' زمانے بھر کا غصہ سموئے گویا مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"کون سی جرسی......؟ میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"انجان مت بنو......" تم نے ڈپٹ کر کہا۔ "وہ جرسی تم نے ہی گاڑی میں پھینکی تھی۔" وقار کا اشارہ اسی طرف تھا۔

"دیکھئے اگر آپ کی گاڑی میں سے کوئی جرسی وغیرہ نکلی ہے' تو اس کا حساب اپنے ڈرائیور سے لیجئے۔" میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "خوامخواہ مجھ پر برسنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی گاڑی کوئی میری تحویل میں نہیں رہتی کہ مجھ سے جواب طلب کیا جائے۔ رہا نوید تو اس کا اشارہ قطعاً آپ کی طرف نہ تھا۔ وہ تو یوں ہی اول فول بکتا رہتا ہے۔"

"میں احمق نہیں ہوں۔" تم نے ترشی سے کہا۔ "تم مجھے بھیک دے رہی تھیں۔"

"جناب وقار عالم صاحب!" میں نے تن کر کہا۔ "اگر مجھے بھیک ہی دینی ہوتی تو کم از کم آپ تو اس کے مستحق قطعاً نہ تھے۔ ہاں اگر آپ نادار ہوتے تو یہ غلط فہمی بجا بھی تھی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہاری آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے اُلجھن نظر آئی' مگر جب تم بولے تو تمہاری آواز میں پہلے جیسی کرختگی تھی۔

''میں تم جیسی لڑکیوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میں اس جال میں آنے والا نہیں۔''

''منہ سنبھال کر بات کیجئے وقار صاحب!'' میں نے طیش میں آ کر کہا۔ ''آپ کوئی ایسے حسین وجمیل نہیں کہ آپ پر جال پھینکا جائے' میں تو صرف اس لئے آپ کا لحاظ کر رہی ہوں کہ آپ نوید کے دوست ہیں' مگر میں نوید سے آپ کی شکایت ضرور کروں گی۔''

میں تیزی سے برآمدے کی طرف لپکی' مگر تم نے جھپٹ کر میرا راستہ روک لیا' اور مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ توبہ تم کس قدر وحشی ہو رہے تھے۔ تمہاری انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح میرے بازوؤں میں گڑ گئیں۔ میں تکلیف سے کراہ اُٹھی۔

''سنو اگر تم نے نوید سے میری شکایت کی' اگر تم نے میری اور اس کی دوستی کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کی تو' تمہیں تو خیر میں زندہ نہیں چھوڑوں گا' مگر نوید کو بھی نہیں بخشوں گا۔'' تمہاری تند آواز شعلے کی طرح لپکی۔

میں نے سہم کر تمہیں دیکھا۔ تم میرے کس قدر قریب تھے' تمہارا سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہا تھا' اور تمہاری آنکھوں میں آگ ہی آگ تھی۔ جیسے تم اپنے مقابل کو جلا کر بھسم کر ڈالو گے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا' مگر تم انتہائی سفاکی سے مجھے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھ گئے۔ میرا سر زور سے ستون سے ٹکرایا' اور آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ پھر یہ ناچتے تارے بھی کسی تاریک پردے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ مجھے ہوش آیا تو میں بینا کے کمرے میں تھی۔

امی' آنٹی' بینا' ویدی سب ہی وہاں موجود تھے۔ میرے سر میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں' اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آیا جا رہا تھا۔ قریب ہی ہمارے فیملی ڈاکٹر سلیمان اپنا بیگ بند کر رہے تھے۔ شاید وہ ابھی ابھی ڈریسنگ سے فارغ ہوئے تھے۔ بے ساختہ میرا ہاتھ پیشانی کی طرف گیا' جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے......؟'' ڈاکٹر نے مہربان سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''سر چکرا رہا ہے۔'' میں بمشکل بول سکی۔

''آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا' فکر کی کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے مجھے تشفی دی۔ پھر

امی سے مخاطب ہوئے۔

''جو ٹیبلیٹس میں نے دی ہیں' وہ انہیں کھلا دیجئے' اور زیادہ ڈسٹرب مت کیجئے۔ یہ جتنا آرام کریں بہتر ہے۔'' ڈاکٹر کے جاتے ہی نوید مجھ پر جھک آیا۔

''یہ کیا کر لیا نیل......'' اس نے محبت سے میرے ہاتھ تھام لئے۔

''ویدی......'' مجھے رونا آ گیا' اور میرا سارا غم وغصہ آنسوؤں میں بہہ گیا۔

''ارے جب اتنا حوصلہ نہیں ہے تو مجھ سے ناراض کیوں ہوتی ہو۔'' اس نے شرارت سے کہا۔ ''اور یہ فرہاد کی طرح سر پھاڑنے کی کیا سوجھی؟''

''وہ ویدی......'' ممکن تھا کہ میں اُسے سب کچھ بتا دیتی' لیکن اسی وقت مجھے کمرے میں امی اور آنٹی کی موجودگی کا احساس ہو گیا' اور وہ ساری باتیں تو میں صرف ویدی کو ہی بتا سکتی تھی۔

''وہ ویدی...... میں دوڑتی ہوئی آ رہی تھی کہ ستون سے ٹکرا گئی۔'' میں نے بات بنائی۔

''کئی بار سمجھایا ہے کہ انسانوں کی طرح چلا کرو۔ اب تم بچہ نہیں رہیں۔'' امی نے ڈانٹا۔ ''مگر تمہارے دماغ میں کچھ پڑتا ہی نہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ نوید کسی کام سے باہر نکلا' اور اس نے تمہیں دیکھ لیا۔ ورنہ جانے کب تک وہیں پڑی رہتیں۔''

تو گویا کسی نے تمہیں مجھ سے اُلجھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے سوچا' مگر تم کس قدر سنگدل تھے کہ مجھے اس زخمی حالت میں وہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کیا تمہیں اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندگی نہ تھی' اور اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو...... مجھے اپنے خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ بھلا اس معمولی سے زخم سے کیا ہونا تھا' اور پھر بھلا تمہاری نظروں میں میری جان کی کیا اہمیت تھی۔ یعنی کہ میں خوامخواہ ہی اتنی زود رنج ہو رہی ہوں۔

''بھئی کیا بات ہے......؟'' بینا نے چپکے سے مجھ سے پوچھا۔

''یہ آپ ہی آپ کیوں مسکرایا جا رہا ہے؟''

''ضرور کوئی آن بسا ہے خیالوں میں......'' نوید نے بینا کی سرگوشی سن کر کہا۔ کمبخت کے کان بہت تیز تھے اور مطلب کی بات تو وہ دور سے سن لیتا تھا۔

''سچ بتا دو نا...... یہ تمہاری آنکھوں میں کس کے نام کا تارا چمک رہا ہے۔''

''میری آنکھوں میں کوئی تارا وارا نہیں چمک رہا۔ تم اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔'' میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے برا مان کر کہا۔

"اسے تنگ مت کرو نوید۔ دیکھتے نہیں وہ زخمی ہے۔" آنٹی نے ڈانٹا۔ "اور بینا تم دودھ گرم کرلاؤ۔ نیل کو ٹیبلیٹس دینی ہیں۔"

"اونہہ بڑے لاڈ ہو رہے ہیں' جی چاہتا ہے میں بھی زخمی ہو جاؤں۔" نوید نے مجھے چڑایا۔

"سوچ سمجھ کر بولا کرو نوید' جو منہ میں آئے بک دیتے ہو۔" امی نے سمجھایا۔

"واہ...... آج تو مجھے ہر کوئی ڈانٹنے پر تلا ہوا ہے۔" نوید نے منہ بنایا۔

"میرا خیال ہے امی اب گھر چلا جائے۔ میں کافی بہتر ہوں۔" میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔

"اُٹھ کر تو دیکھو' ٹانگیں نہ توڑ دوں تو کہنا۔" نوید نے آنکھیں دکھائیں۔

"آپ نے دیکھا ممی۔ یہ آج کل کس قدر غیریت برت رہی ہے۔" بینا نے شکایت کی۔

ان سب کے خلوص کے سامنے میں مجبور ہو گئی۔ ورنہ میرا دل وہاں رہنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا' جہاں تم آتے تھے۔ میں تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی' مگر وہاں رہتے ہوئے تم سے سامنا ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر مجھے اس امکان کو نظر انداز کرنا پڑا۔ ظاہر ہے تم وہاں میرے کمرے میں تو آنے سے رہے' اور میں نے کون سا کمرے سے باہر نکلنا تھا۔ پھر یہاں مجھے کوئی عمر بھر تو رہنا نہیں ہے۔ طبیعت ٹھیک ہوتے ہی گھر چلی جاؤں گی' میں نے سوچا۔

اس وقت تو مجھے اتنی کمزوری محسوس ہو رہی تھی کہ اُٹھنے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ ٹیبلیٹس کھانے کے بعد مجھے نیند سی آنے لگی۔ آنکھیں کھولے رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس غنودگی میں مجھے یوں لگا' جیسے تم آنکھیں نکالے میری گردن دبانے کے لئے بڑھے چلے آرہے ہو۔ حتیٰ کہ تمہاری انگلیاں میری گردن کو چھونے لگیں۔ مارے وحشت کے میرے منہ سے چیخ نکل گئی' اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے پسینے ہو رہی تھی' اور میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا' شاید سب مجھے سوتا سمجھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ تاکہ میری نیند خراب نہ ہو' قریب ہی تپائی پر پانی کا گلاس رکھا

تھا۔ دو گھونٹ پیئے تو حواس واپس آئے۔ اللہ...... تم کسی ڈراؤنے سپنے کی طرح اعصاب پر ہی سوار ہو گئے ہو۔ بھلا ایسا وحشت ناک خواب دیکھنے کی بھی کوئی تک تھی۔ ساری نیند اڑا کر رکھ دی' اور تم کوئی ایسی اعلیٰ و ارفع قسم کی ہستی نہیں ہو کہ تمہارے لئے اپنی نیندیں حرام کی جائیں۔ میں نے فیصلہ کیا۔

پھر میں سوچنے لگی کہ نوید کو ساری بات بتا دوں یا چپ سادھ لوں۔ اس سے پہلے میں نے ویدی سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی' لیکن اب قباحت یہ تھی کہ ایک تو اسے تمہاری حرکت سے بہت دُکھ پہنچتا' پھر آنٹی اور بینا کے دل میں بھی تمہاری طرف سے رنجش پیدا ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے وہ تم سے تعلقات منقطع نہ کرتے' لیکن پہلی سی بات نہ رہتی۔ اور تم نے اپنا جو مقام ان لوگوں کی نظروں میں بنا لیا تھا' اس سے گر جاتے۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا' شاید تم پہلے سے بھی زیادہ تلخ' پہلے سے زیادہ تلخ مزاج اور پہلے سے بھی زیادہ اُکھڑ ہو جاتے' پھر شاید تمہارے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہتا' پھر تم نے جان سے مار ڈالنے کی بھی دھمکی دی تھی۔ ہاں تم ایسا کر سکتے تھے' جس شخص کو خود اپنے آپ سے ہمدردی نہ ہو' خود سے دلچسپی نہ ہو' اس کے لئے دوسروں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ اپنی تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی' مگر نوید...... کیا تمہارا ہاتھ نوید پر بھی اُٹھ سکتا تھا' نہیں یہ ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے تم محض دھمکی دے رہے ہو' مگر میں یہ رسک نہیں لے سکتی' اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ایک خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے' تو سچ ہی کہا ہے۔ تو پھر یہ طے ہے کہ میں ویدی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں نے فیصلہ کیا۔

پتا نہیں اتنی دیر کی ذہنی کوفت کا نتیجہ تھا' یا زخم کی تکلیف کہ رات مجھے تیز بخار ہو گیا۔ بخار کی شدت میں بار بار مجھ پر غنودگی طاری ہو جاتی' مگر ہر بار کوئی نہ کوئی وحشت زدہ خواب مجھے جگا دیتا۔ کبھی تم خنجر لئے میری طرف بڑھتے نظر آتے' کبھی پہاڑ سے دھکا دیتے ہوئے ساری رات کی بے چینی کے بعد صبح آنکھ لگی' تو ایک بار پھر وہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ تمہاری انگلیاں میرے بازو میں تکلیف دہ حد تک چبھ رہی تھیں' اور تم میرا سر ستون کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ میں نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ میرا سانس تیز تیز چل رہا تھا' اور میری پیشانی پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سلیمان میرے بازو پر بی پی آپریٹس کا فیتہ لپیٹ رہے تھے۔ امی میری پائینتی کھڑی تھیں' اور نوید ڈاکٹر سلیمان کے بالکل قریب۔

"اوہ...... تو یہ فیتے کا دباؤ ہے' تمہاری آہنی انگلیوں کی گرفت نہیں۔" میں نے مطمئن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو کر سوچا۔ اپنی بزدلی پر بے حد ندامت ہوئی۔ یعنی کہ میں اس قدر ڈرپوک ہوں کہ ڈراؤنے خواب دیکھ دیکھ کر اپنی توانائی زائل کروں۔ اور وہ بھی ایک معمولی سے واقعہ پر۔ حد ہو گئی' میں تو اپنے آپ کو خاصا بہادر سمجھتی تھی۔ ڈاکٹر سلیمان نے پٹی بدلی۔ انجکشن لگایا اور ٹمپریچر چیک کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

''کافی تیز بخار ہے۔ کسی کو میرے ساتھ بھیج دیجئے دوا دیئے دیتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

نوید ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ امی میرے قریب بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں سے دل بہلانے لگیں۔ میں سوتی جاگتی گڑیا کی طرح کبھی آنکھیں بند' کبھی کھولتی۔ یوں لگتا تھا' جیسے کسی نے میرے پپوٹوں سے منوں وزن باندھ دیا ہو۔ ذہن کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ سارے خیالات یوں گڈمڈ ہو رہے تھے جیسے کسی برتن میں مختلف قسم کے مشروب ڈال کر انہیں ملا دیا جائے۔ یا جیسے نمک' مرچ اور چینی آپس میں اس طرح مل جائیں کہ...... کسی طرح الگ نہ کیے جا سکیں۔

جب دو سیارے آپس میں ٹکرا جائیں تو کیا سب کچھ اسی طرح تلپٹ ہو جاتا ہے۔ اسی سوتی جاگتی کیفیت میں میرے ذہن میں اُڑتا اُڑتا سا خیال آیا۔

نوید کے آنے پر امی میرے لئے سوپ لانے چلی گئیں۔ میں نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ جو ایک ذرا سی بات دل میں نہ رکھ سکا' اور معاملہ اس حد تک پہنچ گیا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

''کیا بات ہے بڑی خاموش ہو؟'' نوید نے کہا۔

''تم بہت برے ہو ویدی۔ اُس دن وقار کے سامنے میری کرکری کر دی۔''

''کیا کرتا بھائی' چڑے کی زبان تھی پھسل گئی۔'' اس نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔

''ویسے بے فکر رہو میں نے تمہاری صفائی پیش کر دی تھی۔''

''کیسی صفائی......؟'' میں نے خالی الذہنی سے کہا۔

''میں نے اسے بتایا ہے ایک بار تم نے اپنی جرسی اُتار کر کسی غریب کو دے دی تھی۔ تب سے یہ تمہاری چڑ بن گئی۔''

''اور اس نے مان لیا۔''

''پتا نہیں......'' نوید نے شانے اُچکائے۔ ''ویسے اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا' خاموش رہا۔''

''سچ کہہ رہے ہو۔'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

''تمہارے سر کی قسم بالکل سچ......'' اس نے مجھے یقین دلایا۔

''لیکن یہ سچ بھی ایک جھوٹ ہے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''اگر تم اسی رفتار سے جھوٹ بولتے رہے ویدی تو ایک دن سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔''

''فکر نہ کرو جہاں گیا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' اس نے انتہائی خلوص سے کہا۔

''ادھر وقار بھائی ڈرائنگ روم میں آئے بیٹھے ہیں۔ کیا انہیں یہاں ہی بلا لاؤں۔'' بینا نے اندر آ کر پوچھا۔

''نہیں نہیں۔'' میں چیخ اٹھی۔ درد کی ایک تیز لہر پیشانی سے اٹھی اور سارے سر میں دوڑتی چلی گئی۔ میں نے کراہ کر سر تھام لیا۔

''کیا ہوا نیل......؟'' ویدی گھبرا گیا۔

''اس سے کہہ دو' اس سے کہہ دو کہ وہ یہاں نہ آئے ورنہ میں اسی وقت' اسی لمحے گھر چلی جاؤں گی۔''

میں نے کہنا چاہا' مگر اُڑے اُڑے سے خیالات نے اس طرح میرے ذہن پر یلغار کر دی کہ میں گڑبڑا کر رہ گئی۔

''کیا ہوا......؟'' ویدی نے پھر پوچھا۔ ''کیا زیادہ درد ہو رہا ہے۔''

''اسے یہاں نہ بلاؤ ویدی۔'' میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''تم خود جا کر اس سے مل لو۔''

''ہوں......تم جاؤ بینا میں آ رہا ہوں۔'' نوید نے بینا سے کہا۔ ''اور ہاں امی یا آنٹی کو یہاں بھیجتی جانا۔''

''اب بتاؤ نیل...... کیا بات ہے؟'' اس نے بینا کے جانے کے بعد پوچھا۔

''کچھ نہیں......'' میں نے ڈوبی ڈوبی آواز میں کہا۔

''تم جاؤ۔'' تب ہی آنٹی کسی سے باتیں کرتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ میں نے بند ہوتی آنکھیں بمشکل کھول کر دیکھا۔ تم آنٹی کے ساتھ میری طرف آ رہے تھے۔ ایک دم میرا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ اتنی بڑی حرکت کے بعد تمہیں میرے سامنے آنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ میں نے سختی سے مٹھیاں بھینچ لیں اور غصے سے اُٹھ بیٹھی۔ درد کی ایک تیز لہر غصے سے بل کھا کر اوپر کو اُٹھی اور آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچنے لگے۔ یوں جیسے بار بار روشنیاں جل اور بجھ رہی ہوں۔ یا کوئی تیزی سے پانی میں غوطے دے رہا ہو۔

"پاگل تو نہیں ہو گئیں نیل۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔" نوید نے مجھے زبردستی لٹاتے ہوئے کہا۔

میں کچھ جواب نہ دے سکی۔ کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ابھی تک اندھیرے اُجالے کا کھیل جاری تھا۔ پھر گویا ساری کائنات اسی کھیل میں شامل ہو گئی۔ کمرہ اور کمرے کی ساری چیزیں ایک دائرے میں رقص کرنے لگیں۔

"کیا حال ہے مس شہنیلا۔" مجھے تمہاری آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

میں نے اندھی گھاٹیوں سے اُبھر کر تمہاری طرف دیکھا۔ تمہارے چہرے پر تمہارے مجرم ضمیر کی ذرا سی بھی چھاپ نہ تھی۔ تم کس ڈھٹائی سے میرا حال پوچھ رہے تھے۔ جیسے یہ سب کیا دھرا تمہارا نہ ہو۔ میں نے اپنی نگاہیں تمہارے چہرے پر گاڑ دیں۔

"مہربانی ہے آپ کی۔" میں نے پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

پھر تمہارا چہرہ سیاہی میں ڈوب گیا' اور یہ سیاہی گہری ہی ہوتی چلی گئی۔ شاید مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔

دوسرے دن بخار اُتر گیا' مگر کمزوری بہت تھی۔ کسی نے مجھے گھر نہ جانے دیا۔ تین چار دن میں میری طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اس اثنا میں مجھے کھٹکا سا لگا رہا کہ کہیں پھر تم سے سامنا نہ ہو جائے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تمہاری صورت نظر نہ آئی۔ آخر چھٹے دن میں ضد کر کے گھر چلی آئی اور یوں دل کو جو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا' اس سے نجات مل گئی۔

اس دن میں دریچے میں کھڑی لوکاٹ اور کھجور کے اونچے اونچے درختوں اور ان کے پیچھے غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی' اور اس کے ساتھ ساتھ میں اس حادثے کے متعلق سوچ رہی تھی' جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ پیشانی کا زخم کب کا مندمل ہو چکا تھا' مگر دل میں جو گھاؤ پڑ گیا تھا' وہ بھرتا نظر نہ آتا تھا۔ یعنی اگر میں نے وہ جرسی پھینکی بھی تھی' تو کون سا ظلم کیا تھا۔ اس میں اس قدر طیش میں آنے کی کیا بات تھی۔ پھر تمہارے الفاظ کس قدر

توہین آمیز تھے۔ یعنی تم مجھے اس قسم کی بیہودہ لڑکی سمجھتے تھے۔ مجھے تمہاری گھٹیا سوچ پر بہت غصہ آیا۔ میں نے کون سا تم پر ڈورے ڈالے تھے' جو تم نے اس قسم کے بیہودہ الفاظ استعمال کیے۔ میں تو تم سے بات کرنے کی روادار نہ تھی' اور وہ جو انجانے میں ایک غلطی مجھ سے سرزد ہو گئی تھی' تو اس کا مطلب ہرگز وہ نہ تھا' جو تم نے سمجھا۔ اور ایسی بات تو کوئی نیچ سوچ رکھنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔ مجھے تم پر بے طرح غصہ آئے جا رہا تھا۔ اپنے زخمی ہونے کا تو مجھے ذرا بھی ملال نہ تھا۔ البتہ یہ بات مجھے کھائے جا رہی تھی کہ تم میرے متعلق اتنے غلط انداز میں سوچتے ہو۔

"کیا ہو رہا ہے نیل ڈیئر۔" ویدی کی آواز پر میں چونک پڑی۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تو چلو پھر تمہیں گھما لاؤں۔ کھلی فضا میں تمہارا دل بہل جائے گا۔"

"نہیں ویدی۔ دل نہیں چاہتا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"کیوں...... کیا ہو گیا ہے تمہارے دل کو؟ اور یہ تم نے ہمارے ہاں آنا کیوں چھوڑ دیا۔ کہاں تو چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتی تھیں' اور کہاں پندرہ دن ہو گئے ہیں' محترمہ نے جھانکا تک نہیں۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جب سے میں آئی تھی' ان کے گھر نہیں گئی تھی۔

"ارے تم بولتیں کیوں نہیں؟" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں اتنی دیر سے کیا بک رہا ہوں۔"

"ارے بھئی دن میں دس پھیرے تو تم خود لگا جاتے ہو۔ میرے آنے کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟"

"اچھا...... تو تم چاہتی ہو میں نہ آیا کروں۔" اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"یہ بات نہیں ویدی۔"

"تو پھر کیا بات ہے۔ اتنی دیر سے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔"

"بات یہ ہے ویدی کہ اب وہاں میری گنجائش نہیں رہی۔" میں نے اُداسی سے کہا۔

"کیا......" ویدی چلایا۔ "اگر تم نے ایسی باتیں کیں تو میں کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی سے پھاند پڑوں گا۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے نیل۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں چپ رہی۔ وہ ایک جملہ' جو غیر ارادی طور پر میرے ہونٹوں سے پھسل پڑا تھا' اس کی کوئی توجیہہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ویدی تو یونہی بات کو پکڑ لیتا تھا۔ اب میں اسے اپنے اس جملے کا کیا جواز سمجھاؤں میں سوچنے لگی۔

''لگتا ہے تمہارے سر پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آئی ہے' مجھے تمہارے دماغ کا ایکسرے کروانا پڑے گا۔'' نوید نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایکسرے تو خیر میں کروا لوں گی' مگر تم میرے ساتھ نہ جانا۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

''وہ کیوں......؟''

''بھئی خوامخواہ ڈاکٹر شبہے میں پڑ جائے گا کہ اصل مریض کون ہے۔ ہو سکتا ہے وہ میرے بجائے تمہارا ہی ایکسرے کر ڈالے۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''ٹالو نہیں۔'' وہ دو قدم بڑھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں جانتا ہوں تم وقار کی وجہ سے نہیں آ رہی ہو۔''

میرا جی دھک سے ہو گیا۔ کیا اسے پتا چل گیا ہے کہ مجھے زخمی کرنے والے تم ہو۔ مگر کیسے؟ ظاہر ہے تم نے تو نہ بتایا ہو گا۔

''تمہیں پتا ہے تم مجھے کتنی عزیز ہو۔'' نوید نے مجھے گھورا۔

''ہاں...... اور مجھے تمہاری محبت پر فخر ہے۔''

''تو پھر وقار کے رویے کی پروا کیوں کرتی ہو۔ وہ تو ہر ایک سے اسی سرد مہری سے پیش آتا ہے۔'' نوید بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ ''یا پھر تم چاہتی ہو کہ میں اسے اپنے ہاں آنے سے منع کر دوں۔''

''یہ میں نے کب کہا ہے۔ خوامخواہ ہی۔''

''تو پھر تمہارا اور مطلب کیا ہے؟ یہ گوشہ نشینی کس خوشی میں اختیار کی ہے۔''

''میں نہیں آتی تو تم آ جاتے ہو۔ آخر فرق کیا پڑتا ہے؟'' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''فرق کیوں نہیں پڑتا' یعنی غلطی اس نے کی ہے' اور سزا تم ہمیں دے رہی ہو۔''

''اچھا بابا بخشو غلطی ہو گئی۔'' میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔''

''جب تم اپنی غلطی تسلیم کر رہی ہو تو پھر معاف تو کرنا ہی پڑے گا۔'' نوید مسکرایا۔ ''پھر اب چل رہی ہو نا آؤٹنگ کو۔''

''چلنا ہی پڑے گا میں نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔'' تم جان چھوڑنے والے کہاں۔''

''گڈ اب ہوئی نا بات۔'' نوید نے خوش ہو کر کہا۔

''پر ایک بات سن لو۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر تنبیہ کی۔ ''تم کبھی مجھے وقار کے سامنے آنے پر مجبور نہیں کرو گے۔ اس کا اہانت آمیز رویہ میری برداشت سے باہر ہے۔''

''نہیں کروں گا' بھئی نہیں کروں گا۔'' نوید نے جھنجھلا کر کہا۔ ''چاہو تو سٹامپ لکھوا کر دستخط کروا لو۔''

''کہیں جعلی دستخط نہ کر دینا۔'' میں نے ٹوکا۔ ''پھر تمہارا اعتبار بھی کیا' مکر گئے تو۔''

''نہیں مکروں گا۔'' نوید ہنس پڑا۔ ''پر نیل ایک بات تو بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''وقار نے تمہیں کیا کہہ دیا تھا۔''

وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''میں بھی نہیں' کیا کہنا چاہتے ہو تم۔'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وقار سے تمہارا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''نہیں تو۔''

''پھر...... پھر یک دم ہی تمہیں اس کے رویے کا احساس کیوں ہونے لگا۔ جب کہ وہ شروع سے ہی اس خشک مزاجی سے کام لے رہا ہے۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہے' ہے نا۔''

''ہاں......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''وہ اس جرسی کے بارے میں باز پرس کر رہا تھا۔''

''اوہ......'' نوید چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ''تو اسے پتا چل گیا ہے۔''

''ہاں تمہاری مہربانی سے' مگر میں صاف مکر گئی۔ اور جب حضرت دھونس دینے لگے تو میں نے بھی ڈانٹ دیا کہ زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کریں۔'' میں کچھ سچ جھوٹ ملاتے ہوئے کہا۔

''اس شخص کو میں آج تک سمجھ نہیں سکا۔'' نوید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ایک طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو وہ اس قدر بد دماغ ہے کہ لوگ اس سے بات تک کرنے کے روادار نہیں' اور دوسری طرف وہ ہم پر اپنا خلوص بے طرح لٹا رہا ہے۔ اس کی فطرت کے یہ دو متضاد پہلو سمجھ سے بالکل بالاتر ہیں۔ اگر وہ ازلی بدمزاج ہے تو خلوص کا چشمہ کہاں سے پھوٹ پڑا۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ کیوں سرد نہیں۔ امی اور بینا سے بات کرتے وقت اس کا اکھڑ پن کہاں جاتا ہے۔"

"بات تو غور کرنے کی ہے۔" میں دل ہی دل میں قائل ہو کر سوچنے لگی۔

"کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے اس بدمزاجی کے پیچھے وہ کسی بہت بڑے غم کو چھپا رہا ہو۔"

نوید نے پھر کہا۔

"اور تمہیں اس کے غم کا پتا نہیں۔ تم اس کے دوست ہو۔"

"وہ ایسا شخص ہے' جو دل کی بات خود سے بھی نہیں کہتا۔ میں اس کے بہت قریب ہوں' مگر اس نے آج تک مجھے بھی اپنی زندگی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

"ہوں۔" میں چپ چاپ اسے تکتی رہی۔

"تمہارے ساتھ اس کا رویہ مجھے بھی کھلتا ہے نیل مگر وہ تنہا ہے۔ گھریلو ماحول کو ترسا ہوا' اور اس ماحول کی ایک جھلک اسے ہمارے ہاں نظر آتی ہے۔ تم نے دیکھا تھا امی کی ذرا سی اپنائیت پر وہ کس طرح پھوٹ پڑا تھا۔ تو اب میں اس سے یہ جنت کیسے چھین لوں۔ یہ معمولی سی خوشی کہ اس کا بھی کوئی ہے۔"

ارے کیا یہ نوید ہی بول رہا ہے۔ میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ تو یہ لاابالی سا لڑکا ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے۔

"انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔" نوید نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں اس کا یہ اعتبار بحال ہو جائے' اور وہ تمہارے اندر کی خوبصورتیوں کو کھوج لے۔"

"میرے اندر کی خوبصورتیاں......" میں نے احمقوں کی طرح سر اُٹھا کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اس دنیا کی خوبصورتیاں۔ وہ انہیں دریافت کر لے۔ پالے اور تسلیم کر لے کہ دنیا اتنی بدصورت نہیں' جتنی کہ وہ سمجھتا ہے۔"

"پر ویدی...... اگر اسے دنیا کی یہ ساری خوبصورتیاں نظر نہ آئیں تو......؟" تمہیں پتا

ہے نا کچھ لوگ ہمیشہ منفی انداز میں سوچتے ہیں۔"

"مگر تم تو جانتی ہو نا کہ ایسے لوگوں کو کیسے ٹریٹ کیا جاتا ہے۔" نوید کا لہجہ شوخ ہو گیا۔

"مگر میں...... مجھے کیا پڑی ہے۔ خوامخواہ ہی۔" میں گڑبڑا گئی۔

"ہاں خوامخواہ ہی۔" نوید ہنس پڑا۔ "خیر چھوڑو ویسے موقع ملا تو میں اس سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ کیا اپنی نیل جی نے تمہاری بھینس چرا لی ہے۔"

"نہیں نوید اس سے کچھ مت کہنا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ ایسا نہ ہو وہ مائنڈ کر جائے' اور اس کا اثر تمہاری دوستی پر پڑے۔"

"جواب نہیں تمہارا بھی۔ ابھی تو اتنی خفا ہو رہی تھیں اس پر اور اب۔"

"بھائی تمہارے دوستوں کا تھوڑا لحاظ تو کرنا ہی پڑتا ہے نا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"اس لحاظ و مروت کا شکریہ۔ پر اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"ابھی لو۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور تیار ہونے چل دی۔ پھر بینا اور نوید کے ساتھ ایک لمبی ڈرائیو کے بعد جب میں واپس آئی' تو میں نے محسوس کیا کہ میرے دل پر چھائے ہوئے سارے بادل چھٹ چکے ہیں' اور وہ جو ایک اضمحلال سا روح کو گرفت میں لیے ہوئے تھا' کہیں معدوم ہو گیا ہے۔

آج صبح سے ہی موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا' آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں نے دھوپ کی شدت کافی کم کر دی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہوتی رہی تھی۔ اب بارش تو نہیں ہو رہی تھی' لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے کافر موسم میں نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا' مگر نوید جانے صبح سے کہاں غائب تھا۔

"چلو بینا۔ موتیے کے پھول چنیں اور گجرے بنائیں۔" میں نے اُکتا کر بینا سے کہا۔

"چلو......" بینا فوراً تیار ہو گئی۔

پر میں نے اور بینا نے مل کر ڈھیروں موتیے کے پھول چن ڈالے اور بہت سارے گجرے بنائے۔ بالوں اور کلائیوں میں گجرے لپیٹنے کے بعد بھی بہت سارے پھول بچ رہے تو میں مالا بنانے لگی۔

"بینا ڈارلنگ۔ موسم کچھ کھانے پینے والا نہیں ہو رہا۔" میں نے پھول پروتے پروتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پوچھا۔

''ہاں ہو تو رہا ہے۔'' بینا نے تائید کی۔

''تو پھر بیٹھی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔'' میں نے ڈانٹا۔

''جاؤ مابدولت کے لئے کچھ لے کر آؤ۔''

''واہ کیا شان ہے۔'' بینا نے چہک کر کہا۔ ''اسی لئے گھر بلایا تھا۔''

''وہ بات یہ ہے بینا کہ تم پکوڑے بڑے مزے کے بناتی ہو اسی لئے ورنہ میں خود۔''

''ہاں ہاں تم خود ہی زحمت فرماؤ۔ میں نہیں بنانے کی۔'' بینا نے ہٹیلے پن سے کہا

''اچھا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''چل یوں ہی سہی۔ ہم تیری خوشی کے لئے کیا کیا نہ کریں گے۔

تو چاہے تو ہم تجھ کو بھی۔''

''بس بس رہنے دے۔'' بینا نے نرم پڑ کر کہا۔ ''چل تو بھی کیا یاد کرے گی کہ کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔''

''رئیس نہیں رئیسہ......'' میں نے تصحیح کی۔

''تو میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' بینا نے آنکھیں دکھائیں۔

''نہیں، نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم تو ٹھیک کہہ رہی ہو جانا۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔''

بینا بے ساختہ ہنس پڑی۔

''ویسے اول نمبر کی خوشامدی۔''

''اسے خوشامد کہہ کر میرے اتنے مخلصانہ جذبات کی توہین نہ کرو۔'' میں نے بُرا مان کر کہا۔

''اس میں توہین کی کیا بات ہے۔ خیر یہ بتاؤ پکوڑے ہی کھاؤ گی یا کچھ اور بھی۔''

''اب یہ تو تمہاری صوابدید پر منحصر ہے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''تو گویا ہمیں آزمایا جا رہا ہے۔'' بینا ہنستی ہوئی چلی گئی۔

مالا پروتے پروتے میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے سے نوید چلا آ رہا تھا۔

''ارے ارے یہ مالا کس خوشی میں پروئی جا رہی ہے۔ کیا سوئمبر رچانے کا ارادہ ہے؟''

اس نے شرارت سے کہا۔

''سوئمبر رچانے کا ارادہ تو نہیں۔'' میں نے جھینپ کر آستینیں چڑھائیں۔ ''البتہ تم سے ڈوئیل لڑنے کا ارادہ ضرور ہے۔''

''نہ نہ ایسا غضب نہ کرنا۔'' نوید نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی۔ ''ورنہ میں غریب تو مفت میں مارا جاؤں گا۔''

''ہاں ایسے ہی تو تم نازک ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔

''اور کیا پتا بھی ہے میں بڑے کمزور دل کا واقع ہوا ہوں۔''

''ہاں وہ تو لگ رہا ہے تمہاری شکل دیکھ کر۔''

''کیوں میری شکل کو کیا ہوا ہے۔'' نوید نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''اتنا خوبصورت تو ہوں میں، لڑکیاں راہ چلتے مجھے دیکھ کر رُک جاتی ہیں۔''

''ڈر جاتی ہوں گی۔'' میں نے مذاق اڑایا۔

''ڈرتی نہیں جناب، مرتی ہیں مجھ پر۔'' نوید نے اکڑ کر کہا۔

''ہاں بڑے گلفام ہو نا، اور یہ صبح سے تم غائب کہاں تھے؟''

''وہ نیل ایک بڑی سرپرائزنگ نیوز ہے تمہارے لئے۔''

''تمہاری ہر نیوز سرپرائزنگ ہوتی ہے۔ غالباً کسی پیاری سی لڑکی نے مسکرا کر دیکھ لیا ہو گا۔ ہے نا۔''

''نہ ایسی نیوز نہیں، بلکہ خالصتاً سرپرائزنگ نیوز ہے۔''

''تو پھر بتا بھی چکو۔'' میں نے اُلجھ کر کہا۔

''میں ہانگ کانگ جا رہا ہوں۔''

''بکواس، تم ہانگ کانگ جا ہی نہیں سکتے۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتا بھلا۔ مجھ پر کوئی پابندی لگی ہوئی ہے؟''

''تو تمہاری پڑھائی کا کیا ہو گا؟ ادھوری چھوڑ دو گے کیا؟''

''بس بہت پڑھ چکے۔ اب کچھ دنیا دیکھیں گے۔'' نوید نے بے نیازی سے کہا۔

''تو کیا تم سچ مچ جا رہے ہو ویدی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اور کیا۔ کبھی تو میری بات پر یقین کر لیا کرو۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مگر ویدی...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آنٹی نے تمہیں منع نہیں کیا۔"

"وہ کیسے منع کرسکتی ہیں۔ اب تو سارے انتظامات بھی مکمل ہوگئے۔"

"اور تم نے کسی کو بتایا تک نہیں۔ چپکے ہی چپکے سے تیاری کر لی۔" میں نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"بس سوچا تھا اچانک سرپرائز دوں گا۔"

"واہ یہ اچھا سرپرائز ہے۔"

میں نے خفا ہو کر کہا۔ "اور انکل نے بھلا تمہیں اجازت کیونکر دیدی پڑھائی ادھوری چھوڑنے کی۔"

"ڈیڈی کا تو ارادہ نہیں تھا اجازت دینے کا۔ پر میں نے بھی وہ شاندار دھمکی دی کہ بس داد نہیں دی جاسکتی میرے ذہن رسا کی۔"

نوید نے ہنس کر کہا۔

"اور تمہارے اس ذہن رسا نے کیا گل کھلایا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"پتا ہے ڈیڈی اجازت ہی نہیں دے رہے تھے بالکل۔ ہر بار ٹال جاتے۔ اس بار میں نے انہیں لکھا کہ ٹھیک ہے آپ نہیں بلاتے تو نہ سہی۔ میں خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ہپیوں کے گروپ میں شامل ہو کر۔ بس گھبرا کر فوراً اجازت دے دی۔"

"واہ کیا شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔" میں نے ملامت سے کہا۔ "اور تمہیں شرم نہ آئی ایسی بات لکھتے ہوئے۔"

"شرم کاہے کی۔"

نوید نے بن کر کہا۔

"میں تو ذرا اپنے ڈیڈی سے لاڈ کر رہا تھا۔"

"یہ لاڈ کر رہے تھے یا دھمکا رہے تھے انہیں' بلیک میلر کہیں گے۔ اب دیکھنا وہ تمہاری کیا گت بنائیں گے۔"

"ارے تم کیا جانو میرے ڈیڈی اتنے شاندار ہیں کہ بس' جاتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں گا کہ مجرم حاضر ہے حضور اور الطاف فروانہ کا منتظر۔ چاہیں تو معاف فرمادیں' چاہیں تو

قابل گردن قرار دیں اور دیکھ لینا ادھر میں معافی مانگوں گا اور ادھر وہ ہر غلطی بھول کر اپنے گستاخ بیٹے کو سینے سے لگالیں گے۔"

"کس قدر مکار ہو تم۔"

"شکریہ' شکریہ۔"

اس نے عجیب تمسخرانہ انداز میں جھک جھک کر کئی فرشی سلام کر ڈالے۔

"بہت اِترا رہے ہو مگر ویدی' یہ تو بتاؤ تمہارے بنا میں کیا کروں گی۔" اس کے جانے کے خیال سے میں اداس ہونے لگی۔

"تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔"

نوید نے مجھے مشورہ دیا۔

"مگر ویدی میں تو اپنے ڈیڈی کو ہپیوں کے گروپ میں شامل ہونے کی دھمکی نہیں دے سکتی نا۔"

"ارے دھمکی کے بڑے فائدے ہیں۔"

ویدی مجھے سنجیدگی سے سمجھانے لگا۔

"یہ جو پرانی نسل ہے نا۔ دھمکیوں کے بغیر قابو میں نہیں آتی' خود تو اپنا وقت گزار چکے ہیں نا۔ نئی نسل کو ہنستے کھیلتے دیکھ نہیں سکتے۔ جلتے ہیں ہم سے۔ ان کو اگر قابو میں کرنا ہے تو۔" وہ اول فول بکے جا رہا تھا۔

"بس بس چل پڑی گاڑی۔"

میں نے تنبیہ کی۔

"تم کسی تقریری مقابلے میں حصہ نہیں لے رہے۔"

"اوکے مائی ڈیئر اس انفارمیشن کا شکریہ۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے اس ہفتہ کے اینڈ میں جا رہا ہوں۔ کیا خبر پھر کب مل بیٹھنا نصیب ہو' اور تم ہو کہ چائے کے لئے بھی نہیں پوچھ رہیں۔ کنجوس کہیں کی۔"

اسی وقت بینا چائے لے کر آگئی۔

"ہو بڑے تھڑدلے۔ ایک ذرا صبر کر لیا ہوتا تو بن مانگے ہی بہت کچھ مل جاتا۔" بینا نے کہا۔

''مثلاً کیا کیا......؟''

نوید نے پوچھا۔

''کچوریاں' سموسے' نمکین مٹھریاں اور بادام کی لوز۔''

بینا نے بتایا۔''اور نیل ڈیئر تمہاری ساری خوشامد بیکار میں ضائع گئی' کیونکہ آنٹی پہلے ہی یہ سب کچھ تیار کر چکی تھیں۔''

''سوسوری۔''

میں نے منہ بنا کر اظہار افسوس کیا اور چائے بنانے لگی۔

مگر جانے کیا بات تھی ویدی کی دلچسپ معیت اور پُرمزاح گفتگو کے باوجود بھی دل بے طرح اداس ہونے لگا۔ شاید اس لئے کہ ویدی جس کے بنا پل بھر گزارنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ اتنی دور جا رہا تھا' اور شاید نامعلوم مدت کے لئے۔ ویدی کے بغیر زندگی کس قدر بور اور ڈل ہو جائے گی' اور دن تو بتائے نہ بیتیں گے۔ میں سوچتی اور اداس ہوتی رہی۔

✸✦✸

نوید جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ آنٹی اور بینا بھی اچانک اس کے جانے کا سن کر حیران رہ گئی تھیں۔ آنٹی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی' مگر اس کے سر میں جانے کی ایسی دھن سمائی تھی کہ اس نے کسی کی نہ سنی۔ ناچار آنٹی چپ ہو گئیں۔ ویدی کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے۔ ابھی ابھی وہ سامان پیک کر کے فارغ ہوا تھا۔ البم اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بریف کیس میں رکھنے کے لئے کہہ کر نہانے کے لئے چلا گیا تھا۔ میں البم بریف کیس میں رکھ رہی تھی کہ تمہاری آواز پر چونک پڑی۔

''کیا نوید یہاں نہیں ہے؟''

تم دروازے میں کھڑے پوچھ رہے تھے' اور کمرے میں کوئی نہیں تھا' جو تمہاری بات کا جواب دیتا۔

''وہ باتھ روم میں ہے۔'' بے حد مجبور ہو کر میں نے جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ سن کر تم لوٹ جاؤ گے' اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرو گے' لیکن تم ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے اندر آ کر میرے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں بے نیازی سے اپنا کام کرتی رہی' لیکن یہ احساس کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو' مجھے گڑبڑا رہا تھا۔

''اس دن آپ زخمی ہو گئیں۔ مجھے افسوس ہے۔'' تم نے رک رک کر مدھم لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر تمہیں دیکھا۔ کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو یا کوئی اور بات جتانے کی کوشش کر رہے ہو' مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا' اور میں پھر خاموشی سے بریف کیس پر جھک گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا یہ کہنے سے کہ تمہیں افسوس ہوا' میری پیشانی کا یہ داغ مٹ سکتا ہے۔ میں نے لاشعوری طور پر زخم کے نشان کو چھوا۔ یا میں ان باتوں کو بھول سکتی ہوں' جو تم نے کیں۔ میں نے بے حد خاموشی سے سوچا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اٹھ کر چلی جاؤں' کیونکہ نوید اتنی دور جا رہا ہے' اور میں یہ تھوڑا سا وقت بہرحال اس کی معیت میں گزارنا چاہتی ہوں۔ رہے تم' تو مجھے تمہاری موجودگی میں بہرصورت برداشت کرنی ہے۔ میں نے بریف کیس بند کرتے ہوئے تمہاری طرف دیکھا' اور اٹھ کر دریچے میں کھڑی ہو گئی۔

"کمال ہے یعنی کہ دو شخص کمرے میں موجود ہیں' اور پھر بھی اس قدر خاموشی' حد ہو گئی۔" نوید نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ میں چپکے سے باہر جانے لگی کہ جانے اب وہ کیا بک دے۔

"یہ کیا حماقت ہے؟"

نوید نے میری راہ روکتے ہوئے کہا۔ "یعنی یہ آپ کہاں چل دیں۔ ارے ہم تو دو گھڑی کے آئی ایم سوری' دو دن کے مہمان ہیں۔ کیا خبر پھر کبھی دوبارہ ملیں یا نہ ملیں۔ غنیمت جانو ان چند گھڑیوں کو اور۔"

"ویدی تم ایسی باتیں کرو گے تو میں رونے لگوں گی۔" میں روہانسی ہونے لگی۔

"نہ نہ رونے کا پروگرام نہ بناؤ۔ بس چپکی بیٹھی رہو۔" ویدی نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

اس کی بات مانے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میرا جی بھی اس کے پاس سے جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں آپ دونوں کا تعارف کرا دوں۔" تمہارے ساتھ باتیں کرتے کرتے دفعتاً نوید نے کہا۔

"تعارف...... کس کا تعارف؟" تم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"تمہارا اور نیل کا تعارف۔ آخر تم دونوں یہ اجنبیوں کی طرح کیوں بیٹھے ہو؟"

"اوہ!" تم کچھ خفیف سے ہو گئے۔ میں مارے بوکھلاہٹ کے کھڑی ہو گئی۔

"برا نہ ماننا وقار میں ہوں ذرا صاف گو قسم کا آدمی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم

دونوں نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے آخر۔ کیا اتنا عرصہ اس حد درجہ تکلف کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں؟ کس قدر کوفت ہوتی ہے مجھے۔ یعنی تم دونوں جو مجھے اس قدر عزیز ہو' میری اتنی ذرا سی خواہش پوری نہیں کر سکتے کہ اس تکلیف دہ غیریت اور خوامخواہ کے تکلف کو ختم کرو۔"

نوید کے الفاظ میں کسی قسم کی فہمائش نہ تھی' بلکہ مخصوص قسم کی بے تکلفی اور خلوص تھا' کس قدر سادگی سے وہ تمہاری بدمزاجی اور اکڑپن کو تکلف کا نام دے رہا تھا۔

"مگر ویدی......" میں نے اُس کی زیادتی پر احتجاج کے لئے منہ کھولا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔" نوید نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "اگر تم دونوں کو میرا ذرا سا بھی پاس ہے تو اس خوامخواہ کے تکلف کو ختم کرو۔ جانے سے پہلے میری تم دونوں سے یہ آخری درخواست ہے۔"

تم نوید کے لب و لہجے سے متاثر ہو کر اُٹھے اور میرے قریب آ کر رُک گئے۔

"مس شہنیلہ ہو سکتا ہے آپ نے بھی نوید کی طرح میرے رویے کو محسوس کیا ہو۔ حالانکہ میں فطرتاً کم گو واقع ہوا ہوں۔" تم تھوڑا سا میرے قریب جھکے' شائستگی سے کہہ رہے تھے۔ کم گوئی اور تنہائی پسندی کی عادت نے مجھے اخلاق ضابطوں سے کچھ دور کر دیا ہے اور میں اکثر بداخلاقی کا مرتکب ہو جاتا ہوں۔ خیر میں معذرت کے طور پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ خیال رکھوں گا۔"

میں نے تمہارے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور تمہاری آنکھوں کو جو نرم نرم تاثر لئے مجھے تک رہی تھیں' اور میرے ذہن میں تمہاری قہر برساتی آنکھیں چمکنے لگیں' اور مجھے تمہارا درشت لب و لہجہ یاد آ گیا۔ اور وہ تمہارے توہین آمیز الفاظ۔

"جب انسان اپنی کسی غلطی کو تسلیم کر لے تو دوسروں کو چاہئے کہ وہ اس کی معذرت کو فراخدلی سے قبول کر لے۔" تم نے میری آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا تم اس طرح اپنے پچھلے رویئے کی تلافی کرنا چاہتے ہو یا واقعی تمہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا ہے؟ یا پھر محض تم نوید کی خواہش کا احترام کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا' لیکن نوید میرا دوست' میرا بھائی نامعلوم مدت کے لئے جا رہا تھا' اور یہ اس کی خوشی تھی۔ میں نے نوید کا دل رکھنے کے لئے تمہارا ہاتھ پل بھر کے لئے تھام لیا' اور مجھے لگا جیسے بہت سی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بجلیاں ہاتھوں سے ہوتی ہوئیں سارے جسم میں کوندنے لگی ہوں۔ گھبرا کر میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"گڈ اب ہوئی نا بات۔ چلو اسی خوشی میں بینا سے چائے پیتے ہیں۔"

"کس خوشی میں ویدی بھیا۔" بینا نے پردہ اٹھا کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اس خوشی میں کہ میری باہر جانے کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے' اور تم جیسی جھگڑالو بہن سے پیچھا چھوٹ رہا ہے۔" نوید نے چھیڑا۔

"مگر بینا خلاف عادت نوید سے اُلجھنے کے بجائے خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

✹✦✹

نوید جاتے وقت بہت اداس ہو رہا تھا' لیکن وہ اپنی اداسی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بینا اور آنٹی رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ خود میں صبح سے کئی بار چھپ چھپ کر رو چکی تھی۔ ویدی سے ملتے وقت باوجود ضبط کے میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

"ارے یہ رو کیوں رہی ہو' کوئی تمہاری رخصتی تو نہیں ہو رہی؟" نوید نے مجھے ہنسانے کے لئے کہا' لیکن ہنسنے کے بجائے مجھے رونا آ گیا۔

"پلیز نیلی۔" اس نے میرے ہاتھ تھام لئے۔ "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ہنستے چہرے سے الوداع کہو۔ تاکہ میرے تصور میں ہنستے مسکراتے چہرے آئیں' روتے بسورتے نہیں۔"

میں نے آنکھیں پونچھ لیں۔ بینا اور آنٹی بھی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ جاتے جاتے وہ ایک دم پلٹ آیا۔

"ہاں بے بی بات سن۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "جب میں آؤں گا نا تو تمہارے لئے ایک بڑا خوبصورت' بے حد سمارٹ دولہا بھی لے کر آؤں گا۔" ویدی نے اس طرح کہا' جیسے کوئی کسی ننھے بچے کو ٹافیوں یا کھلونوں کا لالچ دیتا ہے۔

"اپنے پاس سنبھال کر رکھو اپنے دولہا کو۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "مجھے نہیں ضرورت کسی دولہا کی۔"

"میرا دولہا۔" ویدی نے قہقہہ لگایا۔ "یہ بھی خوب کہی ارے بھئی میرا نہیں وہ سو فیصدی تمہارا ہوگا۔ ہاں البتہ میرے لئے ایک پیاری سی دلہن تلاش کر کے رکھنا۔ بالکل اپنے جیسی۔"

"ہوں..... منہ دھو رکھو۔" میں نے چڑایا۔

"ہاں ہاں منہ دھو کر اور سہرا باندھ کر ہی آئیں گے اپنی دلہن کو لینے۔ بس شرط یہ ہے کہ تم اسے ڈھونڈ رکھنا۔"

"پرویدی' یہ جو تمہارے کرتوت ہیں نا تو کوئی پاگل ہی تمہیں اپنی لڑکی دے گا۔"

"یہ پاگل پن تو خود تمہارے ابا حضور سے سرزد ہو جاتا' جو آنٹی نے مجھے دودھ پلانے کی حماقت نہ کی ہوتی۔" ویدی نے انتہائی بدتمیزی سے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"ویسے سچ پوچھو تو اب بھی میری نیت کبھی کبھی خراب ہونے لگتی ہے۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ میں ایک دم بلش ہو گئی۔

"بکومت' بہت بے شرم ہو تم۔"

"ویسے میں تو مذاق کر رہا تھا' مگر تم کس خوشی میں شرما رہی ہو؟ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔"

"ہوں تمہارے متعلق ہی خوش فہمی میں مبتلا ہونا ہے نا۔" میں نے منہ بنایا۔ اسی وقت جہاز کی روانگی کا اعلان ہونے لگا۔ نوید خدا حافظ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سیڑھی ہٹا لی گئی اور جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا بلند ہونے لگا۔ جب تک جہاز نظر آتا رہا ہم ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے' پھر بوجھل دلوں کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔

✹✦✹

نوید کے جانے کے بعد دن بہت اداس' بڑے ویران ویران گزرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں بڑی کمی آ گئی ہو' جیسے بہت کچھ کھو گیا ہو۔ قدم قدم پر ویدی یاد آتا' لگتا تھا ویدی کے بنا دن بتائے نہ بیتیں گے' مگر دن ہولے ہولے بیتتے رہے۔ ویدی بڑی باقاعدگی سے خط لکھتا۔ اس کے خطوط اس قدر دلچسپ اور رنگا رنگ باتوں سے بھرے ہوتے کہ کچھ دیر کے لئے اس کی دوری کا احساس جاتا رہتا۔

اس دن بھی ویدی کا خط آیا تھا۔ میں بینا دونوں پڑھ پڑھ کر ہنستی رہیں' پھر بہت دیر تک ویدی کا ذکر ہوتا رہا۔ بینا نے بتایا کہ اس نے ایک پیاری سی لڑکی ویدی کے لئے دیکھی ہے' مگر اصل بات تو ویدی کی اپنی پسند کی ہے۔ وہ اتنی بہت سی لڑکیوں سے ملتا رہتا ہے' کیا خبر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی اور کو پسند کرتا ہو۔"

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ویدی کو خط لکھ کر اس کی مرضی پوچھ لو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر ویدی خود لڑکی دیکھے بنا مانے گا نہیں۔"

"تو پھر چھوڑو اس معاملے کو۔ جب ویدی آئے گا' تب دیکھا جائے گا۔" میں نے لاپروائی سے کہا۔

"پر نیل تم ذرا اس کے دل کا حال تو معلوم کرو۔ کہیں کسی کو دل ول نہ دے بیٹھا ہو۔" بینا نے تشویش سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے لڑکی تمہیں کچھ زیادہ ہی پسند آ گئی ہے۔" میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔" بینا بھی ہنس پڑی۔

"اللہ نیل تم اس کو دیکھو تو دیکھتی ہی رہ جاؤ۔ اتنی معصوم سی ہے' اتنی پیاری کہ بس۔"

"اللہ اسے تمہاری بھابی بننا نصیب کرے۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

"آمین۔" بینا نے صدقِ دل سے کہا۔

"ویسے بینا کچھ اتا پتا تو بتاؤ صاحبزادی کا' کیا نام ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔"

"نام تو ہے مریم' فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہے۔ باقی تفصیلات کا جائزہ تم ابھی میرے ساتھ چل کر لے لو۔"

"تو گویا ابھی چلوں۔" میں نے تنقیدی نظر سے اپنا جائزہ لیا۔

"اور کیا ناک نقشہ' صورت سیرت سب دیکھ لینا۔"

"ہوں تجویز تو معقول ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"مگر تم تیار ہونے میں بہت وقت لگاؤ گی اور میں نے...... عالیہ کے ہاں بھی جانا ہے۔"

"نہیں بھئی نہیں لگاؤں گی دیر' بس ابھی گئی اور ابھی آئی۔" بینا نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔

میں مسکراتے ہوئے ویدی کے متعلق سوچنے لگی۔ یہ سچ ہے کہ ویدی کے حلقہ احباب میں لڑکیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ پھر بھی میرے خیال میں ویدی کے دل میں کسی کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہ تھا' جو اس کی آنکھوں میں سپنا بن کر ابھرتا۔ اللہ ویدی یہاں ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔ ہم سب مل کر لڑکی دیکھنے جاتے' پھر ویدی کو کتنا چھیڑتے۔ میں سوچ گئی' تب ہی فون کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ میں نے چونک کر بینا کو پکارا۔

"بھئی نیل میں ادھر مصروف ہوں تم ذرا کال ریسیو کر لو۔" بینا نے کمرے میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو میں عالم وِلا سے بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کسی اجنبی آواز نے بڑی جلدی میں کہا۔

"عالم وِلا...... مگر آپ کون ہیں؟"

"میں سجاد ہوں' وقار صاحب کا سیکرٹری۔ وقار صاحب زخمی ہو گئے ہیں اور۔"

"زخمی ہو گئے ہیں؟ کیسے......؟ کب......؟" ریسیور میرے ہاتھ میں کانپنے لگا۔

"کل شام رائیڈنگ کے لئے گئے تھے' گھوڑے سے گر گئے۔"

"اور تم اب اطلاع دے رہے ہو۔"

"وقار صاحب نے منع کر دیا تھا۔ اب بھی میں ان کی اجازت کے بغیر فون کر رہا ہوں۔ ایسی حالت میں ان کے پاس کوئی اپنا تو ہونا چاہئے۔"

"کیا زیادہ زخمی ہیں؟ کون سے ہسپتال میں ہیں؟ کمرہ نمبر بتائیے جلدی۔" میں نے بے حد عجلت میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"پہلے ہسپتال میں تھے' مگر اب ضد کر کے گھر آ گئے ہیں اور۔"

میں نے پوری بات سنے بغیر ریسیور رکھ دیا' اور بینا کی طرف بھاگی۔ تھوڑی دیر بعد بینا اور آنٹی کے ساتھ عالم وِلا جا رہی تھی' اور میرا دل بے تحاشا کانپے جا رہا تھا۔ اس وقت اس شخص کے متعلق میرے دل میں کوئی رنجش نہ تھی' جو خوامخواہ ہی میرا دشمن بنا بیٹھا تھا' اور بات بے بات بگڑ اٹھتا تھا' بلکہ اس اجڈ شخص کی سلامتی کے لئے میرے ہونٹوں پر خاموش دعائیں تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عالم وِلا کے گیٹ پر سیکرٹری سجاد علی سے سامنا ہو گیا۔ اس نے پوچھنے پر بتایا کہ وقار کی حالت زیادہ تشویشناک تو نہیں' مگر انہوں نے خاصا اودھم مچا رکھا ہے' نہ دوا لیتے ہیں' نہ کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ زیادہ کہا جائے تو ڈانٹ کر کمرے سے باہر نکال دیتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے سوپ بھجوایا تھا تو پیالے سمیت کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ نوکروں کی تو شامت آئی ہوئی ہے۔ ایک نرس تو گھنٹہ بھر بعد ہی گھبرا کر بھاگ گئی کہ مجھ سے ایسا مریض نہیں سنبھالا جاتا۔ اب دوسری آئی ہے' مگر یہ بھی سخت تنگ آئی ہوئی ہے۔ دیکھیں کب اس کی ہمت جواب دیتی ہے۔

سجاد علی نے ایک سانس میں ہی ساری تفصیل بتا دی۔

''گھبراؤ مت بیٹے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' آنٹی نے اسے تسلی دی اور ہم سجاد کی رہنمائی میں مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے وقار کی خواب گاہ تک آ پہنچے۔ سجاد علی نے رُک کر ہمیں دیکھا۔

''یہ وقار صاحب کی خواب گاہ ہے۔'' اس نے آہستگی سے بتایا۔ ''مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ اندر نہ جا سکوں گا۔ صاحب کے موڈ کا کچھ پتا نہیں۔ ایک ابر ڈس مس کرنے کی وارننگ دے چکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' آنٹی نے کہا۔

اور ہم خواب گاہ کے بھاری پردے اُٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ تمہارے سرہانے بیٹھی نرس نے چونک کر ہمیں دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔ میری نظریں نرس پر سے ہوتی ہوئی تمہارے چہرے پر رک گئیں۔ تم زرد زرد رنگت لئے آنکھیں بند کئے پڑے تھے اور تمہاری پیشانی پر بندھی پٹی میں سے خون چھلک رہا تھا۔ میں نے ایک نظر میں تمہارا سارا جائزہ لے ڈالا۔ تمہارا بایاں بازو کہنی تک پلستر میں جکڑا ہوا تھا اور دائیں پاؤں پر بھی پلستر چڑھا تھا۔ اس وقت پٹیوں میں جکڑے ہوئے چپ چاپ پڑے تم اتنے بے بس' اتنے لاچار لگ رہے تھے کہ پتا نہیں چلتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اتنے ہنگامے بپا کر چکے ہو۔

''کیا حال ہے وقار بیٹے کا۔ زخم زیادہ خطرناک تو نہیں۔'' آنٹی نے نرس سے پوچھا۔

''ویسے تو کوئی خطرے والی بات نہیں مگر اس قسم کا مریض ہو تو بات تشویشناک ہو جاتی ہے۔'' نرس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب دیکھئے صبح سے نہ دوا پی رہے ہیں' اور نہ کوئی اور بات

مانتے ہیں۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اونچا اونچا بولتے ہیں' دیکھ لیجئے بے احتیاطی کی وجہ سے خون پٹی میں سے چھلک رہا ہے۔ ابھی ابھی سوئے ہیں تو ذرا سکون ملا ہے۔''

''چوٹ کہاں آئی ہے؟'' بینا نے پوچھا۔

''شاید بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ فی الحال تو ڈاکٹر نے پلستر کر دیا ہے۔ پاؤں پر بھی چوٹ آئی ہے' اور پیشانی کا زخم بھی کافی گہرا ہے۔'' تم کراہے...... آنٹی تم پر جھک گئیں۔

''وقار...... وقار بیٹے کیسی طبیعت ہے اب۔'' آنٹی نے تمہارا ہاتھ تھام لیا' تم نے آنکھیں کھولیں اور آنٹی کو پہچان کر مسکرائے۔

''آپ...... آپ کیوں آ گئیں۔ آپ کی پریشانی کے خیال سے تو میں نے سب کو منع کر دیا تھا کہ آپ کو اطلاع نہ دیں۔ پھر...... پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''تو تم ابھی تک ہمیں غیر سمجھتے ہو۔'' آنٹی نے خفگی سے کہا۔

''تمہاری اس بات سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے وقار۔''

''نہیں یہ بات نہیں۔'' تم نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ کے سوا میرا ہے کون؟ مگر میں نے سوچا کہ اس طرح آپ کو پریشان کرنا ٹھیک نہیں۔ جب طبیعت کچھ سنبھلتی تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔''

''حالانکہ اس حالت میں تمہیں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔'' آنٹی بدستور خفا تھیں۔

''ارے ضرورت تو مجھے آپ کی ہر حالت میں ہے۔ واقعی بڑی حماقت سرزد ہوئی مجھ سے۔ معاف کر دیں آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔''

''تو گویا آپ کا آئندہ بھی زخمی ہونے کا پروگرام ہے۔'' بینا نے بات کاٹی۔

''ارے گلو' حیدر' سجاد' بوا جلدی آؤ۔ آج بینا رانی اور ماما جانی آئی ہوئی ہیں' ان کے حضور کھڑے ہو جاؤ اور ان کی اس طرح مدارت کرو' جیسے کبھی کسی نے کسی کی نہ کی ہو۔'' بولتے بولتے تم نے اپنا سر دونوں ہاتھ میں تھام لیا' اور ہونٹ بھینچ لئے۔ آنٹی نے خفگی سے تمہیں دیکھا۔

''پاگل ہو گئے ہو تم تو۔ ایسی حالت میں اتنا چلانے کی کیا ضرورت تھی؟'' انہوں نے آہستگی سے سہارا دے کر تمہیں بستر پر لٹا دیا۔

اس اثنا میں کئی نوکر کمرے میں جمع ہو گئے تھے' تم نے انہیں واپس جانے کے لئے کہا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سجاد علی کو اپنے پاس بلا کر آہستہ سے کچھ کہا۔ سجاد نے سر خم کر لیا اور باہر چلا گیا۔

"ارے آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔ تشریف رکھیں نا۔" تم نے شاید مجھے یا بینا کو یا پھر دونوں کو کہا کیونکہ ہم بے دھیانی میں ابھی تک تمہارے بستر کے قریب کھڑے تھے۔

"ہوں...... آپ نے بیٹھنے کے لئے کہا ہی نہیں تو کیسے بیٹھتے۔" بینا نے ناک چڑھائی۔

"ویسے وقار بھائی ذرا بھی اخلاق نہیں آتا آپ کو۔"

"ارے بینا رانی یہ کسی غیر بندے کا گھر نہیں۔ تمہارے اپنے بھائی کا گھر ہے۔ جہاں مرضی ہے بیٹھو۔ جو دل چاہے کرو۔ کوئی تمہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں۔" تم نے ایک عجیب سرمستی سے کہا۔

"شکریہ بھیا جانی۔" بینا نے بے حد پیار سے کہا اور تمہارے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

میں خاموشی سے آنٹی کے قریب جا بیٹھی۔ تمہارے گھر آ کر مجھے کچھ عجب سا احساس ہو رہا تھا۔ ایک پچھتاوا سا رہ رہ کر دل میں اٹھتا۔ میں کیوں چلی آئی۔ نہیں آنا چاہئے تھا مجھے۔ یہ شخص جو مجھے ایک آنکھ نہیں دیکھنا چاہتا' جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں' کوئی تعلق نہیں' اس کے گھر ناخواندہ مہمان بن کر آنا۔ شہنیلا بی بی تم نے بڑا غلط کیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسے جا رہی تھی۔

"تو ماما جانی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ میں کئی دنوں سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا تھا' مگر پھر یہ زخم آ گئے۔ تم بتاؤ بینا کیا حال چال ہیں۔"

"فی الحال تو ہم آپ کے مزاج پوچھنے آئے ہیں۔"

"میرا حال تو...... دیکھ لو خود ہی۔ بقول شاعر سر سے پاؤں تک چور چور ہوں۔" تم دُکھ سے ہنسے۔

"واہ...... واہ وقار بھائی آپ تو شاعر بن گئے ہیں۔ کہیں کوئی چوٹ تو دل پر نہیں کھا لی۔" بینا نے جھک کر ہولے سے سرگوشی کی' تم بے ساختگی سے ہنسے۔

"میرا دل بہت مضبوط ہے بینا رانی' بے فکر رہو' آئی ایم این آئرن مین۔ (میں فولادی انسان ہوں) چوٹ لگانے والا ہاتھ پکڑ کر روئے گا۔"

"تم گھر کیوں چلے آئے ہاسپٹل سے۔" آنٹی نے پوچھا۔

"وحشت ہوتی تھی مجھے وہاں کے ماحول سے۔ سارے احساسات سے عاری اجنبی چہروں کے درمیان بستر پر لیٹے لیٹے کسی انہونی کا انتظار کیے جانا کس قدر اذیت ناک ہے۔ پھر جب معلوم بھی نہ ہو' سمجھ میں ہی نہ آئے کہ یہ بے نام سا انتظار کس کا ہے' بس بستر پر پڑے پڑے کسی نامعلوم سی بات کا انتظار کیے جاؤ۔ تو پتا نہیں کیسا محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سارے اعصاب تن کر ٹوٹنے لگے ہوں۔ ایک عجیب سا ڈپریشن ذہن پر اپنے خوفناک پنجے گاڑ دیتا ہے' اور بار بار ناخن چبھوتا ہے۔ پھر کوئی نہ کوئی ناگوار' تلخ یاد کسی نہ کسی کونے کھدرے سے اچھل کر باہر آ جاتی ہے اور' میرے منہ کا مزا کڑوا ہونے لگتا ہے' اور میں...... اور میں۔"

تم کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولتے بولتے ایک دم رُک گئے' اور تم نے یوں چونک کر آنٹی کو دیکھا' جیسے ابھی ابھی تم ان کی کمرے میں موجودگی سے باخبر ہوئے ہو۔

"اوہ ماما جانی! پتا نہیں میں کیا کہہ رہا تھا۔ بس یہ سمجھ لیجئے میں ان مانوس در و دیوار کا اسیر ہوں۔ کہیں اور میرا دل نہیں لگتا۔ میں تو یہاں چپ چاپ پڑے رہنا چاہتا تھا' مگر یہ سجاد علی ہاتھ پاؤں جوڑنے لگا۔ بہت ڈانٹا ڈپٹا' منع کیا' مگر پھر بھی یہ نرس کو لے آیا۔"

"تو اور کیا کرتا وہ۔ ایک تو ہاسپٹل سے بھاگ آئے' پھر ایسے نادر شاہی حکم چلاتے ہو۔ اگر زخم بگڑ گئے تو۔"

"کچھ نہیں ہوگا ماما جانی۔ میں بہت سخت جان ہوں۔ دیکھ لیجئے گا لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

تب ہی نوکر ٹرالی دھکیلتا اندر آ گیا۔ ٹرالی کھانے پینے کی مختلف چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔

"چلو بیٹا اٹھو اور اچھی سی چائے بنا کر مجھے بھی دو اور خود بھی پیو' اور دیکھو تکلف بالکل نہیں چلے گا۔" تم نے بینا سے کہا۔

"ارے واہ وقار بھائی میں نے تکلف کر کے کوئی اپنے ساتھ ناانصافی کرنی ہے۔" بینا اُٹھ کر چائے بنانے لگی۔

"ویسے کھانے پینے کے معاملے میں تکلف کرنا بھی نہیں چاہئے۔ آدمی گھاٹے میں رہتا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بس تم پھر یہ گھاٹے کا سودا نہ کرنا۔" تم نے مسکرا کر مشورہ دیا۔

"بیٹے تم نے بھی صبح سے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں۔" آنٹی نے پوچھا۔

جو نوکر ٹرالی لے کر آیا تھا وہ واپس جاتے جاتے پلٹ پڑا۔

"بیگم صاحبہ! صاحب نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ کہیں تو اُن کے لئے کچھ لے آؤں۔"

"ہاں ہاں لے آؤ۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں کھاتا۔" آنٹی نے خفگی سے تمہیں دیکھا۔

"ایک تو زخمی ہو کر بستر پر پڑے ہو۔ اوپر سے یہ بھوک ہڑتال' نوکر بے چارے بھی پریشان ہیں۔"

"اصل میں ماما جانی! کچھ دل ہی نہیں چاہتا کھانے کو۔"

"اچھا" بینا نے چائے کا کپ تمہیں دیتے ہوئے پوچھا۔

"پھر آپ کا کیا دل چاہتا ہے وقار بھائی؟"

"میرا دل۔" تم نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں کیا کیا چاہتا ہے یہ ناداں۔"

ملازم تمہارے لئے کھانا لے آیا۔ تم نے ذرا سا کھایا' ایک چمچ جیلی کا لیا اور کھانا ایک طرف ہٹا دیا۔

"ارے یہ سوپ تو پی ڈالو۔" آنٹی نے اصرار کیا۔

"نہیں اس میں عجیب ناگوار سی مہک آ رہی ہے۔" تم نے منہ بنایا۔

آنٹی نے سوپ اٹھا کر دیکھا' پھر کپ رکھ دیا۔

"بینا جاؤ بیٹی بھائی کے لئے خود سوپ بناؤ۔ معلوم ہوتا ہے یہ جل گیا ہے۔"

"ارے نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔" تم بوکھلا کر اُٹھ بیٹھے۔

"ضرورت ہے یا نہیں' تم بس سے چپکے پڑے رہو۔" آنٹی نے پیار سے ڈانٹا۔ ایک دم تمہاری آنکھیں نم ہو گئیں' جنہیں چھپانے کے لئے تم نے آنکھیں بند کر لیں۔

"چلو نیل! اسی بہانے اس کوٹھی کی سیر کر لیں۔" بینا نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اٹھ کر اس کے چل دی۔ بینا سوپ بنانے لگی۔ میں بوا سے باتیں کرنے لگی۔

"یہ تمہارے صاحب جی کیسے ہیں بوا؟"

"بٹی صاحب جی کی بات کیا کرتی ہو۔ آدمی کے روپ میں فرشتہ ہیں۔"

"ارے فرشتے ایسے ہوتے ہیں۔" مجھے ہنسی آنے لگی۔ "اتنے سخت' اکھڑ اور کرخت مزاج۔ بُوا سنا ہے نوکروں کو بھی بہت ڈانٹتے' ڈپٹتے ہیں۔" میں نے کریدا۔

"ڈانٹتے ہیں تو کیا ہوا۔ نوازتے بھی تو بہت ہیں۔" بُوا بُرا مان گئیں' میں چپ سی ہو گئی۔

"بٹی میں نے چھوٹے صاحب کو بچپن سے پالا ہے۔ ایسے بھلے مانس آدمی دنیا میں کم ہوتے ہیں۔ مگر سب نے اس کو اوپر اوپر سے ہی دیکھا۔ کسی نے اس کے اندر نہ جھانکا۔ اس کا باطن نہ دیکھا۔" بُوا آنسو پونچھنے لگی۔

"بُوا آپ رونے کیوں لگیں۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے اس بچے کا دکھ مجھے قبر میں بھی چین نہ لینے دے گا۔ کیسے اکیلا اکیلا اور دکھی ہو گیا ہے میرا بیٹا۔ اسے بے قرار دیکھ کر دل جلتا ہے۔"

"مگر بُوا۔"

"بٹی تُو حیران نہ ہو۔" وقار میاں کو میں نے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ اس سے مجھے اتنی ہی محبت ہے' جتنی سگے بیٹے سے ہو سکتی ہے۔ ارے تُو کیا جانے جب میرا عابی گیا تو میں کیسا کیسا تڑپی' کتنا کتنا روئی' پھر جب ملازمت کی تلاش میں بڑے صاحب جی کے پاس آئی' تو صاحب جی نے چھوٹے صاحب کو میری جھولی میں ڈال دیا' کہ اس کی ماں نہیں ہے۔ بیٹا سمجھ کر پالنا' اور مجھے یوں لگا جیسے میرا عابی جی اٹھا ہوا۔ زندہ ہو گیا ہو۔ تب ہی میں نے سوچ لیا کہ اب اس چوکھٹ کو کبھی نہیں چھوڑنا؟" بُوا ماضی کی راکھ کرید رہی تھیں۔

"تو بٹی اُس دن سے میں نے وقار میاں کو اپنا بیٹا سمجھ لیا۔"

"بھئی اگر انکوائری ختم ہو چکی ہو تو چلو ذرا کوٹھی کا ایک چکر لگائیں۔" بینا نے پکارا۔

"چلو۔" میں کھڑی ہو گئی۔

"دیکھو سوپ کا خیال رکھنا' اور وقار بھائی کے لئے جو چیز بھی بناؤ' نا ذرا دھیان سے بنایا کرو۔" اس نے جاتے جاتے خانساماں کو تنبیہ کی' پھر ہم اس دو کنال پر بنی وسیع و عریض شاندار کوٹھی میں گھومتے پھرے۔ وال ٹو وال قالین' قیمتی فرنیچر سے ڈیکوریٹ کمرے' پھر گیلری میں خاندان بھر کے بزرگوں کی قد آدم تصاویر' جن میں سب سے نمایاں وقار کے پاپا تھے۔ جا بجا آرٹ کے نادر نایاب نمونے پتھر کے مجسموں کی شکل میں موجود تھے۔ کوٹھی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پچھلے حصے میں بے حد شاندار باغ تھا' اور باغ کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت حوض تھا جہاں ایک عورت کا مجسمہ موتی اچھال رہا تھا' وہاں ایکوریم بھی تھا۔ جہاں شیشے کے پیچھے رنگ برنگی چمکتی دمکتی مچھلیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ باغ سے گھومتے ہوئے ہم گیٹ تک پہنچ گئے۔ گیٹ پر دو سنتری سفید یونیفارم اور عالم وِلا کا مخصوص مونوگرام لگائے پتھر کے بت کی طرح ایستادہ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں بھی تھیں۔ واپس آتے ہوئے میں نے دیکھا برآمدے کی سیڑھیوں پر بھی دونوں طرف دو قد آدم مجسمے ایستادہ تھے۔

''میرے خدا...... اس شخص نے تو پتھروں کا ایک پورا شہر بسا رکھا ہے' اور پتھروں کے بیچ میں رہتے رہتے یہ شخص خود بھی پتھر ہو گیا ہے۔ ہم ایک بار پھر تمہاری خواب گاہ تک آ پہنچے۔ میں نے پردہ اٹھا کر اندر قدم رکھا' تب ہی بینا نے پیچھے سے آواز دی۔

''سنیل میں ابھی آئی ایک منٹ میں' ذرا سوپ دیکھ آؤں۔'' پل بھر کے لئے دروازے کے پاس ہی ٹھٹک گئی۔ مگر اب واپس جانا مناسب نہ تھا کہ تم مجھے دیکھ چکے تھے۔ نرس میز کے قریب کھڑی انجکشن تیار کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے آنٹی کو ڈھونڈنا چاہا' مگر آنٹی کمرے میں نہ تھیں۔ میں کچھ گھبرا سی گئی۔

''شہنیلا ادھر آئیں۔ میری بات سنیں۔'' تمہاری بھاری خوبصورت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''جی۔'' میں چونک کر گھبرائی گھبرائی سی تمہارے قریب آ گئی۔

''بیٹھ جائیں پلیز۔'' تم نے اتنی نرمی سے کہا کہ میں حیران سی تمہیں دیکھنے لگی۔

''شہنیلا آپ...... آپ مکافات عمل کی قائل ہیں؟''

''جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔'' میں بہت نروس ہو رہی تھی۔

''اس دن میں نے انجانے میں آپ کو زخمی کر دیا تھا۔''

تمہاری آنکھوں میں نرم نرم جذبات کا عکس تھا' اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ' مسکراتے ہوئے تم کس قدر اچھے لگتے ہو۔ میں نے تمہاری طرف دیکھتے ہوئے سوچا' مگر یہ مسکراہٹ تو تمہارے ہونٹوں کے لئے اجنبی ہو گئی ہے۔ گاہے گاہے عید کے چاند کی طرح چمکتی ہے' اور پھر ایک لمبے عرصے کے لئے غائب ہو جاتی ہے' اور تم یوں ہی مسکراتے رہو تو۔

''دیکھ لیجئے میری پیشانی پر غالباً اسی جگہ چوٹ آئی ہے۔ یعنی مجھے میرے کیے کی سزا

مل گئی ہے۔'' تم نے پیشانی پر بندھی پٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اب تو آپ خوش ہیں۔''

''خوش...... ؟ میں کسی کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہیں ہوتی۔''

''مگر میں...... میں تو بہت برا ہوں۔'' تم نے بے چینی سے کہا۔

''کوئی شخص بذاتِ خود برا نہیں ہوتا۔ یہ سب حالات کی کرم فرمائی ہوتی ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اور پھر نفرت تو برائی سے کرنی چاہیے نہ کہ برائی کرنے والے سے۔'' تم گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''لیکن میں تو...... میں تو آپ سے نفرت کرتا ہوں۔'' تمہارے چہرے پر کرختگی چھا گئی۔

''وہ آپ کا اپنا فعل ہے۔'' تھوڑی دیر ٹھٹک کر چپ رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''تاہم اس کا کوئی نہ کوئی جواز تو ہو گا آپ کے پاس۔''

''میں متجسس نظروں سے تمہیں دیکھنے لگی۔ دل دھڑک رہا تھا کہ شاید آج بھید کھل جائے۔ وہ بھید جو میرے لئے چیلنج بنا ہوا ہے' اور ذہنی اُلجھن بن گیا ہے۔

مگر تم چپ چاپ بیٹھے اپنے سامنے تکتے رہے۔ تب ہی نرس انجکشن لگانے کے لئے قریب آ گئی اور میں پیچھے ہٹ کر آنٹی کو دیکھنے لگی' جو کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

''آنٹی آپ کہاں چلی گئی تھیں؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''نماز پڑھ رہی تھی۔'' آنٹی نے بتایا۔

پھر بینا بھی آ گئی' اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ شام تک ہم وہیں رہے۔ آنٹی تو وہیں رہنا چاہتی تھیں مگر تم نے انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ تمہارا سیکرٹری ہمیں گاڑی تک چھوڑنے آیا' اس کے ہاتھ میں کچھ پیکٹ تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''یہ وقار صاحب کی طرف سے آپ سب کے لئے۔'' اس نے مؤدب ہو کر بتایا۔

''بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''وقار صاحب کا حکم تھا کہ آپ خالی ہاتھ نہ جائیں۔''

گھر جا کر پیکٹ کیے ہوئے ڈبے کھولے تو ان میں تین عدد انتہائی نفیس' خوبصورت اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیمتی ساڑھیاں تھیں۔

"لو بھئی یہ ساڑھی سنبھالو۔ اپنے حصے کی۔" بینا نے ایک ساڑھی اٹھا کر مجھے دی۔

"نہ میں کا ہے کو لوں۔ تمہارے بھائی ہیں تم ہی سنبھالو۔"

"ارے بھئی انہوں نے تمہیں دی ہے اور......" میں اٹھ کر گھر چلی آئی۔

دوسرے دن بینا صبح صبح آئی۔

"چلو بھئی' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ عالم وِلا کے لئے۔"

"میں تو نہیں جا رہی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے۔ یہ نخرے کیوں دکھا رہی ہو۔" بینا کو غصہ آ گیا۔

"ہونا کیا ہے مگر روز روز میرا جانا کیا ضروری ہے۔"

"دیکھو تمہیں جانا پڑے گا۔ امی کو پھوپھو نے بلا بھیجا ہے۔ اور وہ ادھر سے ہی چلی جائیں گی' میں اکیلی ہوں۔"

"تم کسی نوکر کو ساتھ لے جاؤ۔"

"ٹھیک ہے پھر تم ساری زندگی مجھ سے بولنا نہیں۔" بینا خفا ہو گئی۔

"تم ایک غیر بندے کے لئے مجھ سے روٹھ جاؤ گی۔ میں جو تمہاری بچپن کی دوست اور کزن ہوں۔"

"غیر بندہ۔" بینا نے آنکھیں دکھائیں۔ "امی نے اسے بیٹا بنا رکھا ہے۔ میرا بھائی ہے وہ۔ اس ناتے بھی تمہیں جانا چاہئے۔"

"جاؤ بھئی' میری جان چھوڑو۔ ایسی فالتو نہیں ہوں میں۔"

"اللہ کرے مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے راستے میں' پھر تم ساری عمر پچھتانا۔" بینا روہانسی ہو کر جانے لگی۔

"بھئی تم تو زیادہ ہی جذباتی ہو گئیں۔ اچھا ایک شرط پر میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"بکو بھی۔"

"آئندہ تم مجھے مجبور نہیں کرو گی۔" میں سنجیدہ ہو گئی۔ "ہاں آج تم اکیلی ہو اس لئے۔"

"شکریہ تمہاری اس مہربانی کا۔" بینا اب بھی خفا تھی۔

عالم وِلا پہنچے ہی تھے کہ آنٹی بھی آ گئیں' اور ہم اکٹھے ہی گیٹ میں داخل ہوئے۔ وہاں عجیب سی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

"آج تو وقار صاحب بہت جلال میں ہیں۔ دوا کی ساری شیشیاں توڑ ڈالی ہیں' اور نرس کو نکال باہر کیا۔" سجاد علی نے بتایا۔

"تم نے سمجھایا نہیں۔" آنٹی نے پوچھا۔

"میں نے منت سماجت کی تو مجھے بھی کمرے سے باہر نکال دیا۔" سجاد نے بے بسی سے کہا۔ "رات ان کی حالت بہت خراب رہی۔ نرس بتا رہی تھی کہ کافی ہذیان بکتے رہے۔ بخار بھی بہت تیز ہے۔"

"اچھا میں دیکھتی ہوں۔" آنٹی نے کہا۔

میں تمہارے عجیب و غریب رویئے کے متعلق سوچنے لگی۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ دوا کی شیشیاں توڑ کر پھینک دینا' دوا پینے سے انکار کرنا' کھانا نہ کھانا' نوکروں کو ڈانٹ پھٹکار کرنا' اور ایک ہنگامہ بپا کئے رکھنا۔ کسی ضدی بچے کی طرح جو اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتا ہے۔ اپنے سارے کھلونے توڑ پھوڑ ڈالتا ہے اور بعض اوقات اس غصے میں اپنے آپ کو بھی زخمی کر لیتا ہے۔ وہ ضدی مگر حساس بچہ جو ذرا سی بے توجہی بھی برداشت نہیں کر سکتا' اور اس بے توجہی کا بدلہ اکثر اپنے آپ سے لیتا ہے۔ میں نے بغور دیکھا۔ تم آنکھوں پر بازو رکھے لیٹے تھے۔ ضدی مگر بگڑے ہوئے بچے کی طرح روٹھے روٹھے سے۔ بے حد اکیلے' بہت اداس' ایک دم مجھے اس پر ڈھیر سارا ترس آ گیا۔

نوکروں کے اس ہجوم میں تم کتنے تنہا تھے۔

"کیا تم اپنی ذات سے کوئی انتقام لے رہے ہو؟" میں تمہیں دیکھتی اور سوچتی رہی۔

"وقار بیٹے۔" آنٹی نے ہولے سے تمہیں پکارا۔

تم نے چونک کر آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ تمہاری آنکھوں میں عجیب سا کرب جھلک رہا تھا۔ پتا نہیں وہ احساسِ تنہائی تھا' یا احساسِ محرومی' جو سرخ سرخ ڈوروں کی صورت میں نمایاں تھا۔ آنٹی کو دیکھ کر تم نے مسکرانے کی کوشش کی۔ تمہاری غم آلودہ مسکراہٹ میں عجیب سی نرماہٹ تھی۔

"یہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ کیوں سپوئل کر رہے ہو اپنے آپ کو۔ اتنا تیز بخار'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتنے زخمی ہو پھر بھی نرس کو نکال باہر کیا۔"

تم چپ چاپ ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتے رہے' اور اپنی جلتی سرخ آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھتے رہے۔

"اب میں خود یہاں رہوں گی۔ دیکھوں گی کیسے تم کچھ کھاتے پیتے نہیں' دوا نہیں لیتے۔"

"نہیں ماما جانی۔ آپ تکلیف نہ کریں میں۔"

"ماما جانی بھی کہتے ہو' اور ایسی باتیں بھی کرتے ہو۔ تمہاری دیکھ بھال کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوگی؟" آنٹی برا مان گئیں۔

ملازم پھلوں کا جوس لے کر آ گیا۔ تم نے بغیر کچھ کہے گلاس منہ سے لگا لیا' پھر سجاد علی سے کہہ کر آنٹی نے نرس کو دوبارہ بلوایا۔ اس سے وقار کے رویئے کی معذرت کی' اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب اگر وقار کوئی بدتمیزی کرے تو مجھے بتانا' میں خود اس کے کان کھینچوں گی۔

تم چپ چاپ سنتے رہے' پھر تم نے دوا بھی لے لی اور انجکشن بھی لگوا لیا۔

"بات یہ ہے کہ ان ملازموں نے تمہاری ہر بات مان کر تمہیں بہت بگاڑ دیا ہے۔ تمہارے سر پر کوئی ایسا آدمی ہونا چاہئے' جو تمہیں روک سکے اور منع کر سکے۔" آنٹی نے کہا' اور تم جانتے ہو تم مجھے ویدی کی طرح ہی عزیز ہو۔" آنٹی نے کہا۔

"مجھے آپ کی محبت کا احساس ہے ماما جانی۔" وقار نے آہستہ سے کہا' اور آنکھیں بند کر لیں۔

پھر نرس کے کہنے پر ہم تمہاری خواب گاہ سے ڈرائنگ روم میں آ گئے' کیونکہ تمہیں زیادہ سے زیادہ ریسٹ کی ضرورت تھی' اور تم رات بھر سوئے نہیں تھے۔

شام کو تمہاری حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ آنکھوں کی سرخی بھی کم پڑ گئی تھی اور تمہارا رویہ بھی خاصا نرم تھا۔ بینا نے تمہارے لئے پورج اور یخنی بنائی تھی' جو تم نے بڑے شوق سے کھائی۔ کافی دیر تک تم باتیں کرتے رہے' پھر تھک کر لیٹ گئے تو میں اور بینا واپس چلی آئی۔ آنٹی وہیں رہ گئیں۔

پھر کئی دن گزر گئے بینا کے کہنے کے باوجود بھی میں عالم ولا نہ گئی۔ آنٹی اُدھر ہی تھیں' اور کبھی کبھی بینا بھی اُدھر ہی رہ جاتی۔ میں سارا سارا دن اکیلے کمروں میں بولائی بولائی

پھرتی۔ اس تنہائی میں ویدی مجھے اکثر یاد آتا۔ کئی دفعہ میں اسے یاد کر کے رو بھی پڑی۔ اس دن بھی جب بینا عالم ولا جانے کے لئے تیار کھڑی تھی' میری طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"بینا پیاری' کیا فرق پڑتا ہے۔ آنٹی تو وہاں ہیں ہی تم آج نہ جاؤ۔"

"اگر وقار بھائی مجھے نوید جتنے پیارے نہ ہوتے نا تو میں تمہاری بات مان لیتی۔" بینا نے کہا۔

تب اچانک ہی آنٹی آ گئیں۔

"ارے آنٹی آپ۔" میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ "آپ نے تو وہاں مستقل ڈیرا ہی ڈال لیا۔ کتنے دن ہو گئے آپ سے ملے ہوئے۔"

"بیٹے مجبوری تھی' وقار بہت لاپرواہ ہے۔ ڈر تھا وہ اپنے لگائے ہوئے زخم بگاڑ نہ لے۔"

"اب کیسے ہیں وہ؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت بہتر' پیشانی کا زخم تقریباً ٹھیک ہو گیا ہے۔ پاؤں کا پلستر بھی اتر گیا ہے' البتہ بازو کا پلستر ابھی نہیں اترا۔

وقار اب کافی بہتر ہے۔ اس نے مجبور کر کے مجھے بھیجا ہے۔ وعدہ کر رہا تھا کہ اب اودھم نہیں مچائے گا۔ ویسے تم اور نیل چلی جانا۔ شام کو میں آؤں گی تو میرے ساتھ واپس آ جانا۔"

"مگر آنٹی میں تو۔" میں بوکھلا گئی۔

"کیا حرج ہے' تم بینا کے ساتھ ہو گی تو مجھے اطمینان رہے گا۔ اکیلی تو یہ بور ہو گی۔" آنٹی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اب کہو چلو گی میرے ساتھ یا نہیں۔" بینا نے طنز سے کہا۔

"چلنا ہی پڑے گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "آنٹی کی بات میں کیسے ٹال سکتی ہوں۔"

"اب ہوئی نا بات۔" بینا کا چہرہ کھل اُٹھا۔

تم فوارے کے قریب آرام چیئر پر نیم دراز تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک دم سیدھے ہو گئے۔

"السلام علیکم۔" میں نے بوکھلا کر سلام کیا۔ خلافِ توقع شرافت سے جواب ملا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وقار بھائی کیا بات ہے۔ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" بینا نے پوچھا۔

"کمرے میں دل گھبرا رہا تھا نا اس لئے یہاں چلا آیا۔" تم نرمی سے بول رہے تھے۔

"شہنیلا بی بی! آپ کیسی ہیں؟"

"جی..... میں تو ٹھیک ہوں بالکل۔"

میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ وہ اکھڑ پن اور وہ ازلی نفرت' جو تمہاری آنکھوں سے جھانکتی تھی' مفقود تھی' مگر تم بینا سے باتیں کرنے لگے' جب تم بیٹھے بیٹھے تھک گئے تو ملازم کے سہارے کمرے میں جانے لگے۔ ابھی تم پاؤں پوری طرح زمین پر نہیں رکھ سکتے تھے' اور ملازم کے سہارے قدرے لنگڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ کمرے میں پہنچ کر تم نے ملازم سے کافی کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم کافی لے آیا۔

کافی کے سِپ لیتے ہوئے تم نے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا۔

"اُس دن آپ برا تو نہیں مان گئیں' دراصل بعض اوقات آدمی کہتا کچھ ہے اور اس کے منہ سے کچھ اور نکل جاتا ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کہا' پھر آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ میں۔"

"ارے وقار بھائی آپ نے ایسی کیا بات کہہ دی کہ نیل کو خفا کر دیا' شاید اسی لئے کہ نیل آنہیں رہی تھی اور اس نے وہ ساڑھی بھی نہیں لی۔"

وقار کا چہرہ تھوڑی دیر کے لئے سخت پڑ گیا' مگر پھر وہ مسکرا کر بولا۔

"مگر وہ ساڑھیاں تو تمہارے لئے تھیں بینا رانی' یوں بھی میں غیروں میں تحفے نہیں بانٹتا پھرتا۔"

مجھے بے حد توہین کا احساس ہوا۔ چہرہ ایک دم تپ سا گیا۔ تب ہی ملازم کافی لے آیا۔

"نہیں..... میں نہیں پیتی۔" میں نے کپ واپس کر دیا۔ تم شاید اپنے الفاظ کا تاثر مٹانا چاہتے تھے یا اپنے درشت رویے کی تلافی کر رہے تھے۔ میں چپکی ہو رہی۔ کتنی دیر تک اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں' مگر میرے اندر اداسی کی نامعلوم سی کہر چپکے چپکے گرتی رہی' اور اس شام جب میں لوٹی تو بار بار اپنے دل میں عہد کر رہی تھی' کہ اب زندگی بھر اس پتھر کے شہر میں قدم نہیں رکھنا۔ جہاں تم رہتے ہو' اور نہ زندگی بھر تم سے کوئی واسطہ رکھنا ہے۔"

پھر اچانک ہی نوید واپس آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا اور قہقہے لگاتا۔ آنٹی نے

اس کے آنے کی خوشی میں ایک پارٹی دے ڈالی۔ اور بہت سارے لوگوں کو مدعو کر ڈالا۔

میں اس وقت کسی کام سے ہال کمرے سے باہر آ رہی تھی' اور تم اندر جا رہے تھے کہ میں نے تمہیں عرصے بعد دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح درشت چہرہ' ہونٹ بھینچے ہوئے' مگر قدرے کمزور کمزور سے۔ تب ہی تمہارے قریب سے گزرتے ہوئے میرا پاؤں پھسل گیا' اور میں نے گرنے سے بچنے کے لئے غیر اختیاری کیفیت میں تمہارا بازو تھام لیا۔ تم عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے' تو میں نے گھبرا کر تمہارا بازو چھوڑ دیا۔

"معاف کیجئے گا پاؤں پھسل گیا تھا۔" میں نے گھبرا کر وضاحت کی۔

"سنبھل کر چلا کریں۔" تم نے ہلکی سی درشتی سے کہا۔ "ضروری نہیں کہ آپ سہارے لئے ہاتھ پھیلائیں اور کوئی آپ کے پاس موجود ہو۔"

میں خفت سے سرخ پڑ گئی۔

اللہ کیسا شخص ہے یہ۔ میں نے کوئی عمر بھر کے لئے تو اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ ایک غیر اختیاری سی حرکت تھی اس پر بھی اتنی سنا گیا' مگر نوید کے آنے کی خوشی میں' میں نے اس سے اُلجھنا مناسب نہ سمجھا' اور چپکے سے آگے بڑھ گئی۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ جب سے ویدی آیا ہے' اس کی مسکراہٹ میں وہ چمک نہیں' قہقہے کچھ بجھے بجھے سے ہیں۔ شروع میں' میں نے سمجھا کہ یہ سفر کی تھکان ہے' مگر اس دن جب اچانک ہی میں اس کے کمرے میں آئی اور اُسے اُداس دیکھا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے ویدی' جب سے آئے ہو' کچھ چپ چپ سے ہو۔ اپنے آپ کو وہیں تو نہیں چھوڑ آئے۔" ویدی ہنستا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"جواب نہیں تمہارا بھی نیل' کیا کیا قیافے لگاتی ہو۔"

"نہیں ویدی یہ میرا وہم نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ خیریت سے تو ہو نا۔"

"اور تمہیں کیا نظر آ رہا ہے نیل' جیتا جاگتا' زندہ سلامت تمہارے پاس موجود ہوں۔"

"ہاں موجود تو ہو' مگر لگتا ہے میرا ویدی جیسے کہیں گم ہو گیا ہے۔"

ویدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بجھنے لگی۔

"اپنی بے بی بہت ہوشیار ہو گئی ہے۔"

"تو پھر بتا دو نا' مجھے بھی نہیں بتاؤ گے اپنی نیل کو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تمہیں نہیں بتاؤں گا نیل تو تم بخشو گی تھوڑا ہی۔"

"تو پھر بتاؤ نا۔"

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس ایک لڑکی سے ذرا متاثر ہو گیا تھا۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

"پھر......؟"

"پھر کیا۔ جب میں نے شادی کی تجویز پیش کی' تو وہ بہت ہنسی۔ کہنے لگی تم مشرقی لوگ بہت جذباتی ہوتے ہو۔ ذرا سا گھومنے پھرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا' بوائے فرینڈز تو میرے اور بھی ہیں' مگر شادی میں صرف جم سے کروں گی۔ جو ورلڈ ٹور پر گیا ہوا ہے' اور جس سے مجھے پیار ہے۔"

"اوہ...... دفع کرو ویدی اسے' دنیا میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں۔ مریم سے ملو گے نا تو خوش ہو جاؤ گے۔"

"ہاں مگر اپنی حماقت کو بھلانے میں تھوڑا سا وقت تو لگے گا نا۔ خیر اس ذکر کو چھوڑو۔ بینا کو بلاؤ ڈرائیو کے لئے چلیں گے۔"

"اچھا۔" میں بینا کو بلانے کے لئے چلی گئی۔

پھر ویدی کے ساتھ گھومتے پھرتے بھی مجھے ویدی کی اداسی پریشان کرتی رہی' مگر رفتہ رفتہ ویدی اپنے آپ میں لوٹ آیا' پھر ایک پیاری سی شام ویدی کی رضامندی سے مریم کو انگوٹھی پہنا دی گئی۔

ریس کورس میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ لوگ اپنے اپنے پسندیدہ گھوڑوں پر لمبی لمبی رقمیں لگا رہے تھے' اور اونچی اونچی باتیں کر رہے تھے۔ جیتنے جانے والے گھوڑے کے متعلق قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں' اور شرطیں لگ رہی تھیں' اور اس سارے طوفان بدتمیزی کے درمیان نوید جاجی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اصل میں ہم چوک بار کھانے کے لئے نکلے تھے' راستے میں ویدی کو یاد آیا کہ اس نے تو جاجی کو بڑا ضروری پیغام دینا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جاجی کی محبوبہ اس سے روٹھ گئی ہے' اور وہ عنقریب خودکشی کرنے والا ہے۔" نوید نے بتایا۔

"تو پھر۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر یہ کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہے' تاکہ اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ سکے' مگر سلمٰی نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے چارہ بڑا دل شکستہ تھا۔ میں نے بڑی کوشش کر کے سلمٰی کو اس سے ملنے پر رضامند کر لیا ہے' اور اب جاجی کو بھی اطلاع دینی ہے۔"

مگر جب جاجی کو فون کیا گیا' تو معلوم ہوا کہ وہ غم غلط کرنے کے لئے ریس کورس گیا ہے' چنانچہ اب سارے ریس کورس میں اسے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے جاجی ملا تو نوید اسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے گیا۔

"جاجی کے بچے مت پوچھ کہ تیری خاطر کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں' تب کہیں جا کر وہ تجھ سے ملنے پر تیار ہوئی ہے۔ پر اب اسے منع کرنا پڑے گا کہ تو کمبخت اس قابل ہی نہیں۔"

جاجی معافی مانگنے لگا۔

"اچھا سن' جاتے ہی اس کے پاؤں پکڑ لینا اور جو وہ نہ مانے تو ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ لینا کہ لو ہم تو چلے۔ پر ایک بات کا خیال رکھنا ریوالور میں گولی نہ ہو۔"

نوید اسے سنجیدگی سے مشورے دینے لگا۔

"کیا خیال ہے پرنس پر کچھ رقم نہ لگا دی جائے۔ سنا ہے ٹاپ پر جا رہا ہے۔" جاجی کے جانے کے بعد نوید نے پوچھا۔

"ضرور...... ضرور...... نیک کام میں دیر کاہے کی۔" بینا نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔

"پر ویدی...... اگر ہار گئے تو۔" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تو کیا ہم نے کون سے ہزاروں روپے لگانے ہیں' چلو اپنے اپنے پرس کھولو دیکھیں کتنی رقم بنتی ہے۔"

تب ہی ایک جانی پہچانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"نوید...... تم یہاں......؟"

میں نے چونک کر نظریں اٹھائی' اور یہ تم تھے ہمیشہ کی طرح سرد مہر اور لاتعلق۔

"واہ بھائی بڑے موقع سے ملے۔" نوید چہک اٹھا۔

"سنا ہے ریس کے بارے میں تمہاری معلومات خاصی وسیع ہیں۔ کیا خیال ہے پرنس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیت جائے گا۔"

"پرنس......؟ مگر تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور...... پھر اپنے ساتھ ان کو بھی لے آئے۔" تمہاری آواز میں عجیب سی خشونت بھر گئی۔

"اصل میں آیا تو تھا میں جاجی کو ڈھونڈنے۔" ویدی نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "مگر اب سوچ رہا ہوں کہ جب آ ہی گیا ہوں تو ریس میں حصہ بھی لے لوں۔"

"ریس میں حصہ؟ بے وقوف' احمق ایک بار اس دلدل میں پھنس گئے تو پھر کبھی نہ نکل سکو گے۔" تمہاری پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"مگر......" ویدی نے کچھ کہنا چاہا۔

"مگر کیا...... ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

تم ویدی کا ہاتھ تھامے ریس کورس سے باہر نکلے چلے گئے' میں اور بینا تمہیں غصے میں دیکھ کر چپ سی ہوگئیں۔

تمہارا باوردی ڈرائیور گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جلدی سے سگریٹ پھینکی اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"ارے بھائی میری بھی تو سنو۔" نوید نے رکتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گاڑی میں آیا ہوں۔"

"صفدر علی!" تم نے ڈرائیور سے کہا۔ "گاڑی واپس لے جاؤ میں نوید کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"اوکے سر۔" ڈرائیور نے سلیوٹ کیا' اور تم نوید کی گاڑی خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگے۔

"یار وقار ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں مانو گے۔" نوید نے وقار سے کہا۔

"کیا ہے پوچھو۔"

"تم خود ریس میں باقاعدہ حصہ لیتے ہو' اتنی بڑی بڑی رقمیں لگاتے ہو' اور میں تو محض ایڈونچر کے طور پر حصہ لینے لگا تھا' تو تم برا مان گئے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

تم نے ایک دم اتنے زور سے بریک لگائے کہ ہمارے سر ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"میں اگر کنویں میں چھلانگ لگاؤں تو تم بھی لگا دو گے۔" تمہاری آواز میں عجیب غیظ

آلود لپک تھی۔

"بھئی دوستی کا تقاضا تو یہی ہے۔" ویدی نے تم سے مرعوب ہوئے بغیر بے نیازی سے کہا۔

"احمق!" تم نرم پڑ گئے۔

"میں اگر ساری دولت بھی پھونک ڈالوں نا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اکیلا آدمی ہوں' فٹ پاتھ پر بھی سو سکتا ہوں' اور تم ڈوبے تو اپنے ساتھ پورے خاندان کو بھی لے ڈوبو گے۔"

میں نے حیرت سے تمہاری پشت کو گھورا۔ کیا تم سا آدمی بھی اس طرح سوچ سکتا ہے۔ ہر بار تمہاری شخصیت کا ایک نیا رخ سامنے آتا تھا۔

"اچھا بھائی معاف کر دو' تم تو پیچھے ہی پڑ گئے۔ اب کبھی ریس کورس کے قریب پھٹکوں گا بھی نہیں۔"

"یہی تمہارے حق میں بہتر بھی ہوگا۔"

تم نے سنجیدگی سے کہا' پھر تم نے گاڑی سٹارٹ کر دی اور سیدھے ویدی کے گھر آئے اور شام تک وہیں ان سب کے ساتھ رہے۔

اس دن ہوٹل میں ایک زبردست پروگرام تھا۔ ہم سب ہی گئے۔ وہاں تم بھی موجود نظر آئے۔ فرانسیسی طائفہ جس کو مس گینو لیڈ کر رہی تھی' بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ پروگرام ختم ہوا تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ویدی نے تمہیں بلانا چاہا' مگر تم جانے کب اٹھ کر چلے گئے تھے۔ محویت میں کچھ پتا ہی نہ چلا تھا۔ نوید کو اپنا کوئی دوست مل گیا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں بینا کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی باہر آ گئی۔ بینا بڑے جوش و خروش سے مس گینو کے متعلق باتیں کیے جا رہی تھی' اور میں ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ اسی وقت میں نے تمہیں دیکھا' اور میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔

تم مس گینو سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ اور تمہارے چہرے کی کرختگی میں نرماہٹ تھی' پھر تم اور مس گینو...... ایک طرف چلے گئے اور میں حیرت سے آنکھیں ملنے لگی۔

کیا یہ تم ہی ہو۔ تم جو عورتوں سے الرجک ہو اور آدم بیزار ہو' مگر...... مگر مس گینو واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اداسی کہر کی طرح میرے اندر گرنے لگی۔

"کیا بات ہے وہیں کیوں رک گئیں؟" بینا نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کوئی...... بات نہیں۔" میں نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا' مگر کیا واقعی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی بات نہیں ہے تو پھر یہ نامعلوم سی دھند کیوں میرے سارے وجود کو ڈھانپ رہی ہے' اور میرے جسم کا سارا خون کیوں منجمد ہوا جا رہا ہے' اور کیا میں اُس سے' میں نے گھبرا کر اپنے دل میں اٹھنے والے سوال کو کچل دیا۔ یہ غلط ہے' اور مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ تب ہی ویدی آ گیا اور ہم واپس چلے آئے۔

اس دن کے بعد تمہارے متعلق عجیب عجیب سی افواہیں اڑنے لگیں۔ تمہارے اور مس گینو کے متعلق' تم ہر جگہ' ہر پبلک مقام پر مس گینو کے ساتھ نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن ویدی نے آ کر یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ تم اس سے شادی کر رہے ہو۔

"کیا تمہیں وقار بھائی نے بتایا ہے؟" بینا نے پوچھا۔

"نہیں...... اِدھر اُدھر سے سنا ہے۔ آج تک میں نے وقار سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ ڈر لگتا ہے اس کے جلال سے۔"

"سب بکواس ہے۔ وقار بھائی ہمیں بتائے بغیر کچھ نہیں کریں گے۔" بینا نے تیقن سے کہا۔ "اب وقار بھائی ملے تو میں پوچھوں گی ان سے۔"

مگر بینا کے پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی' کیونکہ ایک دن اچانک سنا کہ وہ فرانسیسی طائفہ مس گینو سمیت واپس چلا گیا۔ تب ویدی نے تم سے مس گینو کے متعلق پوچھا' تو تم بے اختیار ہنس پڑے۔

"بس وہ میری فرینڈ تھی' اور اس کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ باقی سب لوگوں کی حاشیہ آرائیاں ہیں۔"

پھر انہیں دنوں تم روزینہ کے ساتھ دیکھے جانے لگے' جو فلموں میں رقص کرتی تھی' اور سوسائٹی گرل تھی۔ پھر ایک بے حد دولت مند فیملی کی لڑکی مونا کے ساتھ تمہارا اسکینڈل مشہور ہوا' مگر یہ بھی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ یہاں تک کہ فلموں کی مشہور و معروف اور چوٹی کی ہیروئن مہ پارہ کے ساتھ تمہارے گھومنے پھرنے کی افواہیں مشہور ہونے لگیں' جانے کیوں مجھے ان افواہوں پر یقین نہ آتا۔ جہاں جاتے ہر محفل اور ہر بزم میں تمہارا ہی ذکر ہوتا۔ وہ تمہارا عورتوں سے دُور بھاگنا' اور اب یہ نت نئے سکینڈل۔ شاید تم تجرد کی زندگی سے اکتا گئے تھے اور اب یکبارگی ساری رنگینیاں سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ لوگ باتیں کرتے۔

اور اس دن جب ہم تاج محل میں سوپ پی رہے تھے تو ویدی اچانک اُٹھ کر چلا گیا کہ میں ابھی ایک منٹ میں آیا' مگر جب اس کا ایک منٹ زیادہ ہی طویل ہو گیا تو میں اسے ڈھونڈنے کے لئے نکلی' تب اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہال روم میں چلی آئی' اور اُس دن میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہیں مہ پارہ کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ اس دن میرے دل میں رکھا بت پاش پاش ہو گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ پراسرار سا ہالہ' جو مجھے تمہارے اردگرد نظر آتا تھا' بجھ گیا ہے۔ اس میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ اب تم' تم نہیں رہے تھے' کوئی اور تھے' اور اُس لمحہ جب میں انتہائی غور سے مہ پارہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے تمہیں ناچتے دیکھ رہی تھی' ایک عجیب سی بات ہوئی تم رقص کرتے ہوئے جب گھومے تو تمہارا چہرہ عین میرے سامنے آ گیا۔ اسی لمحہ تمہاری نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے محسوس کیا' جیسے تمہارے پاؤں بے توازن ہو گئے ہوں' پھر میں نے مہ پارہ کی چیخ سنی۔ تم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے ایک طرف دھکیلا تھا' اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتے دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے۔

لمحہ بھر کے لئے لوگ رقص کرنا بھول گئے۔ مہ پارہ کا چہرہ غصے اور توہین کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ لوگ مہ پارہ کے گرد جمع ہو گئے اور تمہارے وحشی پن اور اجڈ رویئے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ مہ پارہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیئے بغیر تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ میں جیسے اپنے آپ میں آ گئی اور چپکے سے ہال روم سے باہر نکل آئی۔

✵✦✵

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اور یہ میں ہوں...... میں...... وقار عالم...... جو ساری زندگی اجالوں کے پیچھے بھاگتا رہا ہے' اور جس کے چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔" اس نے بے حد اداسی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔ اُس وقت وہ اپنی بے حد شاندار کوٹھی کے لان میں چبوترے پر ایک پاؤں رکھے جھکا کھڑا تھا' اور اُس کے سامنے وہ موتی اچھالتا فوارہ تھا' جس کی شکل کنول کے پھول کی طرح تھی' کنول کی بڑی بڑی پتیوں کے بیچ ایک خوبصورت مجسمہ تھا' جس کے دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ پانی مجسمے کے ہاتھوں سے نکل کر کنول کی پتیوں پر سے ہوتا ہوا حوض میں گر رہا تھا' لیکن اس منظر کی خوبصورتی اس پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے بے قراری سے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔

"ہو سکتا ہے ان اندھیروں کے پیچھے کہیں روشنی کی کوئی کرن موجود ہو' لیکن میں نے تو اپنی آنکھیں مضبوطی سے بھینچ لی ہیں اور اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔" اس نے جلدی جلدی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لئے اور اسے اپنے پاؤں سے مسل دیا۔

"میں اپنی آنکھیں کھولنا نہیں چاہتا' کیونکہ میری آنکھیں تھک گئی ہیں' اور میرا دل بجھ گیا ہے۔" وہ نڈھال سا چبوترے پر بیٹھ گیا۔

"میں نے اپنے آپ کو دنیا کی نفرتوں سے اور دنیا کی محبتوں سے کھینچ لیا ہے' اور دنیا میرے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ کیونکہ میرے پاس پیسہ ہے' دولت ہے' وہ کھرا سکہ ہے' جو ہر دور میں چلتا ہے۔" وہ زہرخند سے مسکرا دیا۔

"لوگوں کی نظروں میں مجھ سے زیادہ میری دولت اہمیت رکھتی ہے' لیکن میں اپنی ذات کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔" اس کا چہرہ سخت پڑ گیا۔ "میں ساری دنیا کو اپنی ایک ٹھوکر کے برابر سمجھتا ہوں' اور مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے' جو صرف آدمی کا چہرہ دیکھتے

ہیں۔ اس کی روح کو نہیں پہچانتے۔ جو آدمی کو سونے کے ترازو میں تولتے ہیں۔ میں لوگوں سے دُور بھاگ جانا چاہتا ہوں' اور میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے آدمیوں میں ہی رہنا ہے۔"
اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ لائٹر کے شعلے کا عکس اس کی آنکھوں میں لہرایا اور شعلہ بجھ گیا۔

"میں سنیاسی نہیں کہ بن باس لے لوں' لیکن میں نے اندر سے ساری دنیا کو تیاگ دیا ہے' اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی' اور جب وہ مجھے سمجھ نہیں سکتے تو باتیں بناتے ہیں۔ میرے سرد رویے کے متعلق اور میری تنہا زندگی کے متعلق۔ اصل میں جب آدمی کے پاس اتنی دولت ہو' اور وہ اتنا تنہا ہو تو لوگوں کو باتیں کرنے کے لئے ایک دلچسپ موضوع مل جاتا ہے۔" اس نے جلدی جلدی سگریٹ کے دو چار کش لئے۔ "تو یہ میں ہوں۔ وقار عالم' جسے لوگ سنکی کہتے ہیں' اور مغرور کہتے ہیں۔ کہتے رہیں۔ اس سے میری حیثیت یا شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں تو زندگی کو اپنے طور پر گزارنا چاہتا ہوں اور میں جو کچھ بھی ہوں' جیسا بھی ہوں' کسی کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتا۔" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے نیا سگریٹ سلگانے لگا۔ ڈوبتے سورج کی پھیکی روشنی میں وہ بہت اداس' بہت تنہا لگ رہا تھا۔ اس تھکے ہارے مسافر کی طرح' جو جنگل میں راستہ بھٹک کر منزل تک پہنچنے کی آس کھو چکا ہو۔

"اور اب جب کہ میں ساری دنیا سے کٹ گیا ہوں' اور میں نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے تو یہ لڑکا نوید خواہ مخواہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

اصل میں اس سے ایک چھوٹی سی حماقت سرزد ہو گئی تھی' جس کی سزا اسے بھگتنا پڑ رہی تھی۔ نہ وہ اس دن الشیراز میں اس کی مدد کرتا' نہ وہ اس کے گلے پڑتا۔ وہ تو چپک ہی گیا' اور زبردستی کا دوست بن بیٹھا تھا' اور اس کے سرد اور تلخ رویے کے باوجود اس یک طرفہ دوستی کو نبھائے جا رہا تھا' اور اب تو وقار بھی تھوڑا تھوڑا اس سے متاثر ہونے لگا تھا۔ آخر آدمی کب تک پتھر بنا رہے' اور آنکھیں بند رکھے۔ وہ تو اس کی طنزیہ اور دل چھیدنے والی باتوں پر بھی ہنس پڑتا ہے' اور اس قدر محبت سے بولتا ہے کہ آدمی شرمندہ ہو جائے۔ جو کوئی ایک طمانچہ کھا کر دوسرا گال پیش کر دے کہ لے بھائی اور مار لے۔ اس کے منہ پر آدمی کیسے طمانچے مار سکتا ہے' اور کب تک۔ وقار بھی اُس کے بے پناہ خلوص کے سامنے مجبور ہو گیا تھا۔ اسے اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طبیعت کے خلاف نوید کا تھوڑا بہت لحاظ کرنا پڑ رہا تھا۔

اس دن نوید کی سالگرہ پر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا' لیکن نوید نے اسے اتنی محبت اور خلوص سے انوائٹ کیا تھا کہ وہ صاف طور پر انکار نہ کر سکا' پھر جب نوید نے اسے فون کر کے اطلاع دی کہ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں' اور وہ اس کا منتظر......تو وہ جھنجھلا گیا۔ آخر وہ کون سی ایسی اہم شخصیت ہے' جس کے نہ جانے سے کوئی فرق پڑے گا۔ وہ تو کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا' اور اب وہ محض مروت میں آ کر اس سرپھرے لڑکے کو برداشت کر رہا تھا......آخر کیوں؟"

"میں نہیں آ سکتا۔"

اس کی فطری کرختگی لوٹ آئی' اور اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"بھائی وقار بور مت کرو' ایک ذرا میری خوشی کی خاطر ہی چلے آؤ۔" نوید نے چہک کر کہا۔

"میرا تم سے یا تمہاری خوشیوں سے کیا واسطہ؟" اس نے اسی اکھڑ پن سے کہا۔

"چلو کوئی واسطہ نہ سہی' پھر بھی اگر تم طبیعت پر جبر کر کے چلے آتے تو میرا دل خوش ہو جاتا۔"

"میری طبیعت اچھی نہیں۔" وہ نرم پڑ گیا۔

"اگر میں بستر مرگ پر ہوتا' اور تم مجھے بلاتے تو خدا کی قسم تو میں سر کے بل دوڑ آتا۔" نوید کے لہجے میں عجیب سا تاثر تھا۔ "اور یہ مت سمجھو کہ میں تمہارے بغیر سالگرہ منالوں گا۔ اگر تم نہ آئے تو میں کیک ہی نہیں کاٹوں گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

وقار کو غصہ تو بہت آیا۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی شخص اس پر اپنی مرضی مسلط کرے' اور اس کا جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر وہ نہ گیا تو اس خوشی کے موقع پر خوانخواہ اس کا موڈ تلخ ہو جائے گا' اور اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ بغیر کیک کاٹے گھر سے رفوچکر ہو جائے' اور اِدھر اُدھر پھر کر وقت گزار دے' اور مہمان بیٹھے اس کی جان کو روتے رہیں۔ خوانخواہ بہت سے لوگوں کا موڈ کرکرا ہو گا۔ اس نے سوچا' اور جیسے بیٹھا تھا' ایسے ہی اٹھ کر چل دیا۔

راستے میں اسے خیال آیا کہ اس نے نوید کے لئے کوئی تحفہ تو خریدا ہی نہیں' ایسا نہ ہو"

مائنڈ کر جائے' مگر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اچھا ہے' ہو سکتا ہے اس طرح وہ ناراض ہو کر اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ نوید کا موڈ سچ مچ بہت خراب تھا' مگر اسے دیکھ کر وہ اتنا خوش ہوا کہ ساری ناراضگی بھول کر اس کے گلے لگ گیا۔ وہ اسے اپنے دوستوں اور کزنوں سے ملاتا رہا اور وقار کو سخت کوفت ہوتی رہی' مگر وہ نوید کی خاطر برداشت کرتا رہا۔

اور وہ لڑکی' کیا نام تھا اس کا' وہ جس کی سنہری آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمکتی ہیں۔ ارے ہیرا تو موت کی علامت ہوتا ہے۔ اس نے جھرجھری سی لی۔ "اور مجھے ہیروں سے بھی اتنا ہی ڈر لگتا ہے۔ جتنا کہ آدمیوں سے۔" وہ بڑبڑایا' اور وہ لڑکی' جو اسے اس دن نوید کی سالگرہ پر ملی تھی۔ وہ شاید نوید کی کوئی کزن تھی۔ اس کے تھوڑے تھوڑے مسکراتے ہونٹ اسے بہت پیچھے ماضی میں لے گئے تھے۔ جہاں اندھیرا تھا' اور وہ تھا۔ دکھ کے کربناک ریلے تھے اور اس کا لڑکھڑاتا وجود۔ کانچ کے نوکیلے ٹکڑے تھے اور اُس کا گداز دل۔ اور اب تو وہ لہولہو جسم لئے اس مقام پر آ کر ٹھہر گیا تھا' جہاں کسی تکلیف' کسی دُکھ کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس نے ماضی کے سارے غم بھلا دیئے تھے۔ اور اس کے اندر بھوری چٹانوں کی سی سختی اُتر آئی تھی۔ اور اس کا جسم پتھر ہو گیا تھا' جس پر زہر میں بجھے ہوئے سارے تیر بے اثر ثابت ہو رہے تھے' لیکن اُس وقت جب اُس انجان لڑکی کے جانے پہچانے ہونٹ اس پر ہنس رہے تھے۔ اس کے دل میں چبھن سی ہوئی اور وہ مضطرب ہو گیا۔ جیسے جسم کا کوئی حصہ سن ہو جائے اور وہاں سوئی چبھوئی جائے تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

لیکن کبھی کبھی سوئی کی نوک اندر بہت گہرائی میں اتر کر کسی ایسے حصے کو چھو لیتی ہے' جو سن نہیں ہوتا اور کہیں اندر تکلیف کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ ایسے ہی اس نامعلوم لڑکی کی تمسخرانہ ہنسی اس کے بے حس دل کے کسی حساس گوشے سے جا ٹکرائی تھی۔ اسے یوں لگا' جیسے وہ اس پر ہنس رہی ہو۔ وہ تنفر میں ڈوبے ہوئے ہونٹ اس کے تصور میں مسکرائے' تو وقار کے چہرے کے نقوش سخت ہو گئے' اور اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔ ایک دم ساری دنیا اسے اپنی دشمن نظر آنے لگی' اور اس کا دل لوگوں کے لئے نفرت سے بھر گیا۔ "اگر میرے پاس ایک بہت بڑا ایٹم بم ہوتا۔" اس نے اپنے دل میں سوچا' تو میں اس ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا' لیکن افسوس کہ میرے پاس ایٹم بم نہیں۔" اس کا جی چاہا کہ وہ ان ہنستے مسکراتے لوگوں سے دور بھاگ جائے یا پھر اس چینی کی گڑیا جیسی بے وقوف لڑکی کی گردن مروڑ دے' لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر اسے خیال آیا کہ اسے اس چھوٹی سی لڑکی پر خوامخواہ ہی غصہ آ رہا ہے۔ اس نے تو اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں اور وہ بظاہر نارمل ہو گیا۔ اس نے نوید کی خاطر اپنے آپ پر قابو پا لیا' اور بھول گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے دل میں انتہائی باغیانہ قسم کے خیالات پرورش پا رہے تھے۔ نوید کی دلچسپ باتوں اور اس کے محبت آمیز برتاؤ نے اس کے غصے کو کافی حد تک ٹھنڈا کر دیا' پھر بھی وہ بیزار بیزار سا تھا۔

اور یہ ساری بیزاری اس وجہ سے تھی کہ اسے اپنی طبیعت کے خلاف اس محفل میں شریک ہونا پڑا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے شکن آلود لباس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں کھٹک رہا ہے' مگر اس نے کبھی اس چیز کی پروا نہ کی تھی کہ لوگ اس کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ بہت عرصہ سے اس نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا' اور لوگوں کی باتوں سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ کچھ تو وہ یوں ہی لاپروا تھا' اور کچھ اسے نوید پر بھی غصہ تھا' چنانچہ وہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں لباس تبدیل کیے بغیر پارٹی میں چلا آیا تھا' مگر وہ شرمندہ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دوسروں کی مرضی کا قطعاً پابند نہ تھا اور اپنی من مانی کرنا چاہتا تھا۔ کسی کو برا لگتا ہے تو لگتا رہے۔ اس کی بلا سے۔ مگر اسے نوید پر حیرت ہو رہی تھی' جو ناگواری کا ذرا سا اظہار کیے بغیر اپنے اسی بے تکلف انداز میں ہنس ہنس کر ہر ایک سے اس کا تعارف کرا رہا تھا' جیسے لباس کی اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہ ہو' اور اصل چیز اس کی ذات اور شخصیت ہو۔ وہ اسے اپنا دوست کہنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کر رہا تھا' اور اس معاشرہ سے کوئی الگ چیز لگ رہا تھا' جہاں آدمی کی توقیر اس کے لباس کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

اسے نوید کی یہ بات بھی بہت اچھی لگی کہ اس نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ مشہور مل اونر وقار عالم ہے۔ میاں سراج عالم کا لڑکا' اسے اپنی تشہیر بالکل پسند نہ تھی اور وہ اپنی امارت کا ڈھنڈورا پیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی مل اونر کی حیثیت سے پہچانے۔ یا کسی کو یہ معلوم ہو کہ وہ سراج عالم کا لڑکا ہے۔ وہ اپنی ذات کو بھاری پردوں کے پیچھے چھپا لینا چاہتا تھا' اور گم ہو جانا چاہتا تھا' تاکہ کوئی اسے تلاش نہ کر سکے۔ وہ چاہتا تھا وہ ساری زندگی اس دنیا اور دنیا کے لوگوں کے لئے اجنبی بنا رہے' اور کوئی اسے جاننے کا دعویٰ نہ کر سکے۔ وہ لوگوں سے دور ہٹتے ہٹتے اپنے لئے بھی اجنبی بن گیا تھا' لیکن نوید اسے اجنبی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنائیت تھی اور محبت تھی۔ جیسے وہ اسے برسوں سے جانتا ہو۔ وقار دل ہی

دل میں اس کے خلوص کا معترف ہو گیا' مگر ماضی کے تجربات اس کے سامنے عبرت بن کر کھڑے ہو گئے' اور وہ سارے لوگ اسے ایک ایک کر کے یاد آ گئے' جو کسی نہ کسی مفاد کی خاطر اس کے قریب آئے تھے۔

ہاں ہو سکتا ہے کہ اس لڑکے کا کوئی مفاد مجھ سے وابستہ ہو۔ اس نے افسردہ سی غیر یقینی سے سوچا۔ کاش آدمی کے چہرے پر لکھا ہوتا کہ اس کے اندر کیا ہے تو بہت سے دل ٹوٹنے سے بچ جاتے۔ کاش وہ اتنا امیر' اتنا باحیثیت نہ ہوتا' اور دولت کے بغیر اپنی قیمت کا اندازہ لگا سکتا۔ وہ اپنی ذات کی بولی لگانا چاہتا تھا' لیکن اندر سے ڈرتا تھا کہ کوئی اسے بن مول بھی نہ خریدے گا۔

وہ یوسف نہ تھا کہ مصر کے بازاروں میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا' اس کے بدلے میں تو کوئی سوت کی انٹی بھی نہ دیتا۔ ساری قیمت تو اس کی اس بے پناہ دولت کی تھی' جو اس کے قبضے میں تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اور اس شام جب وہ چبوترے پر بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا' اور نوید کے متعلق سوچ رہا تھا' تو اسے اپنے خیالات پر اور اپنے رویئے پر تھوڑی سی شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس نے نوید کو سمجھنے میں واقعی غلطی کی تھی۔ اور اس کا احساس اسے آج ہی ہوا تھا۔ آج جب نوید نے اچانک اسے راستے میں روک کر شکوہ کیا تھا' تو وہ سمجھا تھا کہ وہ تحفہ نہ دینے کی وجہ سے ناراض ہو رہا ہے' مگر جب بات کھلی تو اسے بہت ندامت ہوئی۔ نوید کی آنکھوں میں سچائی تھی اور خلوص تھا' اور سچا خلوص تو اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ اس نے بھی اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

''اصل بات یہ ہے کہ میرا آدمی پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اور مجھے جھوٹ کے اس لبادے سے نفرت ہے' جسے دوستی کہا جاتا ہے' پھر بھی میں نوید کا دل نہیں توڑ سکتا۔ تو یہ ثابت ہوا کہ تم کچھ بدلتے جا رہے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ تمہارا دل جذبوں سے خالی ہے۔ اس صراحی کی مانند' جس کا پانی گرا کر اوندھا کر دیا جائے اور اب تم اسے دوست بنا رہے ہو' جب کہ تمہیں اندر سے یقین ہے کہ کوئی آدمی بھی سوائے اپنے' کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ اس نے سوچا۔ اور میں آدمی کی صورت کو ترس گیا ہوں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تنہائی کے اس احساس سے نجات چاہتا ہوں جو مجھے خوفزدہ کر رہا ہے' اور میں کسی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو ہمدردی سے میری سنے یا پھر وہ باتیں کرتا رہے اور میں سنتا رہوں تاکہ مجھے تنہائی کا احساس نہ ہو اچھا دوست نہ ہو لیکن میں اس سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کر رہا۔ میں جانتا ہوں مجھے اپنا بوجھ خود اٹھا کر چلنا ہے۔ مجھے رونے کے لئے اس کا کندھا نہیں چاہئے۔ میں تو اس کے ساتھ مل کر تھوڑا سا ہنسنا چاہتا ہوں' اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کیونکہ جب آدمی بغیر کسی توقع' بغیر کسی اُمید کے ملتا ہے تو وہ بہت ساری مصیبتوں سے بچ جاتا ہے' اور گو آدمی بہت ناقابل اعتبار چیز ہے' پھر بھی' پھر بھی اس میں کوئی چیز ایسی ہے' جو مجھے متاثر کر رہی ہے۔ کچھ بھی ہو' میں اس کے محبت سے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہیں جھٹک سکتا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ جلتے ہوئے سگریٹ کا سرا اس کی انگلیوں تک آ پہنچا تو وہ اپنی محویت سے چونکا۔ شام کے سرمئی سائے گہرے ہو رہے تھے' اور خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنی ناک کو چھوا جو برف کی طرح سرد ہو رہی تھی اور سگریٹ پھینک کر اُٹھ گیا۔

✹✦✹

بات تو کچھ عجیب سی ہے۔ بہت عجیب' مگر یہ واقعہ ہے۔ نوید کا مجھ سے ملنا' پھر اس کے خاندان میں گھل مل جانا۔ بینا اور ماما جانی جیسے پیارے لوگوں سے ملنا اور ان گل بداماں لوگوں میں وہ خار کی طرح کھٹکتی ناپسندیدہ ہستی۔ اُفوہ کس قدر نفرت ہے مجھے اس سے۔ یہ نفرت کسی سریع الاثر زہر کی طرح میری رگ رگ میں دوڑ رہی ہے' مگر کیوں؟ آخر اس لڑکی نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی میں کیوں سلگ اٹھتا ہوں۔ تپ جاتا ہوں۔ بے قابو ہو جاتا ہوں۔ آخر کیوں؟ وہ اس کے مسکرانے کی ادا' اور ہنستے میں رخساروں میں ننھے سے ڈمپل کا پڑ جانا۔ کیا یہ ذرا سی مشابہت کوئی بہت بڑا جرم ہے' نہیں۔ نفرت کرنے کے لئے یہ نہایت ہی بودا جواز ہے' مگر پھر بھی میں اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں۔ اس کی مسکراہٹ کسی ایسی ہستی کی یاد دلاتی ہے' جسے میں بھول جانا چاہتا ہوں' اور پھر بہت ساری ناگوار یادیں سینے میں کچوکے لگانے لگتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس ننھی سی لڑکی کی گردن مروڑ دوں اور اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔

کتنی بار میں نے چاہا کہ اس سے نرمی اور سہولت سے بات کروں' مگر میرا رویہ غیر ارادی طور پر اس سے درشت ہو جاتا ہے' اور جب وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی ہے تو میں پشیمان ہو جاتا ہوں۔ مگر میں نے کبھی اپنی پشیمانی کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ یہ ہوا کہ میں اس کے متعلق

سوچے چلا جاتا اور اس کی پرچھائیں ہر جگہ' ہر لمحہ میرا پیچھا کیا کرتیں۔ بولو اس بے بنیاد نفرت کا سبب بھی ہے کوئی۔ میرا جرم میرا قصور تو بتا دو۔ وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوتی' اور میں ضمیر کی عدالت میں جھنجھلا جھنجھلا جاتا۔ تب اس رات میں نے ایمانداری سے اپنا تجزیہ کیا' اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ میری نظروں میں خار کی طرح کھٹکنے والی لڑکی میرے دل کے اندر ہی کہیں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ نہیں...... نہیں...... میں مارے دہشت کے چلا اٹھا۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ میں نے جو اپنے دل کے کواڑوں کو مدت سے بند کر رکھا تھا' اور میرا یہ عہد تھا کہ اب کوئی لڑکی بھی میری زندگی کے ایوان میں داخل نہیں ہو سکتی' پھر کیسے آپوں آپ یہ کواڑ کھل گئے۔ میں بدحواس ہوا جا رہا تھا۔

''نہیں...... یہ غلط ہے...... میں نے پھر تردید کی' مگر یہ واقعہ تھا' جو رونما ہو چکا تھا۔ مدتوں بعد میرے دل میں ایک آرزو نے جنم لیا تھا' پھر ایک تمنا مجھے بے قرار کر رہی تھی۔ میرے مردہ دل میں زندگی کی حرارت دھڑک رہی تھی' مگر کیا عورت ذات اس قابل ہے کہ اسے دل میں جگہ دی جائے۔ میری آنکھوں کے سامنے مسکراتی ہوئی رومانہ آ کھڑی ہوئی۔

''نہیں شہیلا بیگم نہیں' تم میرے دل کی فصیلوں میں سیندھ نہیں لگا سکتیں۔'' میں نے اپنے دل کی ننھی سی آرزو کو کچلتے ہوئے سختی سے کہا۔ ''ابھی تو پچھلے زخم بھی مندمل نہیں ہوئے' ابھی تو وہ داغ بھی تازہ ہیں' جو رومانہ بیگم نے لگائے ہیں۔ نہیں شہیلا بیگم نہیں۔'' میں نے فیصلہ کیا۔

پھر بہت سی ناگوار و خوشگوار یادیں ایک ہجوم کی طرح مجھ پر یلغار کر آئیں اور مجھے کھینچتی ہوئی بہت دور ماضی میں لے گئیں۔ جب زندگی کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح خوبصورت اور جگمگاتی صبح کی طرح روشن تھی۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ اس کے ذہن میں بس ان خوشیوں کا احساس ہی رہ گیا تھا' کچھ اَن دیکھی اور اَن چھوئی خوشیاں جو بہت جلد اس سے چھن گئیں۔ البتہ وہ دن اس کے شعور کے پردے پر پوری طرح محفوظ تھا' جب مما اس سے جدا ہوئیں۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا رات کا وقت تھا' پپا کاروباری سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے' وہ اکثر دورے پر رہتے' کبھی جاپان' کبھی فرانس' کبھی انگلینڈ' کبھی جرمنی۔ وہ مما کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بہت سے کھلونے اپنے اردگرد پھیلائے۔ بھالو تالیاں پیٹ رہا تھا اور بندر ڈرم بجا رہا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا' لمبی سی گاڑی گلی چکر میں چھک چھک کرتی گھوم رہی تھی اور ایک کارٹون نما سا بونا سکوٹر چلاتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز سے کرتب دکھا رہا تھا' اور وہ شور مچا رہا تھا۔ خوش ہو رہا تھا اور بے ساختگی سے ہنس رہا تھا۔ اس کی حرکتوں پر ہنستے ہنستے اچانک مما کے منہ سے سسکی سی نکل گئی' اور وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اوندھی سی گئیں۔

''کیا ہوا مما؟'' وہ گھبرا کر مما کے قریب چلا آیا۔

''وقی بیٹے۔ پانی...... تھوڑا پانی دو۔'' بمشکل انہوں نے کہا۔ وہ تکلیف سے بالکل سفید پڑ رہی تھیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ مما کو کیا ہوا ہے۔ لیکن اس نے ٹی وی اور وی سی آر پر فلموں میں دیکھا تھا کہ لوگ بیمار ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور مما اس وقت بہت تکلیف میں تھیں' وہ ڈر سا گیا۔

''مما...... مما جانی...... آپ مرنے تو نہیں لگیں۔'' اس نے خوفزدہ ہو کر مما کے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

مما تکلیف کے باوجود ہنس پڑیں۔ انہوں نے ایک دم اسے بازوؤں میں بھینچ کر چوما۔ اسے تسلی دی اور اسے پانی لانے کے لئے کہا تھا۔ وہ دوڑا ہوا پانی لانے گیا اور جب پانی لے کر واپس آیا تو مما سو رہی تھیں' اور ان کے ہاتھوں میں ریسیور تھا۔

''مما...... مما...... یہ پانی لے لیں۔''

اس نے مما کو آواز دی' مگر مما خاموش تھیں۔ اس نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر بار بار کھینچا' بار بار انہیں جگانے کی کوشش کی' مگر وہ کچھ ایسی نیند سوئی تھیں کہ جاگ ہی نہیں رہی تھیں۔ ایکدم اسے احساس ہوا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگئی ہے۔ رات دیکھے ہوئے ڈرامے کا منظر اس کی آنکھوں میں پوری طرح اُجاگر ہو گیا' اور وہ چیخ اٹھا۔

''نہیں مما نہیں۔'' وہ بار بار مما کے رخساروں پر ہونٹ رکھ دیتا۔

''مما پلیز...... آپ بولتی کیوں نہیں۔''

مگر مما تو کچھ ایسی روٹھی تھیں کہ کچھ بول ہی نہیں رہی تھیں' نہ آنکھیں کھول رہی تھیں۔

اس کے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ جا کر کسی نوکر کو بلا لائے یا پھر پپا کو ہی فون کر دے۔ وہ تو بس روئے جا رہا تھا اور مما کو پکار رہا تھا۔ جب رات گئے پپا آئے

تو وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''پپا...... پپا...... مما بولتی ہی نہیں۔''

''تم نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی۔'' پپا مسکرانے لگے۔

''نہیں پپا...... مما نے پانی مانگا تھا اور جب میں پانی لے کر آیا تو'' وہ پھر رونے لگا۔

پپا نے اسے گود میں اٹھا لیا' اور اسے لیے لیے مما کے پاس آئے۔ انہوں نے مما کو جگانے کی کوشش کی' پھر ڈاکٹر آ گئے مگر کوئی بھی انہیں جگا نہ سکا تھا۔

اور یہ وہ پہلا واقعہ تھا' جو شاید اپنی ہولناکی اور سفاکی کی وجہ سے پوری جزیات کے ساتھ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ مما کے بعد پپا اسے پل بھر کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ انہوں نے اپنی ساری کاروباری مصروفیات ترک کر دیں' اور اپنا سارا وقت وقار کو دینے لگے' مگر آخر انہیں اپنے کاروبار کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وقار نوکروں کے ہاتھوں میں پلنے بڑھنے لگا۔ پپا اسے بہت چاہتے اور اسے پوری توجہ دینے کی کوشش کرتے مگر وہ جو ایک خلا سا اس کی ذات کے اندر پیدا ہو گیا تھا' بھرنے میں نہیں آ رہا تھا۔ جب پپا بیرون ملک چلے جاتے تو وقار پر عجیب سی وحشت طاری ہو جاتی۔ وہ نوکروں کے ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا۔ ایک خوف سا اسے اندر ہی اندر ڈرائے جاتا۔ وہ سہم سہم جاتا۔ کہیں پپا بھی اسے اسی طرح اکیلا نہ چھوڑ جائیں' اور وہ اس وسیع و عریض کوٹھی کے بڑے بڑے کمروں میں بھٹکتا رہ جائے' وہ بری طرح خوفزدہ ہو جاتا' اور اسی طرح غصے اور خوف میں کھلونوں کو توڑ پھوڑ دیتا۔ نوکروں کو ستاتا' چلا چلا کر روتا' اور پپا کو آوازیں دیتا۔ جب کبھی پپا کا فون آ جاتا تو رو رو کر انہیں واپس آنے کے لئے کہتا' اور جب پپا آ جاتے تو پروانے کی طرح ان کے اردگرد گھوما کرتا۔ جانے کیا بات تھی اس کا دل سارے کھیلوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کسی بات میں اس کا جی نہ لگتا۔

پپا اس کے ساتھ کھیلتے تو وہ ان کا منہ تکنے جاتا اور جب پپا کسی بات پر ہنس رہے ہوتے تو ایک دم اسے مما یاد آ جاتیں' اور وہ بالکل زرد پڑ جاتا کہ کہیں پپا بھی اسی طرح ہنستے ہنستے گم نہ ہو جائیں' اور وہ انہیں ڈھونڈتا پھرے مما کی طرح۔ اسے یوں گم صم سا دیکھ کر پپا پریشان ہو گئے' اور انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس کے لئے مما کا نعم البدل لے آئیں' مگر آسیہ بیگم روایتی سوتیلی ماں ثابت ہوئیں' اور اس کا احساس انہیں اس وقت ہوا' جب اس دن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچانک وہ بغیر اطلاع کے واپس آ گئے۔ آسیہ بیگم کو گمان تک نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک فرانس کا دورہ ملتوی کر کے واپس لوٹ آئیں گے۔ ابھی ایک دن پہلے ہی تو فون پر بات ہوئی تھی کہ انہوں نے فرانس میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ اس لئے وہ لندن سے سیدھے فرانس چلے جائیں گے اور میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد ہی واپس لوٹیں گے' مگر پھر میٹنگ کسی وجہ سے ملتوی ہوگئی' اور انہوں نے اچانک ہی واپسی کا پروگرام بنالیا' مگر آسیہ بیگم کو وہ بروقت اطلاع نہ دے سکے۔ آسیہ بیگم انہیں دیکھ کر گڑبڑا گئیں۔

"وقار کہاں ہے؟"

چند رسمی سی باتوں کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ......"

آسیہ بیگم کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا' مگر سراج عالم اپنی دُھن میں ان کی طرف دھیان نہ دے سکے۔

"وقار...... وقی بیٹے۔"

وہ بے قراری سے وقار کو پکارتے بیڈ روم کی طرف لپکے' مگر وہ وہاں بھی نہ تھا۔ تیزی سے واپس لوٹے۔

"وقار کہاں ہے؟"

انہوں نے آسیہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ...... بہت تنگ کر رہا تھا۔" آسیہ بیگم رُک رُک کر بولیں۔

"میں نے یونہی ڈرانے کے لئے اسے سٹور میں بند کر دیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے وہ سٹور کا دروازہ کھولنے لگیں' مگر سراج عالم تیزی سے انہیں ایک طرف دھکیلتے اندر گھس گئے۔ وقار دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور رخساروں پر آنسوؤں کے نشان' جانے کب وہ روتے روتے سو گیا تھا۔

"وقار۔ وقی بیٹے۔" وہ بے اختیار اس پر جھک گئے۔

"نہیں مما...... پلیز...... پلیز مجھے ماریں نہیں۔"

وقار سہمے سہمے انداز میں دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے نیند میں بڑبڑایا۔

سراج عالم نے بے اختیار اسے بانہوں میں بھر لیا' اور اسکے رخساروں پر ہونٹ رکھ

دیئے' پھر اسی طرح اسے بانہوں میں اٹھائے اٹھائے اپنے بیڈ روم میں لے آئے اور آرام سے بستر پر لٹا دیا۔ تمام رات وہ اسے اپنے پاس لٹائے جاگتے رہے اور کچھ سوچتے رہے۔ آسیہ بیگم سے انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا' نہ کوئی شکایت' نہ کوئی شکوہ۔ ہاں انہوں نے اپنے دل میں ایک اٹل فیصلہ کر لیا' اور چپکے سے آسیہ بیگم کی زندگی سے نکل گئے۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے وقار کو ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ احساس تنہائی کا شکار نہیں ہوگا' اور اس کی تربیت بھی زیادہ بہتر انداز میں ہو سکے گی' کیونکہ وہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اسے پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے' مگر درحقیقت پپا نے اسے اپنے آپ سے دور کر کے بہت ظلم کیا تھا۔

مما کے بعد پپا سے دوری نے اسے بہت حساس' بہت زود رنج بنا دیا تھا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر مما زندہ ہوتیں تو پپا اسے کبھی اتنی دور نہ بھیجتے' اور یہ کہ پپا کو اس سے محبت نہیں رہی۔ اس لئے جب پپا نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیجنے کا ارادہ کیا تو وہ مچل گیا۔

"نہیں پپا میں باہر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اب نہیں لکھنا پڑھنا۔"

"تو پھر کیا کرے گا میرا بیٹا۔" پپا نے شفقت سے پوچھا۔

"میں آپ کے ساتھ کام کروں گا۔"

"پہلے میرا بیٹا بہت سارا پڑھ لکھ لے نا تو پھر۔"

"پپا...... آپ نہیں چاہتے کہ میں یہاں رہوں۔ آپ کے پاس۔" وقار نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"وقار بیٹے......" پپا حیران سے ہو گئے۔

"پپا آپ نے مجھے ہوش سنبھالتے ہی گھر سے باہر پھینک دیا' اور اب اتنی دور بھیجنا چاہتے ہیں۔" پپا تھوڑی دیر چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"تو تم اس انداز میں سوچ رہے ہو وقی بیٹے۔"

وقار چپ رہا' روٹھا روٹھا سا' ناراض سا۔

"بیٹے میری خواہش تھی کہ تم باہر سے کوئی ڈگری لے کر آتے' مگر خیر' تم نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"شکریہ پپا۔"

"ارے شکریہ کس بات کا' کوئی پپا کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے' میرا پگلا بیٹا۔"

پپا نے وفورِ محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

"اور بیٹے میں نے تمہیں ہوسٹل اس لئے داخل کرایا تھا کہ مجھے کاروباری سلسلے میں باہر رہنا پڑتا ہے' اور تم گھر میں نوکروں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہو' ہوسٹل میں کم از کم یہ تو تھا کہ تمہارے ہم عمر بچے تھے' جن کے ساتھ تم ہنس بول سکتے تھے' اور جو تمہیں احساسِ تنہائی سے بچا سکتے تھے۔"

"میں شکایت تو نہیں کر رہا پپا۔" وقار نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"نہیں یہ میری غلطی تھی' میں نے یہ نہیں سوچا کہ میں تو دوری کے اس کرب کو سہہ سکتا ہوں' مگر تم اس کے لئے ابھی بہت چھوٹے ہو۔"

"میرا مقصد آپ کو الزام دینا نہیں تھا پپا۔" وقار نے احتجاج کیا۔

"خیر یہ تمہاری سعادت مندی ہے' مگر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔" پپا نے اعتراف کیا۔

وقار نے پلکیں اٹھا کر پپا کو دیکھا۔ اُن کی نگاہوں میں بے پناہ محبت تھی۔

"نہیں پپا...... اب کچھ مت کہیں۔" اس نے بے اختیار پپا کے ہاتھ تھام کر التجا کی' اور نم نم آنکھیں لیئے' وہاں سے ہٹ گیا۔

اُن دنوں پپا نے اپنے دل میں چھپی ہوئی ساری محبت اس پر لٹا دی۔ وہ اس کے دل سے محرومی کے ہر احساس کو کھرچ دینا چاہتے تھے۔ اس تشنگی کو مٹا دینا چاہتے تھے جس نے اس کی روح کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لیے لیے پھرتے۔ کبھی اس کی خواہش پر پکنک کا پروگرام بنا لیتے۔ کبھی اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ وہ کسی چیز کی خواہش کرتا تو اس کے سامنے ڈھیر لگا دیتے۔ انہوں نے خود کو مکمل طور پر وقار کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کی رگ رگ سے محرومی و تشنگی کا زہر نچوڑ دینا چاہتے تھے۔ پپا کی بے پناہ توجہ پا کر وقار کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ کانٹا، سا جو اس کے دل میں چبھ رہا تھا' نکل گیا ہو۔ انہیں دنوں رزلٹ آؤٹ ہوا۔ وقار نے بہت اچھے مارکس لیے۔ پپا نے اس کی کامیابی کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جس میں وقار کے دوست احباب کے علاوہ ان کی جان پہچان کے

لوگ بھی مدعو تھے۔ اگلے دن ناشتے کی میز پر انہوں نے وقار سے پوچھا۔

"کہو بیٹے۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے......؟" وقار پورج میں دودھ ڈالتے ڈالتے رُک گیا۔

"آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔"

"سوال یہ نہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔"

وہ خاموشی سے دودھ کپ میں ڈالنے لگا۔

"بے جھجک کہو بیٹے۔ اگر تم مزید پڑھنا نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ پھر میرے لیے بس اتنا سا کام رہ جائے گا کہ تمہارے لیے ایک پیاری سی دلہن ڈھونڈ دوں اور۔"

"پپا۔" وقار نے جھینپ کر انہیں ٹوکا۔

"ہاں بیٹے۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔"

وقار نے سر اٹھا کر پپا کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔

"پپا میری خوشیوں کے لئے اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو کیا میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔" اس نے سوچا۔

"میں مزید تعلیم کے لئے باہر جانا چاہتا ہوں پپا۔"

اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"تم خود پر جبر تو نہیں کر رہے۔ اس دن تو تم......"

"نہیں پپا...... دراصل اتنے اچھے مارکس لے کر تعلیم ادھوری چھوڑ دینا' کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے بیٹے۔" پپا مطمئن ہو گئے۔

پھر اس کے جانے کی تیاریاں بڑی تیزی سے مکمل ہوئیں۔ جس صبح وہ جا رہا تھا۔ اس رات وہ دیر تک جاگتا اور پپا سے باتیں کرتا رہا۔ اور جب وہ سونے کے لئے لیٹا تبھی اسے نیند نہ آئی۔ پپا بھی کئی بار بے قراری کے عالم میں اٹھ کر وقار کے کمرے کی طرف آئے اور خواب گاہ کی کھڑکی میں سے کروٹیں بدلتے وقار کو دیکھتے رہے۔ جاتے وقت وہ بہت اداس ہو رہا تھا۔ سراج عالم بھی اپنے تاثرات چھپا نہ سکے۔

"بیٹے۔ میں تمہارے آنے کے انتظار میں ایک ایک دن گنوں گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اور میں آپ کی محبت کے سہارے یہ دن گزار دوں گا۔ پپا......" وقار نے جواب دیا۔

پپا اسے روز فون کرتے۔ اور جب کبھی انہیں کاروباری سلسلے میں باہر جانا پڑتا تو وہ ایک دو دن کے لئے ضرور اس کے پاس ٹھہرتے۔ پپا کی محبت نے اسے واقعی بڑا حوصلہ بخشا تھا۔ اور وہ اطمینان سے پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔

اُن دنوں اس کے امتحان ہو رہے تھے۔ جب پپا نے اس کی طرف رومی کی تصویر بھیجی۔ اس ریمارک کے ساتھ کہ اگر یہ پیاری سی لڑکی تمہاری دلہن بن جائے تو کیسا رہے۔

وقار نے تصویر دیکھی تو مبہوت رہ گیا۔ خوبصورت غزالی آنکھیں۔ موزوں نقش نگار...... خمیدہ ہونٹوں پر بے حد دلآویز مسکراہٹ...... جیسے کوئی کلی دھیرے سے کھل اُٹھے۔

پھر پپا کا فون آیا۔ تو اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔ "پپا...... آپ نے یہ اتنی پیاری سی لڑکی کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔" پپا شفقت سے ہنسے۔

"میاں ممتاز کی بیٹی ہے...... اور میاں ممتاز میرے بہت اچھے دوست ہیں۔"

"پپا...... آپ نے تو یہ تصویر بھیج کر میرے لئے امتحان دینا مشکل کر دیا۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"اچھا!" پپا ہنسے۔ "ایسا کرو جلدی سے امتحان دے ڈالو۔ جب آؤ گے نا تو یہ پیاری سی لڑکی تمہاری دلہن ہوگی۔"

"تھینک یو پپا۔ تھینک یو۔"

پپا نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر پپا کے خط سے اسے معلوم ہوا کہ پپا نے اس کے نام کی انگوٹھی رومی کے ہاتھ میں پہنا دی ہے۔ وہ تفصیل پڑھتا اور مسکراتا رہا اور جب وہ وطن واپس پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ پپا نے شادی کی تاریخ طے کر دی ہے اور ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد دلہن بن کر رومی ان کے گھر کو جگمگا رہی ہوگی۔ اس اثناء میں وقار نے بہت کوشش کی رومی کی ایک آدھ جھلک دیکھ لے، مگر ممکن نہ ہوا۔ یوں تو وہ لوگ خاصے ماڈرن اور آزاد خیال تھے، مگر شادی سے چند دن پہلے وہ لڑکی، لڑکے کا ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر رومی کی چھوٹی بہن روبی نے سے مایوس دیکھ کر کہا۔

"کیا خیال ہے وقار بھائی! آپ پر احسان نہ کر دیا جائے۔"

"ہوں۔ خیال تو نیک ہے۔"

"اچھا۔ پھر میں بجو کو کسی بہانے سے ادھر لاتی ہوں، آپ یہاں کھڑکی میں سے دیکھ لیجیے گا۔ البتہ بات نہ ہو سکے گی۔"

"خیر اتنا بھی غنیمت ہے۔" وقار نے بیتابی سے کہا۔ روبی ہنستی ہوئی چلی گئی۔

اور جب اس نے رومی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اخروٹی رنگت کے بالوں اور سبز آنکھوں والی یہ لڑکی اپنی تصویر سے بدرجہا خوبصورت تھی۔ پھر تو ایک ایک پل کاٹنا اس کے لئے مشکل ہوگیا۔ اور بارات والے دن تو اس کی بیتابیاں عروج پر تھیں۔ آنکھوں میں سپنے سے جاگ رہے تھے اور ہونٹ رہ رہ کر مسکرا اٹھتے۔ ایک خواب کے سے عالم میں وہ ساری رسومات سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ آرسی مصحف کا وقت آگیا۔ مگر یہ کیسا قیامت خیز لمحہ تھا۔ وقار تو اس کے بے پناہ حسن سے مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ مگر رومی کی نظریں آئینے پر جم سی گئیں۔ پھر اس نے ایک دم وحشت زدہ ہو کر آئینے پر سے نظریں اُٹھا کر وقار کو دیکھا۔

"اوہ نو اٹ از امپاسیبل۔" وہ چلائی اور دوپٹے کو نوچتی اُٹھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔

وقار حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہاں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی بھی دلہن کے...... اس اقدام کی وجہ نہیں جانتا تھا۔ دلہن کی بہنیں بھی ششدر سی کھڑی تھیں۔ پھر جیسے انہیں ہوش آگیا، اور وہ بھی دلہن کے پیچھے لپکتی ہوئی چلی گئیں۔ معلوم ہوا، دلہن بیگم روئے جا رہی ہیں، کہ وہ یہ شادی نہیں کریں گی۔

"اری کمبخت...... اب کون سا انکار کا وقت ہے، جب کہ نکاح بھی ہو چکا۔" رومی کی امی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بس یہ رخصتی نہیں ہوگی۔ آپ اس سے طلاق لے لیں۔" اُس نے سرکشی سے کہا۔

"ہیں۔" اس کی امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اگر کسی نے سن لیا تو کتنی سبکی ہوگی۔

"تم سے پوچھے بغیر تو کچھ نہیں کیا۔" انہوں نے غصے سے کہا۔

"اُس وقت کیا حلق میں کچھ ٹھونسے بیٹھی تھی۔"

"فراڈ......" رومی ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے چلائی۔ "ایکدم فراڈ...... آپ نے جو تصویر دکھائی تھی۔ اس میں تو وہ اتنا خوبصورت نظر آتا تھا۔ مگر آپ نے اسے دیکھا ہے۔ کالا کلوٹا...... شب دیجور......"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں بجو۔" روبی نے چڑ کر کہا "اتنے اچھے تو ہیں وقار بھائی۔"

"اتنے ہی اچھے ہیں تو تم خود کر لو اس سے شادی۔" دلہن بیگم پھٹ سے بولیں۔ روبی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ رومی کی امی بوکھلا کر رہ گئیں۔

"خدایا...... اب کیا ہوگا۔ یہ سدا کی خودسر اور اکھڑ لڑکی۔ موقع کی نزاکت سے ناآشنا۔ جانے کیا کر بیٹھے۔" انہوں نے فوراً میاں ممتاز کو بلا بھیجا۔

میاں ممتاز نے سب لوگوں کو باہر نکال کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ اور جب گھنٹہ بھر بعد وہ باہر نکلے تو رومی رضا مند ہو چکی تھی۔ اُدھر وقار دلہن کے اس طرح بھاگ اُٹھنے پر بہت پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، کہ سب کیا ہے...... رہ رہ کر یہ خیال اس کے ذہن میں کچوکے لگاتا کہ یہ شادی رومی کی مرضی سے نہیں ہو رہی۔ اور پریشان تو سراج عالم بھی بہت تھے۔ پھر اڑتی اڑتی دلہن کے انکار کی خبر ان تک پہنچی تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ انہوں نے وقار سے یہ بات چھپالی۔ مگر کسی طرح وقار کو بھی معلوم ہو گیا۔ اسے لگا جیسے سہرے کے پھولوں میں آگ لگ گئی ہو۔ اور اس کے سارے خواب جل کر راکھ ہو گئے ہوں۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر سہرا نوچ کر پھینک دیا۔

"چلیں پپا...... واپس چلیں۔"

سراج عالم نے سر جھکا لیا۔ اب وہاں رکنے کا جواز بھی کیا تھا۔ مگر جب بارات واپس جانے لگی تو میاں ممتاز گھبرائے گھبرائے، اڑی اڑی رنگت اور فق چہرے کے ساتھ لپکے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی ٹوپی اتار کر سراج عالم کے پاؤں میں رکھ دی۔

"سراج۔ یہ ظلم نہ کرو۔ میری عزت تمہارے پاؤں میں ہے۔"

"مگر ممتاز میاں۔"

"بچی ہے۔ ناسمجھ ہے۔ معاف کر دو اُسے۔" میاں ممتاز ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مگر پپا اتنی ذلت کے بعد......" وقار نے کچھ کہنا چاہا۔

"بیٹے......!" پپا نے نرمی سے اس کے شانے تھپکے۔ "میاں ممتاز میرے دوست ہیں، اور بیٹی کے باپ۔"

پھر اس نے کچھ نہ کہا، اور چپ ہو گیا۔ مگر اس کے اندر کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا۔ ساری خوشی جیسے مر سی گئی۔ نہ کوئی اُمنگ رہی۔ نہ اشتیاق۔ بجھے بجھے دل سے وہ ساری رسومات سے

گزرتا رہا۔ اس کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے، اور ذہن ماؤف۔ رخصتی کے وقت جب دلہن کو اس کے ساتھ بٹھایا گیا تو بھی اس نے دلہن کو دیکھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اور خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔

وہ چپ تھا' بے حد چپ۔ اُس کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں۔ اور آنکھوں میں خاموش طوفان۔ بار بار اس کی کنپٹی کی رگ کسی غیر معمولی ڈپریشن سے پھڑکنے لگتی۔ اور آنکھوں میں ڈورے سے کھنچ جاتے۔ سراج عالم اس کی یہ حالت دیکھ رہے تھے۔ اور پریشان تھے۔ بار بار وہ اس کے قریب آتے کچھ کہنا چاہتے، مگر کچھ کہہ نہ پاتے۔ دلہن حجلہ عروسی میں کہیں اس کی منتظر تھی، مگر وہ ہال کے وسط میں کھڑا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

"وقار بیٹے۔ جاؤ وہ تمہاری منتظر ہے۔" بالآخر پپا نے کہا۔

"شاید۔"

وقار کے ہونٹوں پر مجروح سی ہنسی بکھر گئی۔ اس نے طنزیہ نظروں سے پپا کو دیکھا، تو پپا کی نظریں جھک گئیں۔

"بیٹے۔ کسی کی غلطی معاف کر دینا بڑے ظرف کی بات ہے۔ اور وہ بچی ہے۔"

"ہاں پپا!" وقار نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی۔

"پپا! آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کو میاں صاحب کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دوں گا۔"

سراج عالم کچھ نہ کہہ سکے۔ ان کا دل بھر آیا۔ انہیں کتنی خوشی تھی، بیٹے کی شادی کی۔ مگر اس ناگوار واقعہ سے ان کا دل بجھ سا گیا۔ وہ بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وقار نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سیاہ مخملیں ڈبہ کھولا، جو پپا اس کے ہاتھ میں تھما گئے تھے۔ اور لمحہ بھر وہ ہیرے کے اس خوبصورت سے سیٹ کو دیکھتا رہا۔ اسے یاد آیا۔ اس نے کتنے چاؤ سے ہیرے کے بے حد نفیس کنگن خریدے تھے۔ اس کا ارادہ تھا، یہ کنگن وہ رومی کو رونمائی میں دے گا۔ مگر اب خوشی اس کے اندر کہیں مر سی گئی تھی۔ اور دل میں کوئی بھی آرزو باقی نہ رہی تھی۔

وہ بے دلی سے کمرے میں چلا آیا۔ اور کتنی ہی دیر کمرے میں بے قراری سے ٹہلتا رہا۔ بالآخر وہ مسہری کے قریب رکا، اور پھولوں کی لڑیاں ہٹائیں اور بغیر کسی اشتیاق کے دلہن کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھونگھٹ الٹ دیا۔ پل بھر کے لئے اس کا حسن اسے مبہوت کر گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔

"رومی۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا، کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ کوشش کروں گا، کہ اس ناگوار واقعہ کو بھول جاؤں مگر......"

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات ادھوری چھوڑ دی اور مخملیں ڈبہ بغیر کھولے رومانہ کی گود میں رکھ دیا۔ رومانہ نے ڈبہ کھولا۔ جگمگاتے ہیرے چاروں طرف کرنیں سی بکھیرنے لگے۔

رومانہ تلخی سی مسکرائی۔

"بے حد خوبصورت۔ مگر یہ زندگی کا انجام ہے یا آغاز۔"

"پتا نہیں۔ شاید تمہیں خبر ہو۔" وقار نے آہستہ سے کہا۔

"ہیرا ہر کسی کو راس نہیں آتا۔ بعض اوقات یہ ہلاکت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔"

رومانہ اُسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔ وقار نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ خود بھی ہیرے کی طرح جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ مگر اسی کی طرح سرد، بے حس اور بے رحم۔

"ہاں۔ ایک یقینی موت۔" اس نے اعتراف کیا۔

"تم جانتے ہو۔ تم میرا آئیڈیل نہیں۔" وہ لفظوں کے خنجر سے اسے ہلاک کر رہی تھی۔

"میں کبھی بھی تمہیں چاہ نہیں سکتی۔"

وقار کا سارا وجود جیسے برف کی سل میں تبدیل ہو گیا اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا۔ مگر آنکھوں کے سامنے بہت سا اندھیرا حائل ہو گیا۔ پھولوں کی لڑیاں خوبصورتی سے سجا ہوا کمرا۔ اور وہ ہیرے کی طرح جگمگاتی بے رحم لڑکی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی، اس کی کنپٹی کی رگیں اُبھر کر تن سی گئیں۔ اور کچھ دیر کے لئے اس کی نظریں بصارت سے محروم ہو گئیں۔ اسے لگا جیسے اس کا دل گھٹ رہا ہو، اور جیسے وہ برسوں پیچھے چلا گیا ہو۔ جب مما نے اسے اسٹور میں بند کر دیا تھا۔ رات کا وقت تھا اور وہاں بہت اندھیرا تھا۔ وہ دروازے پر مکے مار مار کر چلا رہا تھا۔

"مما۔ پلیز مما۔ لائٹ تو آن کر دیں۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔"

مگر مما سن ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ مزے سے وی سی آر پر فلم دیکھتی رہیں۔ اور روتے

روتے وہ بے حال ہو گیا۔ اُس کی ویران آنکھوں میں دھیرے دھیرے روشنی لوٹ آئی۔

"رومانہ بیگم۔ تم اتنی بے اختیار تو نہ تھیں۔ جب اتنی جرأت کر ہی لی تھی تو پھر انکار پر قائم رہتیں۔" اس نے بیحد کرب سے کہا۔

"ہاں۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔" وہ طنز سے مسکرائی۔ "میں اپنے والدین کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔"

"مگر میں تو مجبور نہیں۔ میں تمہیں طلاق......"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکو گے۔ ہم دونوں نباہ پر مجبور ہیں۔"

"کیوں۔ کیوں نہیں۔" وقار نے ہٹ دھرمی سے پوچھا۔

"تمہارے پپا۔ کیا وہ کسی اسکینڈل کے متحمل ہو سکیں گے۔"

وقار چپ ہو گیا۔ اسے کوئی پروانہ تھی کہ لوگ کیا کہتے ہیں مگر پپا۔ کیا وہ لوگوں کی باتیں سن سکیں گے۔ لوگوں کی اشارے بازیاں' اور طنزیہ ہنسی' اور پھر پپا میاں صاحب کے دوست بھی تھے۔ اسے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے کچھ سوچنا تھا۔ وہ پپا کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ خواہ اس کے دل پر کچھ بھی بیت جائے' اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تم نے مجھے یہ کس قصور کی سزا دی ہے، رومی۔" وہ کراہ اُٹھا۔

"قصور تو میرا بھی کوئی نہیں۔"

رومانہ تلخی سے ہنسی۔ زہر میں بجھی ہوئی ہنسی وقار کے دل کو چیرتی چلی گئی۔ اور رکھر کی طرح گرتی بر فیل اداسی اس کے سارے جذبوں کو سرد کر گئی۔

پھر ولیمہ کے بعد دعوتوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس نے وقار کو بری طرح بیزار کر ڈالا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کہ لوگ اس قدر خوش کیوں ہیں۔ جب کہ وہ اتنا ناخوش ہے۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ وہ قہقہے لگائے۔ خوب دل کھول کر ہنسے اور اس عجیب و غریب سچویشن سے لطف اندوز ہو۔ مگر جب بھی ہنسنا چاہتا' قہقہے اس کے اندر گھٹ کر رہ جاتے۔ اور بہت سارا غصہ اس کے اندر اُمڈ آتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ ان ہنستے مسکراتے لوگوں کو پیس کر رکھ دے۔ مگر وہ برداشت کر رہا تھا۔

اس دن بھی وہ کرسی پر نیم دراز آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہا تھا۔ ملحقہ کمرے میں رومانہ اپنی کسی دوست کے ساتھ باتوں میں معروف تھی۔ دونوں کی باتوں، ہنسی اور قہقہوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آواز اس کے کانوں تک آرہی تھی۔ مگر اس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا اور کیونکر ہوا۔ یہ لڑکی' جسے پہلی ہی نظر میں اس نے اپنے دل کے قریب محسوس کیا تھا، کس قدر ستمگر نکلی۔ اس نے تو اسے اذیت دینے کے سارے ہی طریقے آزما ڈالے تھے۔ بات بے بات طنز کرنا۔ اپنی من مانی کرنا اور اسے خاطر میں نہ لانا۔ وہ کس کس طریقے سے اسے اپنی ہی نظروں میں گرا رہی تھی۔ وقار نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ رومانہ نے ایک چھوٹا سا کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

"Poorboy" (بیچارا لڑکا)

پتا نہیں اس نے کس کے متعلق کہا۔

رومانہ کی دوست بے اختیار ہنسی پھر ہنستے ہنستے اس نے کہا۔

"اس کی بات چھوڑو روبی ڈیئر۔ یہ بتاؤ تمہارا ہسبنڈ۔"

"اوں ہوں۔ ہسبنڈ کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" وقار کا دھیان اب پوری طرح ان کی طرف تھا۔

"ویسے بائے داوے۔ ایک بات تو بتاؤ روبی۔ جب تم آرسی مصحف کے وقت بھاگ گئیں اور وقار کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو تمہارے ڈیڈی نے علیحدگی میں تم سے کیا کہا تھا۔"

"میرے ڈیڈی بڑے سیاستدان ہیں۔" روبی کے لہجے میں طنز تھا۔

"انہوں نے مجھے مجبور نہیں کیا بس یہ کہا کہ اگر وقار کے ساتھ میری رخصتی نہ ہوسکی تو وہ مجھے یوسف کے ساتھ بیاہ دیں گے۔ اور یہ ان کا فیصلہ اٹل ہے۔"

"پھر......؟"

"پھر کیا...... کیا میں اس قلاش کے ساتھ سر پھوڑتی۔ مانا کہ وہ میرا کزن ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ مگر کسی مقام تک پہنچتے پہنچتے اسے وقت لگتا۔ سو میں نے وقار کے حق میں فیصلہ دے دیا۔"

"تو اب تم مطمئن ہو۔"

"آں ہاں۔" روبی نے قہقہہ لگایا" اس لیے کہ دولت زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ اور ڈیڈی مجھے سزا دینا چاہتے تھے۔"

"سزا تو مجھے مل رہی ہے۔" وقار نے بے قرار ہوکر کنپٹیاں دونوں ہاتھوں سے دبالیں۔

"میرے خدا۔ یہ کیسا عذاب ہے۔ کسی خوبصورت جذبے کے بغیر زندگی بسر کیے جانا۔ اور یہ لڑکی وہ ہے، جس کے لئے میں نے اپنے دل کے سارے دروازے کھول دیے تھے۔ اور جس کے سارے دروازے، ساری کھڑکیاں اور سارے روشندان بند ہیں۔ مگر کیا خبر کبھی کوئی ایک دریچہ میرے لیے کھل جائے۔ اور کوئی خوبصورت سا جذبہ ان آنکھوں میں جوت جلا دے۔ اور محبت کی کوئی ایک کرن میری محروم جھولی میں بھی آ کر گرے۔ اس نے نڈھال سا ہوکر کرسی پر سر ڈال دیا۔ ساتھ والے کمرے میں خاموشی تھی۔ شاید روبی اپنی دوست کے ساتھ جا چکی تھی۔

پھر دن یونہی ویران ویران سے گزرنے لگے۔ روبی کو نہ گھر سے کوئی دلچسپی تھی، نہ گھر والوں سے۔ بیشتر وقت وہ گھر سے باہر گزارتی۔ اس کی اپنی دلچسپیاں تھیں اور اپنی معروفیات۔ کلب کے ہنگاموں اور ہاؤ ہو میں اس کا دل خوب لگتا۔ اور وہ ہر طریقے سے وقار کو اذیت دینے کی کوشش کرتی۔ اگر دونوں کو کہیں ساتھ جانا پڑتا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ وقار سے دور دور رہے۔ ایک بار جب دونوں کوئی فنکشن اٹینڈ کر کے واپس آئے تو وقار نے اسے سمجھانا چاہا۔

"روبی۔ اب تم میری بیوی ہو۔ میری زندگی کی ساتھی۔ پھر یہ اجتناب کیسا۔"

"بات یہ ہے کہ جب تم میرے قریب ہوتے ہو تو میں بُری طرح کمپلیکس میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔" روبی نے بیحد صفائی سے کہا۔

"لوگ ہمیں ساتھ ساتھ دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے۔"

"کیوں کیا ہم میاں بیوی نہیں۔" وقار نے برہمی سے پوچھا۔

"ہاں۔" روبی نے ہاں کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا "مگر......"

اس نے اپنی بات مکمل نہیں کی۔ مگر وقار اس کی بات سمجھ گیا۔ اور اس کا چہرہ تپ سا گیا۔ مگر وہ کوئی سخت جواب دیتے دیتے رہ گیا۔ وہ جانتا تھا، روبی اسے پسند نہیں کرتی۔ اور اُس کی اُتھلی ظاہر بین نظریں اس کے اندر کو نہیں کھوج سکتیں۔ وہ تو بس اوپر اوپر سے دیکھتی ہیں۔ اور اس نے جو دریچے آرسی مصحف کے وقت اس پر بند کر دیے تھے۔ وہ اب کبھی نہیں کھل سکتے۔

وقار بری طرح احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے لگا۔ اسے اپنی ذات پر سے اعتماد جاتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا۔ رومی بار بار اس کی انا کو مجروح کرتی۔ اسے کچوکے لگاتی۔ عجیب سی راہوں پر چل پڑی۔ وقار اسے روک نہ سکا۔ جب بھی وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا۔ اس کا حوصلہ جواب دے جاتا۔

"پتا نہیں...... ظلم اس پر ہوا ہے، یا مجھ پر؟" وہ بے قراری سے سوچتا۔ "شاید میں ہی اس کے قابل نہ تھا۔" اس کا احساسِ کمتری بری طرح اس پر یلغار کرآتا اور وہ چپ کا چپ رہ جاتا۔ اس نے رومی کو اپنے معاملات میں یکسر آزاد چھوڑ دیا۔ وہ جو چاہتی' کرتی اُسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔

پھر حالات زیادہ ہی دگرگوں ہونے لگے۔ اقبال چودھری کے ساتھ اس کا اسکینڈل تیزی سے مشہور ہونے لگا۔ یہ اقبال چودھری وقار کا بچپن کا دوست تھا اور اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کئی ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ لوگوں کو بات کرنے کے لئے دلچسپ موضوع مل گیا۔ ہر جگہ رومی، وقار اور اقبال موضوع بحث بننے لگے۔ کلب پارٹیز اور فنکشنز میں ایک ہی ذکر ہوتا۔ وقار کے لئے اپنی فیلنگز چھپانا مشکل ہوگیا۔ اس نے محفلوں میں جانا چھوڑ دیا۔ اور لوگوں سے دور بھاگنے لگا۔ ایک دم ہی اس کا دل ساری دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔

تب اس دن پپا شام کے ملگجے سے اجالے میں اس کے کمرے میں چلے آئے۔ انہوں نے اس کے تھکے تھکے ویران چہرے کو بغور دیکھا اور ان کا دل کٹنے لگا۔

"وقار۔ بیٹے تم اُسے روکتے کیوں نہیں۔" انہوں نے بیحد دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"مگر کیسے پپا؟" وقار کی سرخ سرخ شب بیدار آنکھوں میں عجیب سی یاسیت تھی۔

"پھر پپا۔ وہ میری پابند ہی کب تھی؟"

اس نے زہر خند سے کہا۔

"کچھ بھی ہو بیٹے۔ تم اسے سمجھاؤ۔"

پپا نے بے حد دُکھ سے کہا۔

"اچھا پپا!"

اس کے لہجے میں بے پناہ تھکن تھی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے احساس ہوتا ہے' جیسے مجھ سے کوئی بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ مجھے اتنی عجلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

پپا اس کی حالت دیکھ کر شرمندہ تھے۔

"چھوڑیئے پپا۔ آپ تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ پھر وہ آپ کی ہی نہیں میری بھی پسند تھی۔"

پپا بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ اس سے باتیں کرتے رہے۔ اسے اجڑا اجڑا دیکھتے اور کڑھتے رہے، اور سوچتے رہے کہ خاندان کی عزت کیسے بچائی جائے۔ وہ چاہتے تھے وقار زندگی کے معمولات میں دلچسپی لے اور واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ اور اگر رومی کے سدھرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اسے چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ دوستی پر اولاد کو قربان نہیں کر سکتے۔ وہ جو غلطی کر چکے تھے، اس کی تلافی کے لئے تیار تھے، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور چپ چاپ منہ موڑے ناراض ناراض سا جیسے ساری دنیا سے خفا پڑا رہا۔ اور وہ اسے زندگی کی طرف بلاتے بلاتے خود زندگی سے منہ موڑ گئے۔

اُسی شام انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اور وقار نے انہیں نہایت عجلت اور گھبراہٹ میں ہاسپٹل میں داخل کرا دیا۔ رات بھر پپا موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہے اور ان کے گرد ڈاکٹروں کا ایک ہجوم اُن کی جان بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ صبح کے وقت اُن کی حالت قدرے بہتر ہوئی، تو اُنہوں نے وقار کا پوچھا۔ وقار لپک کر اُن کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتے رہے۔ انہیں اپنے بیٹے کی بربادی کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔

"پپا۔ پلیز پپا پریشان مت ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پپا نقاہت سے مسکرائے۔ انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ شاید وہ رومی کو دیکھنا چاہ رہے تھے۔ مگر رومی وہاں نہیں تھی۔ وقار کی نگاہیں جھک گئیں۔ اور پپا کے منہ سے بے اختیار ایک آہ نکل گئی۔

پھر وہ وہاں سے ہٹ آیا اور موقع ملنے پر گھر دوڑ آیا وہ چاہتا تھا، کہ اس وقت رومی پپا کے قریب رہے۔ مگر رومی نے صاف انکار کر دیا۔

"تمہارے پپا...... میری ذمہ داری نہیں۔"

"تمہیں ان کی خدمت نہیں کرنی پڑے گی۔"

وقار نے تلخی سے کہا۔

"اس کام کے لئے نرسیں بہت ہیں۔ مگر تم ان کی بہو ہو اور تمہیں اُن کے قریب ہونا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہیے۔"

"فضول......"

اس نے تنفر سے ہونٹ سکوڑے "میں ہاسپٹل کے بیمار ماحول میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ یوں بھی میرا اقبال کے ساتھ پروگرام طے ہے۔"

اس پر وقار غصے سے سُرخ پڑ گیا۔ دونوں کے درمیان کافی تلخ کلامی ہوئی، مگر اس کے باوجود وہ پرس جھلاتی اقبال کی بانہوں میں بانہیں ڈالے چلی گئی تو وہ واپس ہاسپٹل لوٹ آیا۔

اگلے دن رومی نے عدالت میں خلع کی درخواست دے دی، جب وقار کو پتا چلا تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

"بے وقوف عورت۔ اگر تمہیں علیحدگی چاہیے تھی تو مجھ سے بات کرتیں۔ یوں دنیا کو تماشا دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارا یہ اقدام تو پپا کی زندگی خطرے میں ڈال دے گا۔"

اس نے دانت پیس لیے۔

وقار نے بہت کوشش کی کہ بات پپا تک نہ پہنچے۔ ایک ایک کو منع کیا۔ پھر بھی جانے کس نے پپا کو سب کچھ بتا دیا اور اس دن پپا کو دل کا دوسرا جان لیوا دورہ پڑا۔ اور وہ اسی حالت میں ختم ہوگئے۔ وقار نے یہ اتنا بڑا غم چپ چاپ جھیل لیا۔ مگر اس کا دل ساری دنیا اور دنیا کے لوگوں سے اچاٹ سا ہوگیا۔ اس کے دل میں ایکا ایکی اتنی نفرت، بیزاری اور آگ بھر گئی۔ جس نے اس کے سارے وجود کو زہریلا کر دیا۔ اور اچانک ہی اس نے وہ نامہربان شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' جس نے ہمیشہ اس کی محبتیں چھینی تھیں اور اس کی خوشیوں پر ڈاکا ڈالا تھا۔ اور اب اس کے پاس کیا تھا۔ نہ محبت بھری کوئی نظر، نہ شفقت بھرے ہاتھ اور نہ کوئی گدگدی کرتا جذبہ۔ وہ تو بالکل تہی دامن تھا۔

اس نے اپنے وکیل سے مل کر جلدی جلدی تمام انتظامات مکمل کیے۔ اور اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ جس سے اس کی بہت سی خوشگوار و ناخوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ اور ایک اجنبی شہر میں نئے سرے سے زندگی کی ابتداء کی۔ جہاں بہت کم لوگ اسے جانتے تھے۔ اور کوئی بھی اس کی زندگی کے المیے سے آگاہ نہ تھا۔

گو اس نے اپنے آپ کو ساری دنیا کے لوگوں سے کھینچ لیا تھا۔ اور اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ مگر اب یہ پتھر موم ہو رہا تھا۔ اس کے بنجروں میں پھر کوئی کونپل پھوٹ رہی تھی۔ پھر کوئی

آرزو رہ رہ کر اسے بے چین کرتی۔ اور یہ سب اس لڑکی کی وجہ سے تھا۔ جو جان بوجھ کر بار بار اس کی راہوں میں آتی۔ جو اسے اس سے چھین لینا چاہتی تھی۔ شاید وہ اسے ایک بار پھر اسی احساس شکستگی سے دوچار کرنا چاہتی تھی، جس نے اسے بری طرح کمپلکس میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر کیوں؟ وہ اسے کیوں ہرانا چاہتی تھی۔

وہ سوچے چلا جاتا، پھر اسے رومانہ یاد آجاتی اور اس کا چہرہ سخت پڑ جاتا۔ ایک عجیب قسم کا غصہ بل کھا کھا کر اس کے اندر سے اٹھتا۔ پھر سارے گداز جذبے بن موت مرنے لگتے اور ہر چیز سرد بے مہر برف کا لبادہ اوڑھ کر گہری نیند سو جاتی۔

"نہیں شہنیلہ احمد نہیں۔ میں ہاروں گا نہیں میں اس حصار کو توڑ ڈالوں گا، جو تمہاری نظروں نے میرے اردگرد بن رکھا ہے۔" اس نے عہد کیا۔

"ایسا نہ ہو کہ تم اس سے جدا ہو کر خود سے بھی بچھڑ جاؤ۔"

کسی نے چپکے سے اس کے اندر سے کہا۔

"میرا دل شیشے کا بنا ہوا نہیں۔"

اس نے خود کو یقین دلایا۔

"اور میں اسے اکھاڑ پھینکوں گا۔"

مگر وہ اسے اکھاڑ نہ سکا۔ دن بدن وہ اس کے اندر زیادہ گہرائی میں اترتی گئی۔

"میں پھر ٹوٹنا نہیں چاہتا۔"

اس نے اپنے آپ سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں' جیسے اپنے آپ سے بھی بھاگ رہا ہو۔ اور اس سے بھی۔ مگر اس کی بند آنکھوں میں اس کا خوبصورت سراپا لہرانے لگا تو جھنجھلا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ عورت۔ دنیا کی سب سے ناقابلِ اعتماد مخلوق۔"

اس نے نفرت سے کہا۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا غم ابھی تک اس کے دل میں تازہ تھا۔

"زہر کا علاج زہر ہے۔" دفعتاً اس نے قہقہہ لگایا۔ اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں۔ میں اسے خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔ کبھی نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور آنکھیں بند کر کے بھاگنے لگا۔ سرپٹ۔ بغیر کسی منزل کا تعین کیے۔ کبھی اس طرف کبھی اس جانب۔ کبھی اس نے روزینہ کی زلفوں میں پناہ لی۔ کبھی مس گینو کی سحر انگیز آنکھوں میں ڈوب گیا اور کبھی مہ پارہ کی بانہوں میں اس نے سب کچھ بھلا دینا چاہا۔ وہ جو عورتوں سے الرجک تھا، محض ایک لڑکی سے بچنے کے لئے ہر عورت کے پیچھے بھاگنے لگا۔ مگر اس دن مہ پارہ کے ساتھ رقص کرتے کرتے جب اس کی نظریں شہنیلا کی حیران آنکھوں سے ٹکرائیں۔ تو اسے محسوس ہوا کہ سب کچھ رائیگاں گیا۔ وہ اس سے بھاگ نہیں سکتا۔

وہ ان آنکھوں کے حصار سے کبھی خود کو باہر نہیں نکال سکتا۔ اور اس کی یہ ساری حرکتیں بے معنی اور فضول ہیں۔ اور یہ کہ وہ اس لڑکی سے شکست کھا چکا ہے۔ مکمل شکست...... یہ احساس اس قدر وحشت زدہ کر دینے والا تھا کہ وہ بوکھلا کر مہ پارہ کو دھکیلتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا۔

✦

پھر بہت دنوں تک تمہارے متعلق کوئی نئی افواہ نہ سنی۔ تم نے ویدی کے گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور ایک بار پھر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ آنٹی کئی بار تمہیں پوچھ چکی تھیں اور کئی بار انہوں نے تمہیں فون بھی کیا تھا۔ مگر جو ملازم بھی فون اٹھاتا یہی بتاتا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ میں اکثر تمہارے متعلق سوچتی۔ پھر بال روم کا وہ منظر پوری طرح میری نظروں کے سامنے اُجاگر ہو جاتا۔ وہ تمہارا مہ پارہ کو دھکیل کر بھاگ اٹھنا۔ اور مہ پارہ کا گلابی چہرہ۔ وہ تمہارے متعلق لوگوں کی قیاس آرائیاں۔ کوئی انجانا سا مانوس خیال بار بار میرے اندر سے اٹھتا۔ مگر پوری طرح میری گرفت میں نہ آتا۔ بار بار کوئی بات میرے ذہن میں آتے آتے رہ جاتی۔

پھر بہت دنوں بعد اس دن جب بینا کے گھر والے سب کہیں مدعو تھے، اور میں خوامخواہ بور ہو رہی تھی، میں فوزی سے ملنے چلی گئی۔ خیال تھا کہ واپسی پر فوزی کا بھائی مجھے چھوڑ جائے گا۔ مگر فوزی کا بھائی کسی کام سے کوئٹہ گیا ہوا تھا۔ چنانچہ مجھے اکیلے واپس آنا پڑا۔ جب دیر تک کوئی سواری نہ ملی تو میں پیدل ہی چل پڑی کہ جہاں کہیں کوئی رکشا نظر آیا۔ لے لوں گی۔ پھر سڑک پر چلتے چلتے میرے پاؤں تھکنے لگے۔ تب ہی ایک گاڑی میرے قریب سے گزرتے گزرتے رک گئی۔

’’شہنیلا۔ آپ یہاں۔‘‘

تمہاری مانوس آواز میرے کانوں میں ٹکرائی میں ٹھٹک کر رُک گئی اور اس وقت میں نے تمہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھوں میں کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ سڑک پر دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ پھر یکدم تم مسکرائے۔

’’کہاں جا رہی ہیں آپ۔ آیئے میں ڈراپ کر دوں۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں نے گھبرا کر کہا۔ ’’شکریہ۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔‘‘

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تب ہی رکشے کی آواز آئی۔ میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اور تیزی سے لپکتے ہوئے رکشے کو رُکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ اپنی گھبراہٹ میں، میں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ رکشے میں پہلے سے ایک آدمی موجود ہے۔ رکشا تیزی سے بغیر رُکے میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اور میں خفت سے سرخ پڑ گئی۔ اس لمحے مجھے اپنے بازو پر تمہاری گرفت محسوس ہوئی۔

"آیئے۔ اس علاقے میں کسی سواری کا ملنا بہت مشکل ہے۔" تم نے نرمی سے کہا۔

"مگر...... میں...... نہیں......"

میں نے ہچکچاتے ہوئے انکار کر دیا۔ تمہارا بدلا بدلا رویہ مجھے بوکھلا دینے کے لئے کافی تھا۔

"آیئے۔ میں یہاں کھڑا منتیں ہی نہیں کرتا رہوں گا۔" تمہارے لہجے میں تحکم تھا اور تمہاری گرفت سخت پڑ گئی تھی۔ میں مجبوراً تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس ناگہانی افتاد پر میرا دل دھک دھک کیے جا رہا تھا۔ کیا میں نے تمہارے ساتھ آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ میں سہمی جا رہی تھی۔ پھر عجیب سے پچھتاوے نے مجھے گھیر لیا۔ اے کاش میں وہاں سے اکیلی نہ نکلتی۔ وہیں رہ جاتی یا پھر ویدی کو فون کر دیتی۔ اور وہ آ کر مجھے لے جاتا۔ میں نے چپکے سے تمہیں دیکھا۔ تم خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ تمہیں خاموش دیکھ کر میری ڈھارس سی بندھی۔ پھر جب میں چونکی تو گاڑی عالم ولا کے سامنے رک چکی تھی۔

"آیئے ایک کپ چائے ہو جائے۔"

"نہیں پلیز۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔" میں نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"آیئے۔ میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا۔" تمہارا لہجہ درشت ہو گیا۔

"کچھ بعید بھی نہیں۔" میں کہتے کہتے رک گئی۔

"دراصل مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" تم نے پھر اصرار کیا۔

میں نے پل بھر کے لئے سوچا۔ پھر کوئی مفر نہ پا کر تمہارے ساتھ چل پڑی۔ پتا نہیں تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے، میں متذبذب سی سوچنے لگی۔ تم مجھے لیے لیے جس کمرے میں آئے وہاں چاروں طرف کتابیں خوبصورت الماریوں میں قرینے سے سجی تھیں۔ اور جابجا بھی مورتیاں اپنی سنگی آنکھوں سے گھور رہی تھیں۔

میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ تم کچھ الجھے الجھے سے جانے کیا سوچ رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے، آپ کو پتھروں سے بہت دلچسپی ہے۔" کمرے کی غیر فطری خاموشی سے گھبرا کر میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ میں انسانوں کا ڈسا ہوا ہوں۔" تم نے دھیرے سے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اور پھر کہیں گم ہو گئے۔ مجھے اس خاموشی سے دہشت سی ہونے لگی۔

"آپ کو میرے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔" دفعتاً تم نے کہا۔

"جی۔"

میں دم بخود سی تمہیں دیکھنے لگی۔ پتا نہیں تم کس کشمکش میں تھے۔ تمہاری آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اور تم ہونٹ کاٹ رہے تھے، جیسے کوئی چیز اندر ہی اندر تمہیں چھیل رہی ہو۔ میرا دل پگھلنے لگا۔

"ارے کچھ تو کہو۔ کچھ تو بولو۔ یہ کیسا دکھ ہے، جو تمہیں بے حال کیے دے رہا ہے۔

تمہارے چہرے پر جو لکھا ہے۔

تمہاری آنکھوں میں جو چھپا ہے۔

مجھے بتا دو۔

اور اپنے غم سے نجات پالو۔"

میرا دل دھڑک کے جا رہا تھا۔

"مجھے اب اجازت دیجیے۔" میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے نکل بھاگوں۔ مگر تم نے بے قراری سے ہاتھ ہلایا۔

"ابھی نہیں۔"

تم پل بھر کے لئے متذبذب سے رہے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہو، کہہ نہ پا رہے ہو۔ پھر عجیب اضطراب کے عالم میں تم اٹھے اور دیوار کے قریب چلے گئے۔ تم نے شاید کوئی بٹن دبایا تھا۔ یکدم ایک ریک سا سامنے آ گیا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ریک میں قیمتی بوتلیں قرینے سے سجی تھیں۔ میں ششدر سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ جانے کیوں مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ حالانکہ جس طبقے سے تمہارا تعلق تھا، وہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی، پھر بھی جانے کیوں مجھے برا لگا، ٹھیک ہے تم پیتے ہو۔ مگر یہ کوئی ضروری تھا کہ تم اس کا مظاہرہ میرے سامنے کرتے، کیا تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ کسی انجانے خطرے سے میں لرز اٹھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''وقار صاحب۔''

''ہاں میں پیتا ہوں جواء کھیلتا ہوں۔ اور بھی بہت سی برائیاں ہیں، مجھ میں۔'' تم نے میری طرف مڑ کر کہا۔ اور تمہارا ہاتھ ٹرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''پلیز نہیں۔'' بے اختیار میں نے احتجاج کیا۔

تمہارا ٹرے کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر تم نے بٹن دبا دیا۔ اور ٹرے سمیت ریک کہیں دیوار کے پیچھے غائب ہوگئی۔

''شکریہ۔''

میرے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ اور پورے جسم پر ہلکی سی کپکپی طاری تھی۔

''اب میں جاؤں گی۔''

''آپ کیا سمجھتی ہیں۔ میں آپ کو اس طرح جانے دوں گا۔'' تمہارے لہجے میں طنز تھا۔

میرے حواس گم ہونے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔'' سنبھل کر میں نے کہا۔

''ہاں میں......'' تم میرے قریب آ گئے، تمہاری نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

''تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتیں۔ کیوں بار بار میری راہ میں آجاتی ہو۔'' تم میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

''آپ ہوش میں تو ہیں۔ مجھے بھلا آپ کا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''لیکن تم ایسا کرتی ہو۔'' تمہارا لہجہ سخت پڑ گیا۔ ''اور آئندہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ اپنی یہ صورت لے کر کہیں گم ہو جاؤ اور آئندہ کبھی میرے سامنے نہ آنا ورنہ......''

''ورنہ کیا......'' اس انتہائی بے تکی بات پر مجھے غصہ آ گیا۔ آپ مجھے زندہ گاڑ دیں گے یا دیوار میں چنوا دیں گے۔''

''میں تمہیں توڑ ڈالوں گا شہنیلا احمد۔ فنا کر دوں گا۔''

تم نے انتہائی غصے سے مجھے شانوں سے پکڑ لیا۔ نفرت اور غیظ و غضب کی شدت سے تمہارا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرا سارا وجود کانپ اٹھا اور ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں، مگر اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پالیا۔

''آپ ......آپ ایسا نہیں کریں گے۔'' میں نے بے حد اعتماد سے کہا، اگر آپ کے دل میں پیتا، ویدی اور آنٹی کا ذرا سا بھی خیال ہے تو آپ......''

تمہارے ہاتھوں کی گرفت میرے شانوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

''تم مجھے جینے بھی دو گی کہ نہیں۔'' تم نے بے بسی سے کہا اور پیچھے ہٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

''چلی جایئے۔ پلیز یہاں سے چلی جایئے۔''

تم نے دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے کہا۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ مگر تم نے پھر مجھے پکارا۔

''شہنیلا۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ تم میز کی دراز ٹٹول رہے تھے۔ اور مجھے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں وہیں دروازے کے قریب رک گئی۔ تم نے چیک بک نکال کر جلدی جلدی سائن کیے۔ اور پھر چیک بک میری طرف اچھال دی جو میرے پاؤں کے قریب زمین پر آ گری۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے چیک بک کو ہاتھ لگائے بغیر پوچھا۔

''یہ سائن کیے ہوئے چیک ہیں۔ رقم اپنی مرضی سے بھر لینا۔''

میرا چہرا تپ گیا۔ کیا تم مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہو یا یہ کہ ہر چیز دولت کے بل پر خریدی جا سکتی ہے۔ تمہارے ذہن میں ضرور کہیں کوئی فتور تھا۔

''یہ عنایت کس لیے؟'' میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی مگر میں غصے سے لرز رہی تھی۔

''صرف اس لیے کہ آئندہ کبھی میرے سامنے نہ آنا۔ نہ جان کر نہ انجانے میں۔ صرف اس ایک وعدے کے بدلے۔''

افوہ کس قدر بیہودہ اور بے تکی بات تھی۔ اس سے زیادہ بے تکی بات میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنی تھی۔ کیا میں اتنی ہی ناگوار ہستی تھی۔ کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی تم پتھر ہو جاتے۔ یا چھوت کی کوئی مریض۔

میں نے طیش کے عالم میں چیک بک اٹھائی اور اسے ٹکڑے کر کے تمہارے منہ پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھینک دیا۔

''آپ مینٹل کیس ہیں۔ سچ مُچ مینٹل کیس......''

شدید غصّے کے عالم میں اتنا ہی کہہ سکی اور دوڑتے ہوئے باہر نکل آئی۔ تم شاید مجھے آوازیں دے رہے تھے، لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی مجھے رکشا مل گیا۔ جو میرے بیٹھتے ہی ہوا ہو گیا۔ رکشے میں تو میں انتہائی ضبط سے بیٹھی رہی۔ لیکن اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ اور میں اتنا روئی اتنا روئی کہ زندگی میں کبھی نہ روئی تھی۔ یہ دُکھ مجھے کھائے جا رہا تھا کہ میں کس بھروسے پر اٹھ کر تمہارے ساتھ چل دی تھی۔ یہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ میں تمہاری دسترس سے بچ کر چلی آئی۔ ورنہ تمہارے تیور خطرناک تھے۔ جانے کیوں میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے بھی نہ کیا۔ فائدہ بھی کیا تھا۔

پھر میں نے سنا تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ ویدی، بینا اور آنٹی تمہارے گھر کے چکر پر چکر لگا رہے تھے۔ کئی بار ویدی اور بینا نے مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہا، مگر میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ پھر اس دن بینا نے آکر مجھے بتایا کہ اس نے تمہاری میز کی دراز میں ایک بیحد حسین لڑکی کی تصویر دیکھی ہے۔

''اچھا......''

میں نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ ظاہر ہے کہ ان لڑکیوں میں سے کسی کی ہو گی، جن کے ساتھ تم گھومتے پھرتے رہے ہو۔

''نیل ...... کہیں اس تصویر والی لڑکی کی وجہ سے ہی تو وقار بھائی ڈیپریشن کا شکار نہیں۔''

''پوچھ لیا ہوتا اپنے وقار بھائی سے۔''

''پوچھ تو لیتی۔ مگر پھر سوچا کہ اگر اس لڑکی کی وجہ سے وہ بیمار ہوئے ہیں تو ان کی طبیعت اور بگڑ جائے گی۔''

''ہوں......'' میں چپ ہو رہی۔ پتا نہیں کس کی تصویر تھی؟ شاید تمہاری کوئی عزیزہ ہو اور یہ بینا تو خوامخواہ افسانہ بنائے دے رہی تھی۔

''سچ نیل ...... اتنی پیاری سی لڑکی تھی کہ بس دیکھتے ہی جاؤ......''

''اچھا...... اتنی ہی پیاری تھی تو اس تصویر کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا ہوتا۔'' میں نے

جل کر کہا۔

''واہ......تم کیوں جل گئیں؟''

''میں کیوں جلتی۔ میری بلا سے کوئی خوبصورت ہو یا بدصورت۔''

میں بُرا مان کر اٹھ گئی۔ پتا نہیں کیوں میں آج کل بہت زود رنج ہو گئی تھی۔ بات بے بات الجھ پڑتی۔ یوں لگتا، جیسے دل اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہو۔ ایک غم انگیز سی خاموشی ہمہ وقت مجھ پر طاری رہتی۔ جی چاہتا تھا کہیں ایسی جگہ چھپ جاؤں، جہاں لوگوں کی نظریں مجھے کھوج نہ سکیں۔ بینا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''نیل پیاری۔ کیا ہو گیا تمہیں......تم تو یوں روٹھتی نہ تھیں۔''

جی چاہا اپنے دل کا سارا بوجھ اس پر الٹ دوں۔ اسے بتا دوں کہ یہ سب کیا دھرا تمہارا ہے۔ اور یہ کہ اپنی اتنی بے تحاشا دولت کے باوجود تم بے حد گھٹیا آدمی ہو۔ اور اس دن جو میں نے تمہارے ساتھ جا کر حماقت کی تھی۔ اس کی شرمندگی مجھے مارے دے رہی ہے۔ مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اور اپنے اندر امڈنے والے آنسوؤں کو روکتی رہ گئی۔

پھر اس شام اچانک تمہارا فون آ گیا۔

''شہنیلا پلیز۔ فون مت رکھیے گا۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

میں نے تمہاری بات سنے بغیر فون رکھ دیا۔

پھر وقفے وقفے سے کئی بار گھنٹی بجتی رہی۔ مگر میں نے ریسیور نہ اٹھایا۔ کہ کہیں تم نہ ہو پھر اس وقت سب کھانا کھا رہے تھے۔ جب نوکر نے آکر بتایا کہ شہنیلا بی بی کا فون ہے۔

''کہہ دو کہ میں موجود نہیں۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

''بری بات بیٹے۔ کیا پتا کوئی ضروری فون ہو۔''

ممی نے فہمائش کی۔ ''جاؤ بات کر لو۔''

میں مجبوراً اٹھی اور میرے خدشے کے مطابق دوسری طرف تم ہی تھے۔

''شہنیلا۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں پلیز۔ میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں......''

''آپ نے اپنا بوجھ اتارنا ہے تو کسی روزینہ، مہ پارہ یا مونا کے پاس جائیے۔ میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''شہنیلا۔ آپ میری بات تو سنیں۔ مجھے وضاحت کا ایک موقع تو دیں۔ شاید میں آپ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو اتنا قصور وار نظر نہ آؤں۔"

"میں آپ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی وقار صاحب۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اب بھلا بات کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ تم میری نظروں میں اپنا مقام کھو چکے تھے۔ اگر اس دن میں تمہاری آنکھوں میں ناچتا شیطان نہ دیکھ لیتی تو شاید...... شاید ساری زندگی انتہائی خاموشی سے تمہاری پرستش کیے جاتی۔ کہ تم انتہائی غیر محسوس طریقے سے میری زندگی کا حاصل بن چکے تھے۔ مگر اب میرے دل میں رکھا بت چکنا چور ہو چکا تھا۔ اور بس ایک غم آلود سا احساس رہ گیا تھا۔ کہ ناحق میں نے ایک پتھر سے سر پھوڑا۔ اور یہ احساس میرے دل کے آسمان پر غبار کی صورت میں چھایا رہتا۔

بہت دنوں بعد اُس دن طبیعت کچھ بشاش تھی۔ میں بینا کیساتھ ٹیرس پر کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ تھوڑے انتظار کے بعد آنٹی نے پکارا اور بینا سے موم بتیوں کے پیکٹ کے متعلق پوچھا۔

"چلو انہیں موم بتیاں دے آئیں۔"

بینا نے کہا اور میں بینا کے ساتھ اندھیرے میں سیڑھیاں اترنے لگی۔

"پتا ہے میں نے وقار بھائی سے اس تصویر کے متعلق پوچھا تھا۔"

سیڑھیاں اترتے ہوئے بینا کو ایک دم یاد آیا۔

"کیسی تصویر۔" میں نے بے دھیانی میں کہا۔

"ارے وہی جوان کی دراز سے ملی تھی۔"

"اچھا...... پھر......؟"

"کچھ بولے نہیں۔ بس تھوڑی دیر تصویر کو دیکھتے رہے پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔"

"شکر کرو تمہارے ہی ٹکڑے نہیں کر ڈالے۔" میں نے ریلنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔ یہ تمہیں وقار بھائی سے اتنی چڑ کیوں ہے؟ بینا نے پوچھا۔

"جب مجھے چڑ ہے تو تم ان کا ذکر کیوں کرتی ہو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ویسے اُن سے کیا چڑنا۔ کریک ہیں بے چارے۔"

میں نے آدھا جملہ منہ میں ہی داب لیا خوامخواہ بینا کو کیا ناراض کرنا۔

بینا چپ ہو گئی۔ اندھیرے میں ہی اس نے ٹٹول کر موم بتیاں ڈھونڈیں اور ایک موم بتی جلا کر میری طرف بڑھا دی۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ پھر ٹیرس پر چلتے ہیں۔ میں کمروں میں موم بتیاں جلا آؤں۔"

"اچھا......"

میں پل بھر وہیں کھڑی موم بتی کے کانپتے لرزتے شعلے کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے ہوا سے بچاتی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ تب ہی جانے کہاں سے اندھیرے سے نکل کر اچانک تم میرے سامنے آ گئے۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"شہنیلا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔" تم نے بغیر کسی تمہید کے کہا" مجھے اعتراف ہے کہ میں کسی اچھی نیت سے آپ کو وہاں نہیں لے گیا تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

میں موم بتی کی مدھم روشنی میں ششدر سی تمہیں دیکھنے لگی۔

"میں اپنے حواس میں نہیں رہا تھا۔ بالکل بے آپے ہو گیا تھا۔ اصل میں غصہ مجھے آپ پر نہ تھا۔ سارا غصہ تو رومی پر تھا۔"

"رومی......" میرا ہاتھ لرزا۔ اور موم بتی کی روشنی میں پھیلے سائے زور زور سے کانپنے لگے۔

"ہاں رومانہ میری بیوی۔"

تمہاری آواز میں عجب سی تلخی بھر گئی۔ پل بھر کے لیے جیسے ساری فضا ساکت ہو گئی۔ میری سانسیں رُکنے لگیں اور میرے اردگرد پھیلا اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ پھر یک لخت میں دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی' ایک دم میرا پاؤں پھسلا میں لڑکھڑائی اور موم بتی میرے ہاتھوں سے گر کر بجھ گئی۔ اور اگلے ہی لمحے میں تم میرے قریب تھے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں، شہنیلا...... بے پناہ محبت۔"

میں نے اپنے قریب تمہاری...... مدھم سی سرگوشی سنی۔ اور اگلے ہی لمحے میں دوڑتی ہوئی پھر سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ٹیرس پر آ کر میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے بہت بڑے بڑے اور روشن نظر آ رہے تھے۔ شرارت سے آنکھیں چمکاتے اور ہنستے ہوئے۔ جیسے ٹم ٹم کرتی آنکھوں سے مجھے ہی دیکھ رہے ہوں۔ میں دھڑ دھڑ کرتے دل کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سنبھالتی ریلنگ پر جھک گئی بہت ساری خوشبوئیں سرسراتی ہوئی میرے قریب سے گزریں۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں شہنیلا ...... بے پناہ ......'' کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کیے جا رہا تھا۔

''اللہ...... میرے اللہ......کیسی انہونی بات۔'' میں بلاوجہ کھلکھلا کر ہنسی۔

موتیا اور گلاب کی خوشبو میں ملی جلی رات کی رانی کی مہک مجھے بے خود کیے دے رہی تھی۔

''تو میرا جذبہ خام نہ تھا۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ساری خوشبوئیں اپنے اندر اتارتے ہوئے سوچا۔

''مگر......تمہاری بیوی...... رومانہ۔''

ایکدم میری ہلکی پھلکی گنگناتی روح پر ڈھیر سارا بوجھ آ کر گرا۔ میں نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اور درد کی اس لہر کو پورے حوصلے سے برداشت کرنے کی کوشش کی۔ اور جب میں نے آنکھیں کھول کر دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے آسمان پر ستارے نہیں بہت سارے آنسو لٹکے ہوں۔ وہ سارے آنسو جو میں نے چپکے سے آنکھوں میں روک لیے تھے۔

میں چپ چاپ کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے آنکھیں موندے سوچ رہی تھی۔ زندگی اس قدر بور کیوں ہے۔ اور وہ سارے جگمگ کرتے رنگ کدھر گئے۔ جو میں اپنی انگلیوں کی پوروں پر محسوس کرتی تھی۔ ہاں وہ سارے رنگ، وہ سارے لمحے میرا مقدر نہیں ہو سکتے کہ میں نے اپنے سارے جذبے ایک بے حس انسان پر لٹا دیے۔ حالانکہ میں جانتی تھی۔ پھر بھی۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور چپکے سے میرے آنچل میں جذب ہو گیا۔

''اوہ...... ڈونٹ بی نولش۔ یہ ٹھیک نہیں۔ مجھے حوصلے کے ساتھ زندگی کے اس المیے کو برداشت کرنا ہے۔ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے بغیر۔ ساری دنیا حتیٰ کہ تم سے بھی چھپا کر۔ اپنے جذبوں کو عیاں کیے بغیر خاموشی سے چپ چاپ زیست بتا دینی ہے۔ اور وہ سرگوشی' جو میں نے سیڑھیوں کے پاس سنی تھی۔ شاید میرا وہم تھا۔ میرے رومان پسند تخیل کی کارستانی۔ واہ شہنیلا بیگم واہ۔ تم تو الجھے دھاگے سلجھانے چلی تھیں۔ خود کیوں الجھ کر رہ گئیں۔ اُسے ڈوبنے سے بچانا چاہتی تھیں مگر خود ڈوب گئیں۔ اب بتاؤ تمہیں بکھرنے سے' ٹوٹنے سے کون بچائے گا۔؟''

''کیوں تم نے سارے دروازے اپنے آپ پر بند کر لیے۔'' میں خود کو ملامت کیے جا رہی تھی کہ ویدی نے پیچھے سے پکارا۔

''چلو نیل۔ کہیں گھومنے چلیں۔''

''تمہیں اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے۔ گھوم گھوم کر تم تھکتے نہیں۔'' میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''بھئی مریم آ گئی نا......تو پھر تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔'' نوید نے شرارت سے کہا۔

''ہاں ہاں۔ مریم کے سامنے ہماری یاد کیوں آئے گی۔ ہو ہی تم اوّل درجہ کے خود غرض اور احسان فراموش۔'' میں نے اپنی اداسی چھپاتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

''ابھی مریم آئی بھی نہیں۔ اور تم اس سے جلنے لگیں۔ کیوں۔'' ویدی نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔

''واہ...... میں کیوں جلوں گی مریم سے۔ وہ تو اتنی پیاری ہے۔ کوئی تم جیسی تو نہیں۔'' میں نے محبت سے کہا۔ سچ سچ مجھے مریم بہت پیاری تھی، ایک تو وہ تھی ہی اتنی اچھی۔ پھر شاید ویدی کے ناتے۔

''اچھا...... یہ مریم کے قصیدے بعد میں پڑھ لینا...... فی الحال تو چلنے کی تیاری کرو۔''

''کہاں جانا ہے۔؟''

''ساحل کی طرف چلتے ہیں۔ یونہی گھومیں پھریں گے۔ باتیں کریں گے۔''

''کیوں نہ مریم کو بھی ساتھ لے لیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ جی خوش کر دیا۔ مگر کیسے۔'' ویدی نے پوچھا۔

''بھئی ہم باہر ٹھہریں گے۔ بینا اندر جا کر شاپنگ کے بہانے مریم کو بھی لے آئے گی۔''

مگر یہ تجویز کارگر نہ ہو سکی۔ مریم کے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے وہ بہت مصروف تھی۔ اصرار کر کے مریم نے بینا کو بھی روک لیا۔

''بھئی۔ آپ لوگ جائیں مریم مجھے جانے نہیں دے رہی۔'' بینا نے باہر آ کر بتایا۔

''تو پھر ایسا کرتے ہیں ویدی۔ کہ اپنا یہ گھومنے والا پروگرام فی الحال ملتوی کر دو اور مجھے اور بینا کو یہیں چھوڑ دو۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"واہ۔ ہم کیوں اپنا پروگرام کینسل کریں۔" ویدی نے غصے سے کلچ دبایا اور گاڑی سرپٹ دوڑنے لگی۔

"سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے شہزادی حسن بانو کو۔"

ویدی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ مجھے اس کی شکل دیکھ کر ہنسی آ گئی۔

"شہزادی تو وہ ہے ہی۔ اتنی پیاری سی۔"

"بس تم چپ رہو۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔" اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے۔"

"ایک ضروری فون کرنا ہے۔"

"اوہ۔" میں مسکرا دی۔ ضرور مریم کو فون کرنے گیا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو موڈ کچھ ٹھیک تھا۔

"ویدی۔ کوئی ضروری تھا کہ ہم آج ہی جاتے۔ پھر کبھی مل کر اکٹھے جاتے تو کتنا اچھا لگتا۔" میں نے ویدی کا موڈ ٹھیک دیکھ کر اسے سمجھانا چاہا۔

"ضروری کیوں نہیں۔ تمہیں پتا ہے میں جو ارادہ کر لیتا ہوں اسے پورا کرتا ہوں۔"

اس نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ اسے ضد میں دیکھ کر میں چپ ہوگئی، مگر بینا کے بغیر میرا جانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔

ساحلی علاقے میں پہنچ کر اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ اور ہم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ باتیں کرتے اور چلتے چلتے خدا جانے ہم کہاں نکل آئے تھے۔ میرے پاؤں تھکنے لگے۔

"ویدی۔ یہ تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو۔" تھک کر میں نے پوچھا۔

"تمہاری منزل کی طرف۔" ویدی معنی خیز انداز میں ہنسا۔

"منزل......" ایکدم میرے اندر اداسی اتر آئی۔ "منزل تو کہیں بھی نہیں۔ میں ساری زندگی بھی چلتی رہوں تو بھی۔"

تھکن میرے پور پور میں رچ گئی۔ میں نے دور تک پھیلے ریتیلے میدان اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھا اور مضمحل سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے اب نہیں چلا جاتا۔"

"ارے!" دفعتاً نوید نے چونک کر کہا۔ "میرا پرس تو گاڑی میں ہی رہ گیا۔ اور میرا خیال ہے میں نے گاڑی بھی لاک نہیں کی۔"

"تو پھر واپس چلتے ہیں۔" میں کھڑی ہوگئی۔

"نہیں۔ تم یہیں ٹھہرو۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں ایک بڑی پیاری سی جگہ دکھانی ہے اور تم سے پھر اتنا چلا نہ جائے گا۔ میں ابھی آیا پانچ منٹ میں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جانے لگا۔ میں دور تک اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اور پھر پتھر پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ قدموں کی آہٹ سی ابھری اور معدوم ہوگئی۔ شاید ویدی واپس آ گیا تھا اور ٹیلے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ مگر اتنی جلدی۔ مجھے حیرت سی ہوئی۔

"اب آ بھی چکو ویدی۔"

میں نے بے صبری سے پکارا۔ اور کوئی دھیرے دھیرے چلتا ٹیلے کے عقب سے برآمد ہوا۔ یہ ویدی نہیں تھا۔ بلکہ تم تھے وقار احمد تم۔ میں ٹھٹک کر بت بنی بیٹھی رہ گئی اور تم میرے قریب آ کر رُک گئے۔

"شہنیلا احمد آپ۔ شکر ہے آپ مل گئیں۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ بہت کچھ کہہ سن لیا آپ نے۔" میں نے زمین پر لکیریں کھینچتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں سننا پڑے گا۔" تم نے ڈپٹ کر کہا۔

"میں زیادہ عرصہ اس عذاب میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ کئی راتوں سے میں جاگ رہا ہوں اور میرا دماغ پھوڑا بن چکا ہے۔"

"وقار صاحب آپ......!" بے حد حیران ہو کر میں نے کہا۔

"سنو......کوئی بھی فرد جرم عائد کرنے سے پہلے میری پوری بات سن لو۔ پھر ہو سکتا ہے، میں یہ شہر چھوڑ دوں۔ ملک چھوڑ دوں۔ یا دنیا ہی۔ سنا تم نے۔"

جی چاہا کہہ دوں دنیا چھوڑنا اتنا آسان تو نہیں۔ مگر تمہارے تیور دیکھ کر چپ ہو رہی۔

"میں چاہتا ہوں۔ اپنا آپ کھول کر رکھ دوں۔ سب کچھ بتا دوں۔ اپنے متعلق۔ اور روبی کے متعلق جو میری بیوی تھی اور جو میری کچھ بھی نہ تھی۔ جس نے مجھے ہی نہیں پپا کو بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قتل کیا۔ اور جس نے مجھے تباہ کر دیا۔"

تمہاری آواز مدھم پڑ گئی۔

"اور بدلے میں آپ مجھے قتل کر رہے تھے خون بہا کے طور پر کیوں۔" میری آواز میں زہر بھر گیا۔

"نہیں۔ مگر تم اس سے بہت مشابہ تھیں۔ شاید اس لیے۔ اور میرے اندر کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ جب آدمی کے اندر بھی اندھیرا ہو اور باہر بھی تو وہ کیسے دیکھے۔ بتاؤ نا وہ کیسے دیکھے؟"

تم نے تکرار کرتے ہوئے پوچھا میں نے پلکیں اٹھا کر تمہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں اور چہرے پر نرم سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔

"ہاں جب آدمی کی اپنی آنکھیں بند ہوں تو وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا چاہے، باہر کتنی ہی روشنیاں کیوں نہ ہوں۔"

"میں آنکھیں نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اندھیروں سے مانوس ہو گیا تھا۔ تم نے مضطرب ہو کر کہا۔ اور پھر وہ میری آنکھوں میں اتنی ریت جھونک گئی تھی کہ میں آنکھیں کھول بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اور آپ اپنی ذات کی نفی کر رہے تھے۔ سزا دے رہے تھے خود کو بھی۔ اور دوسروں کو بھی۔"

"سزا۔ تم نے چونک کر کہا۔" ہاں شاید سزا ہی مگر کیوں۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں ایسا کیوں ہوں۔ یہ بھی کبھی سوچا تم نے۔ نہیں نا۔ تو سنو۔"

تم دھیرے دھیرے اپنا ایک ایک زخم کرید رہے تھے۔ ایک گھاؤ دکھا رہے تھے۔ اپنی روح میں پیوست ساری کرچیاں ایک ایک کر کے باہر نکال رہے تھے۔ کبھی تمہاری آواز سخت پڑ جاتی۔ اور کبھی اتنی مدھم کہ جیسے تم اپنے آپ سے سرگوشی کر رہے ہو۔ بار ہا مارے دکھ کے تمہاری آنکھیں دھندلی ہوئیں۔ اور تمہاری آواز ڈوب ڈوب گئی۔ مگر تم بولتے رہے' اور جب تم نے اپنی بات ختم کر لی اور اپنی روح میں پیوست سارے کانٹے نکال ڈالے' تم جیسے پرسکون سے ہو گئے۔ تمہارے چہرے پر غم آلود سی تمتماہٹ تھی' اور آنکھوں میں گزرے وقتوں کا غبار' اور میں جو تمہاری آواز کے زیر و بم میں ڈوبی عجیب سی کیفیات سے دوچار تھی' چپکے

چپکے سوچ رہی تھی۔ تم نے مجھے سب کچھ کیوں بتایا؟ آخر کیوں؟ تمہارا دکھ میرے دل کو گداز کیے جا رہا تھا' اور میری آنکھیں بھری آ رہی تھیں مگر میں ضبط کیے بیٹھی تھی۔

"میں تمہیں قتل نہیں کر رہا تھا شہنیلا' میں تو خود کو قتل کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے' کند چھری سے۔" تمہاری آواز کسی اندرونی کرب سے گداز ہو رہی تھی۔

"مجھے نہ دوستی پر یقین رہا تھا' نہ عورت کی وفا پر' اور میرے اندر بھی خلا اور باہر بھی' مگر پھر میں لوٹ آیا۔ وہ آنکھیں میرے پاؤں کی زنجیر بن گئیں۔"

"زنجیر ٹوٹ بھی تو سکتی ہے۔" میں نے آنسو بھری نگاہیں اٹھائیں۔

"مگر یہ زنجیر نہیں۔" تم نے مضبوطی سے کہا۔ "میں بہت برا ہوں شہنیلا احمد' ناقابل معافی' اور مجھ میں بہت سی برائیاں ہیں' مگر میں اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہوں۔ بدل ڈالوں گا۔"

"اتنا آسان تو نہیں ہوتا بدل جانا۔" میں نے چپکے سے کہا۔

"اتنا مشکل بھی نہیں' اگر کوئی ساتھ دے۔" تم مسکرا اٹھے۔

"اللہ۔" میرا دل دھڑک اٹھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں گم ہو گیا تھا شہنیلا اور اب اپنے آپ کو کھوج رہا ہوں۔ کھوج لینا چاہتا ہوں۔ اس لئے۔" تم کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔

"پتا نہیں یہ ویدی کہاں رہ گیا۔" بڑی دیر بعد مجھے خیال آیا۔

"مجھے کہنے دو شہنیلا۔ میں کہے بنا نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے بہت بھاگا ہوں' بہت پناہیں تلاش کی ہیں مگر میں تم سے بھاگ نہیں سکتا۔ تم میری پناہ ہو۔"

"وقار......"

یک لخت میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں' اور میں نے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

"ارے تم رو کیوں دیں۔"

تم بے حد پریشان ہو گئے۔ میں روتی رہی۔ میں تو پور پور تمہاری محبت میں ڈوب چکی تھی' مگر اپنے آپ کو جھٹلا رہی تھی۔ میں جانتی تھی تم مجھ سے بہت دور ہو' مگر پھر بھی میں دل ہی دل میں تمہاری پرستش کیے جا رہی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ تم میرے نہیں بے جواز' بے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غرض محبت' خاموش بے اجر چاہت اور میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ محبت جو مٹھی میں بند جگنو کی طرح میرے اپنے ہی دل کو جگمگا رہی ہے۔ ہمیشہ میرے ہی دل میں دفن رہے گی' اور میرے ہونٹ ہمیشہ بند رہیں گے کہ میں ایک پتھر سے سر پھوڑنے کی حماقت کر بیٹھی' مگر اب وہ پتھر پگھل رہا تھا' موم ہو گیا تھا۔ تم بن مانگے مجھے بہت کچھ دے رہے تھے۔ مجھے رونا کیوں نہ آتا۔ مجھے میری خواہش سے بہت زیادہ مل رہا تھا۔ میرا جذبہ بے اثر نہ تھا۔

''شہنیلا۔''

''آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں' مہ پارہ' روزینہ یا......'' میں نے روتے روتے سر اُٹھا کر تمہیں دیکھا۔

''نہیں۔'' تم نے بے اختیار میرے ہاتھ تھام لئے۔ ''یہ سب کچھ نہیں۔ تم...... میری روح...... میری حیات...... میری کل کائنات...... ارے تم تو میرا اپنا آپ ہو۔''

''مگر آپ...... یہ سب کچھ......''

''تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میں واقعی تمہارے سامنے ہار گیا ہوں۔ بے بس ہو گیا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں شہنیلا اور محبت کرتا رہوں گا۔ چاہے تم مجھ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرو۔''

''نفرت تو آپ کرتے رہے۔ میں تو۔''

''اب میں ہی اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ بولو تم مجھے تلافی کرنے کا موقع دو گی؟ دو گی کہ نہیں۔''

تم نے بے صبری سے کہا۔

''تلافی تو ہو چکی' اور موقع بھی آپ کو مل گیا۔ آپ کا اعتراف ہی۔''

''اعترافِ شکست یا اعترافِ محبت۔'' تم نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''محبت۔'' میری نظریں جھک گئیں۔

''نفرت کا ازالہ محبت سے ہی ممکن ہے۔''

''تو تم عمر بھر مجھے اس تلافی کا موقع دو گی۔ ہیں نا' دیکھو انکار نہ کرنا۔ تمہاری آنکھیں اقرار کر رہی ہیں۔''

''تو پھر مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔'' میں نے خاموشی سے تمہارا ہاتھ تھام لیا۔ ''میری

آنکھیں دیکھیں۔''

''بہت بہت شکریہ شہنیلا۔'' تمہارا چہرہ چمک اٹھا۔ ''میرا خیال تھا تم مجھ سے بہت لڑو گی' برا بھلا کہو گی' اور نفرت سے دھتکار دو گی۔''

''نہیں...... محبت کا بدل محبت کے سوا بھلا کیا ہو سکتا ہے۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں گلابی پڑ گئی۔

''ہاں محبت کا بدل محبت۔''

تمہاری آنکھوں میں عجیب سی روشنیاں اُٹھیں۔ ''اس خوبصورت اقرار کا شکریہ۔''

میرا چہرہ تپ اٹھا' اور تمہاری جگمگاتی آنکھوں کے سامنے میری پلکیں جھکنے لگیں۔ تب ہی نوید نے ٹیلے کے پیچھے سے سر نکال کر آواز دی۔

''ہیلو...... بھئی اگر صلح نامہ کی شرائط مرتب ہو چکی ہوں' تو ہم آ جائیں۔''

''ارے۔'' میں نے گھوم کر دیکھا۔ نوید کے کھلکھلاتے چہرے پر شرارت تھی۔

''ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ سب اس سازش میں شریک تھے۔'' میں بڑبڑائی۔

''سب تو نہیں البتہ نوید۔'' وقار نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''یار وقار صرف آنسوؤں کی برسات ہوئی ہے یا اولے بھی برسے ہیں۔'' نوید نے میری روئی روئی آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔

''میں جھینپتی' شرماتی' گلابی ہوتی نوید کو مارنے کے لئے دوڑی' اور میرے پیچھے وقار کا دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا قہقہہ گونجتا چلا گیا۔

✵✦✵

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پسِ آئینہ

عجب بات ہوئی' ہال سامعین سے بھرا پڑا تھا۔ پروفیسر امین ملک ایجوکیشن پرابلمز پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ ملک کے مایہ ناز پروفیسر تھے۔ ان کا کہا ہوا ہر جملہ مدلل اور جامع تھا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ جو انہی کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے، بغور انہیں سن رہے تھے۔ تب اچانک ہی وہ واقعہ رونما ہوا' جس نے ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کو ہی نہیں' خود پروفیسر امین ملک کو بھی دم بخود کر دیا۔

پروفیسر عالیہ واسطی جو ایجوکیشن کالج کی طرف سے اپنی کولیگ مسز فلور کے ساتھ اس ہفت روزہ سیمینار میں شرکت کے لئے آئی تھیں' اور اگلی رو میں بیٹھی تھیں، ایک دم اٹھیں اور اسٹیج کی طرف بڑھ گئیں۔ مسز ظہور نے انہیں پکارا بھی' مگر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا' اور اور سیدھا اسٹیج پر جا کر پروفیسر امین ملک کا گریبان پکڑ لیا۔

"تم ظالم...... قاتل، جلاد۔ تم نے ہمیں قتل کر ڈالا۔ ہم سب کو ختم کر دیا بولو، تم نے ایسا کیوں کیا؟"

پل بھر کے لیے پروفیسر امین گنگ سے ہو گئے۔ ہال میں سکوت چھا گیا' پھر وہ سنبھلے' اور انہوں نے اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔

"محترمہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ غالباً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ اسی جنونی انداز میں چلائیں۔ "تمہارے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے قاتل...... اور تم کہتے ہو، غلط فہمی ہوئی ہے، اپنی لہو میں ڈوبی ہوئی آستینیں دیکھو جو کسی معصوم کے خون

سے رنگین ہیں، تم قاتل، ظالم شخص۔"

"ہوش میں آیئے محترمہ۔" پروفیسر امین کا لہجہ ترش ہو گیا۔ "میں نے کہا نا، میں آپ کو نہیں جانتا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی' مگر عالیہ کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔

"تم قاتل ہو...... اور تمہیں اقرار کرنا پڑے گا۔ ان سب کے سامنے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔" وہ ظالم محتسب اپنی ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھیں۔

اسی لمحے دم بخود کھڑے منتظمین جیسے ہوش میں آ گئے۔ انہوں نے پروفیسر امین ملک کو عالیہ واسطی کی مضبوط گرفت سے چھڑایا' مگر عالیہ واسطی اب بھی چلا رہی تھیں۔

"تم قاتل ہو پروفیسر امین۔ تمہیں اپنے جرم کا اقرار کرنا پڑے گا۔"

وہ ایک دفعہ پھر پروفیسر امین کی طرف جھپٹیں' مگر کئی ہاتھوں نے انہیں روک لیا۔ اسی تگ و دو میں سیاہ گاگلز ان کی آنکھوں سے گر پڑی' اور ان کی لانبی لانبی سیاہ آنکھیں بے نقاب ہو گئیں۔ پروفیسر امین کو یہ آنکھیں کچھ مانوس سی لگیں۔ جانی پہچانی سی، جیسے کبھی کہیں یہ آنکھیں ان کے بہت قریب رہی ہوں۔ مگر کہاں، انہیں یاد نہ آیا۔ عالیہ واسطی ہذیانی انداز میں چلاتے چلاتے حواس کھو بیٹھیں' اور انہیں گرتے دیکھ کر دم بخود بیٹھی مسز ظہور تیزی سے اسٹیج کی طرف لپکیں۔

ہال میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ پروفیسر امین کچھ ششدر، کچھ پریشان سے کھڑے تھے۔ لوگ ان کے اور عالیہ واسطی کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ عالیہ واسطی کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

"ہوا کیا آخر؟" پروفیسر الطاف نے جو اس سیمینار کا سارا انتظام کروا رہے تھے، پوچھا۔

"پتا نہیں۔" عالیہ واسطی پر جھکی مسز ظہور نے سر اوپر اٹھایا۔ "اچانک یہ اٹھیں......"

اور انہوں نے پروفیسر امین ملک کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت کی۔ "مجھے افسوس ہے مگر پتا نہیں کیا ہوا' جو یہ اچانک حواس کھو بیٹھیں۔ حالانکہ یہ بڑی سوبر، بڑی سنجیدہ مزاج ہیں۔"

"میں انہیں نہیں جانتا۔" پروفیسر امین ملک نے جیسے صفائی پیش کی۔

"یہ عالیہ واسطی ہیں۔ فرام ایجوکیشنل کالج۔" پروفیسر الطاف نے بتایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''براہِ کرم اپنی اپنی سیٹوں پر جائیں۔ اسٹیج خالی چھوڑ دیا جائے پلیز۔'' منتظمین میں سے کسی نے مائیک سنبھال لیا۔

ایجوکیٹڈ لوگوں کا مجمع تھا۔ پہلی اپیل پر لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر جانے لگے۔

''بھائی، یہ کیا چکر ہے۔ عالیہ واسطی نے پروفیسر امین ملک کا گریبان کیوں جا پکڑا؟'' لاء کالج کے پرنسپل اسرار صدیقی نے اپنی سیٹ کی طرف جاتے ہوئے پروفیسر سلیم بخاری سے پوچھا۔

''خدا ہی جانے...... یہ تو غالباً پروفیسر امین ملک ہی بتا سکیں گے۔'' پروفیسر سلیم بخاری نے کندھے جھٹکے۔

''یہ سارا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' پرنسپل اسرار صدیقی بڑبڑائے۔

لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے، مدھم آواز میں اس اچانک رونما ہونے والے واقعے پر تبصرہ کرنے لگے۔ مسز ظہور کی درخواست پر عالیہ واسطی کو الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا' اور فوراً ہی ڈاکٹر کا انتظام بھی کر دیا گیا۔

مسز ظہور نے ایک بار پھر وہ پروفیسر امین سے معذرت کی' اور عالیہ واسطی کے پاس چلی گئیں' جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں' اور ڈاکٹر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پروفیسر امین نے دوبارہ مائیک سنبھال لیا۔ چہ مگوئیاں کرتے لوگ خاموش ہو گئے' مگر پروفیسر امین کچھ الجھے الجھے سے تھے۔ وہ ایجوکیشنل پرابلمز پر بحث کرتے رہے' مگر ان کا اپنا ذہن اس نئے مسئلے کو حل کرنے میں لگا تھا۔

''کون ہے یہ، کوئی پاگل، سر پھری، بات بے بات حواس کھو دینے والی ذہنی مریضہ...... مگر ایک اتنے سنجیدہ، اہم سیمینار میں ایک ذہنی مریض کا کیا کام۔''

ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ لانبی لانبی گہری سیاہ آنکھیں جو غیظ و غضب سے گلابی ہو رہی تھیں، کتنی جانی پہچانی سی لگتی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے عالیہ واسطی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' مگر یہ بڑی بڑی مغل شہزادیوں جیسی حسین آنکھیں بھلا پہلے انہوں نے کہاں دیکھی تھیں۔

انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک دم ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، جیسے کوئی بلب اندھیرے میں جل اُٹھے' اور

چار سو روشنی پھیل جائے۔

''دارا شکوہ۔''

وہ لانبی لانبی سیاہ آنکھوں والا جبران واسطی۔ جسے وہ اس کی بے تحاشا خوبصورت آنکھوں کی وجہ سے دارا شکوہ کہتے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہوا کرتی تھی۔ عالیہ غالباً عالیہ ہی نام تھا اس کا۔

''تو یہ عالیہ واسطی تھی۔ جبران واسطی کی بہن۔'' انہوں نے دل میں کہا۔

''میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا سر۔'' بڑی بڑی روشن، ذہین آنکھوں میں شکوہ لیے جیسے وہ ان کے سامنے آ کھڑا ہوا، وہی زندگی سے بھرپور، ذہانت سے جگمگاتی خوبصورت آنکھیں جن کے وہ مداح تھے' اور جنہیں دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا تھا۔

''یار جبران تمہاری یہ لانبی لانبی حسین آنکھیں تمہیں دارا شکوہ سے کس قدر مشابہ کر دیتی ہیں۔ کہیں یہ اسی مغلیہ شہزادے کا دوسرا جنم تو نہیں تمہارے روپ میں۔''

''سر۔'' جبران نے آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے متانت سے کہا۔

''سر، میں دارا شکوہ نہیں' مگر میرے حوصلے بہت بلند ہیں سر۔ میں ایک دنیا کو تسخیر کر سکتا ہوں۔ پھر سر، یہ آواگون کا فلسفہ تو خالص ہندوانہ فلسفہ ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

پروفیسر امین لاجواب ہو گئے۔ انہیں کبھی جبران کی حد درجہ ذہانت خوف زدہ کر دیتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''بھئی ہم تو تمہیں دارا شکوہ کہیں گے۔ ایسی حسین جادوگر آنکھیں کسی مغل شہزادے کی ہی ہو سکتی ہیں۔ عام آدمی کی نہیں۔''

''جیسے آپ کی مرضی سر!'' جبران نے جھینپ کر کہا۔ ''مگر میں شہزادہ نہیں ایک عام سا آدمی ہوں۔ بہت معمولی، متوسط طبقے کا ایک فرد' مگر میں نئی دنیائیں دریافت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔''

''میری نظر میں تم کسی سے شہزادے سے کم نہیں۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔

''سر۔ آپ مجھے آسمان پر نہ چڑھائیں۔ زمین پر ہی رہنے دیں۔ آپ دیکھیں گے، میں اسی زمین پر کھڑے ہو کر ایک دن آسمان کے تاروں کو چھو لوں گا۔''

''اُفوہ...... اوور کنفیڈنس (حد درجہ خود اعتمادی)۔'' اور یہی وہ چیز تھی' جس سے وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چڑتے تھے۔

ڈائس کے سامنے کھڑے پروفیسر امین کو یوں لگا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں' مگر بھول گئے ہوں۔ ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی یا شاید خود انہیں ایسا محسوس ہوا۔ انہیں لگا جیسے وہ چند لمحے اور کھڑے رہے تو ان کی اس کمزوری کو باقی لوگ بھی محسوس کر لیں گے جو انہیں ہمہ تن گوش سن رہے تھے۔ انہوں نے اپنے حواس مجتمع کیے، لمبی چوڑی بحث کو چند جملوں میں سمیٹا اور پسینہ پونچھتے پونچھتے بیٹھ گئے۔

اب پرنسپل اسرار صدیقی سے درخواست کی جا رہی تھی' کہ وہ ڈائس پر آ کر اپنے قیمتی خیالات سے مستفید کریں۔

پرنسپل اسرار صدیقی تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر آئے' اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔

پروفیسر امین ملک ایک بار پھر اپنے آپ سے الجھنے لگے۔

''تو یہ داراشکوہ کی بہن ہے عالیہ واسطی۔ مگر میرا اس سے کیا واسطہ۔''

دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان جھنجوڑتی۔ وہ مہذب سی لڑکی' جیسے دوبارہ ان کے سامنے آ گئی۔

''تم قاتل ہو۔ تم نے اسے قتل کیا ہے۔''

''نہیں، میں نے نہیں۔'' انہوں نے صفائی پیش کی۔ ''وہ تو اپنے کرتوتوں کی وجہ سے۔''

''سر...... سر آپ تو ایسا نہ کہیں۔'' خوبصورت سیاہ آنکھوں میں گہرا کرب لیے وہ پھر ان کے سامنے آ گیا۔ ''سر، آپ تو جانتے ہیں؟''

گھبرا کر انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا کہ کہیں ان کے مجرم ضمیر کا کوئی عکس ان کے چہرے سے تو ظاہر نہیں ہو رہا' مگر لوگ پورے دھیان سے پروفیسر صدیقی کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔ ان کا دامن ہمیشہ کی طرح بے داغ اور اجلا تھا' اور چہرہ پرتقدس اور شفیق...... کہ خوامخواہ احترام کو دل چاہے۔

اور وہ داراشکوہ...... وہ بھی کتنا احترام کرتا تھا، ان کا۔

''سر میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ سر، آپ بہت عظیم ہیں۔'' وہ اکثر کہا کرتا اور

اس کی نگاہیں عقیدت سے جھکی رہتیں۔

مگر اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود وہ ناتجربے کار تھا' اور اس کی آنکھیں سونے اور پیتل میں تمیز نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لوگ کس طرح اپنے اوپر ملمع چڑھا لیتے ہیں' اور کس طرح دل میں کھوٹ رکھتے ہوئے بھی مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کے دل کا آئینہ صاف شفاف اور بے ریا تھا' اور اس آئینے میں سے ہر چہرہ بے ریا اور شفاف نظر آیا۔ اپنی معصوم اور مخلص، ذرا سے خلوص پر پگھل جانے والا، اور دوسروں کی خاطر اپنا آرام تیاگ دینے والا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جب آدمی حساس بھی ہو' اور پرعزم بھی تو لوگ کیسے کیسے وار کرتے ہیں۔ کس کس طرح ضربیں لگاتے ہیں' اور کیسے کیسے توڑتے ہیں۔ اسے بھی لوگوں نے توڑ دیا تھا۔ کسی کانچ کے کھلونے کی طرح' اور اس کے نرم و گداز دل پر اتنے زخم تھے کہ گنتی میں نہ آتے تھے۔

عالیہ آٹھ آٹھ آنسو روتی' اسے اپنے اس بھائی سے کتنا پیار تھا۔ یہ کچھ وہی جانتی تھی۔ وہ تھا بھی تو پیار کے قابل، جان نثار کرنے والا اور اس کی ذرا سی تکلیف پر بے تاب ہو جانے والا۔ کتنی بے تکلفی سے وہ دل کی ہر بات اس سے کہہ دیا کرتا تھا، جیسے وہ اس کی ہم عمر ہو۔ اس کی گہری دوست ہو۔

حالانکہ وہ اس سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی۔ پھر بھی ان میں بہت بے تکلفی تھی۔ کسی بات پر اس کا ذہن الجھتا تو وہ عثمان بھائی کے پاس جانے کے بجائے اس سے مشورے کا طالب ہوتا۔ پھر دونوں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے۔ کبھی کبھی وہ عثمان بھائی کو بھی پکڑ لاتی۔ دلائل دے دے کر اپنا موقف واضح کیا جاتا۔ عثمان بھائی نرم اور مدھم لہجے میں سمجھاتے' اور بڑی خوبصورتی سے اس کے ذہن سے شکوک و شبہات کو دور کرتے۔ یہاں تک کہ اس کا ذہن مطمئن ہو جاتا۔

زندگی کس قدر خوب صورت، کسی نرم رو ندی کی طرح بہہ رہی تھی۔ سب اپنی اپنی منزل کی طرف پوری تن دہی سے رواں دواں تھے۔ بجیا ڈاکٹر بن چکی تھی۔ عثمان بھائی سی ایس ایس کا امتحان دے کر فارغ تھے۔ جبران ایف ایس سی کے رزلٹ کا منتظر تھا۔ عفان کیڈٹ کالج میں تھا' اور نادیہ ایم اے کے سال دوم میں۔ چنانچہ خوب محفلیں جمتیں۔ رات کو صحن میں چھڑکاؤ کر کے ٹیبل فین لگا دیا جاتا۔ بستر بھی صحن میں ہی لگائے جاتے۔ جہاں رات کی رانی،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موتیے اور مولسری کی خوشبو چکراتی پھرتی۔ دراصل امی جان کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ سخت مصروفیت کے باوجود وہ خود ان کی دیکھ بھال کرتیں' اور بڑے پیار سے ان کی کاٹ چھانٹ کرتی رہتیں۔ جب کیاریوں میں پھول نکلتے تو ان کا چہرہ بھی کھل اٹھتا۔ موتیے کی تو وہ دیوانی تھیں۔ کام کرتے ہوئے بھی دو چار پھول ان کی آنکھوں کے سامنے پڑے رہتے۔ وقت نہ ملتا تو پلیٹ میں ہی پھول ڈال کر اپنے قریب رکھ لیتیں۔

وہ کہتی تھیں، موتیے کی ہلکی ہلکی خوش بو ہمیں تازگی، پاکیزگی اور مسرت کا احساس دلاتی ہے۔ اگر فرصت مل جاتی تو موتیے کے پھول پرو کر پن کے ساتھ بالوں میں لگا لیتیں' یا ایک ہاتھ میں گجرا ڈال لیتیں۔ پھر وہ اِدھر اُدھر جہاں جاتیں' موتیے کی خوشبو ان کے ساتھ ساتھ چلتی' اور وہ ایک انجانی مسرت سے سرشار خوش خوش کام کیے جاتیں۔ وہ موتیے کے خشک اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو بھی بڑی احتیاط سے رکھتیں۔ ان پھولوں کو وہ ناریل کے تیل میں ڈال کر اپنے لیے خوشبودار تیل تیار کرتی تھیں' پھر جب پھولوں کا موسم نہ ہوتا' اور وہ یہ تیل لگاتیں تو لگتا جیسے بن موسم موتیا کھل گیا ہو۔ ہر طرف موتیے کی ہلکی ہلکی مہک پھیل جاتی۔ شام کو صحن میں رکھے کورے گھڑوں کے گرد گجرے لپیٹ دیتیں تو موتیے کی مہک پانی سے بھی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی۔

بجیا کہتی تھی۔

"امی جان اور موتیے کی خوشبو لازم و ملزوم ہے' اور ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناممکن ہے۔"

امی جان کم گو تھیں' اور اپنے جذبات کا بہت کم اظہار کرتیں' مگر اکثر کہتیں۔ "میری خواہش ہے کہ موتیے کی پاکیزہ خوشبو کی طرح میرے بچوں کی خوشبو بھی چار عالم میں پھیلے۔"

بچے فرماں بردار، سلجھے ہوئے اور محنتی تھے۔ امی جان کی تربیت اور ابو جان کے دوستانہ رویے نے انہیں خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ وہ خود دار، غیور اور پسندیدہ اطوار کے مالک تھے۔ چاہے وہ وقت کے فاقے سے ہوں، سر اٹھا کر چلتے اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ امی جان انہیں ہمیشہ توکل، صبر اور قناعت کا سبق دیتیں۔

ابو جان نے صرف ایک بار سمجھایا تھا' "بچو! خودداری میں عجب لذت ہے۔ سر اُٹھا کے جینا ہے' تو خدا کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا۔ اگر ایک بار تمہارا ہاتھ اٹھ گیا' تو عمر بھر

سر جھکا رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سر اٹھا کر جیو، سر جھکا کر نہیں۔"

چنانچہ ان میں عجیب قلندرانہ شان آ گئی تھی۔ کچھ مل گیا تو ٹھیک ہے، نہ ملا تو کوئی غم نہیں۔ کم قیمت، کم صاف ستھرے، اجلے کپڑوں میں وہ شہزادوں کی سی شان سے رہتے۔ کوئی گاڑی پر جا رہا ہے یا جہاز پر کوئی غم نہیں۔ ان کی ٹانگیں سلامت ہیں چلنے کو اور جو تھک گئے' تو ویگنیں، بسیں، تانگے وغیرہ کس مرض کا علاج ہیں۔ کوئی گاڑی میں بیٹھنے کی آفر بھی کرتا' تو مسکرا کر ٹال دیتے۔ قدرت نے ذہانت وافر مقدار میں فراہم کی تھی' اور وہ اس ذہانت کا استعمال بھی خوب کرتے۔ تعلیمی میدان میں تو جو کارنامے سرانجام دیے، سو دیے۔ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ امی جان کی خواہش تھی کہ ان کے بچے کسی مقام پر پہنچیں۔ اس لیے تنگی، ترشی میں وقت گزارا' مگر بچوں کو اچھے سکولوں میں داخل کر دیا۔ ابو یوں تو ٹیکنیکل انجینئر تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی' مگر یہ مہنگائی کا دور' پھر بچوں کی تعلیم۔ بمشکل گزر بسر ہوتی، عیش کرنا چاہتے تو اس مقام پر تھے کہ لاکھوں میں کھیلتے' مگر ان کے ضمیر نے کبھی گوارا نہ کیا کہ بچوں کو حرام کا لقمہ کھلائیں۔ بیوی بھی اپنے جیسی ہی ملی تھی۔

سادہ مزاج، قانع اور صابر۔

پہلی بار تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے انہوں نے واضح کر دیا تھا۔

"سامعہ بیگم! یہ ہے میری کل تنخواہ۔ اسی میں تمہیں گزارہ کرنا ہوگا۔ یہ میرے خون پسینے کی کمائی ہے' اور اس میں ایک پیسہ بھی حرام کا نہیں۔"

سامعہ بیگم نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے تنبیہ کی۔ "اور جس دن حرام کا پیسہ اس گھر میں آیا، وہ اس گھر میں میرا آخری دن ہوگا۔ میں اپنے بچوں کو حلال لقمہ کھلانا چاہتی ہوں، حرام نہیں۔"

تب رضوان واسطی نے بے اختیار خوش ہو کر اعتراف کیا تھا۔ "واقعی، نیک بیوی بھی خدا کا ایک بڑا عطیہ ہے۔"

یہ شاید حلال لقمے کھلانے کا ہی اثر تھا کہ ان کی ساری اولاد نیک، صالح اور پاکیزہ اخلاق و کردار کی مالک تھی۔ ابو کو پان سگریٹ کا کوئی شوق نہ تھا۔ البتہ وہ مطالعے کے بے حد شوقین تھے۔ ہر اچھی کتاب ان کی کمزوری تھی۔ جہاں کوئی علمی و ادبی کتاب انہیں نظر آئی جھٹ خرید لائے۔ ان کا یہ علمی و ادبی خزانہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کتاب کو بڑے ادب، احترام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور توجہ سے پڑھتے اور کہتے تھے۔

"کتاب کو ادب اور قرینے سے پڑھو، تبھی کچھ پا سکو گے۔"

ان کی پڑھی ہوئی کتابیں صاف، ستھری، بے شکن ہوتیں جیسے ان چھوئی کلیاں۔ بچوں کو پڑھنے کے لیے کوئی کتاب دیتے تو تلقین کرتے کہ احتیاط اور پریم سے پڑھنا۔ کونے مڑے ہوئے نہ ہوں، صفحات بے شکن ہوں پھر اکثر پڑھی ہوئی کتاب پر بحث کرتے۔

"کیوں میاں عثمان یہ جو مصنف نے تصوف کے موضوع پر بحث کی ہے تو کہاں تک اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے؟"

عثمان بھائی اپنی رائے پیش کرتے۔ "میرے خیال میں تو مصنف اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔ اس کے خیالات بڑے الجھے الجھے گنجلک اور پیچیدہ ہیں، جیسے خود اس کے سامنے بھی کچھ واضح نہیں۔ ہر چیز پوشیدہ اور دھند میں چھپی ہوئی۔"

"اور تم کیا کہتے ہو میاں؟" وہ جبران سے پوچھتے۔

"میں عثمان بھائی سے متفق ہوں جب تک رہبر کی نظر میں خود اس کی منزل واضح نہ ہو، وہ کیوں کر رہنمائی کر سکتا ہے۔ ایک الجھا ہوا آدمی دوسروں کی زندگیوں کو سلجھا ہی نہیں سکتا۔ وہ تو سیدھا کسی گڑھے میں گرائے گا۔"

"ہاں ایک رہنما کے خیالات کو صاف، سیدھا اور واضح ہونا چاہیے۔" وہ تائید کرتے

"اور ہاں، میاں تصوف کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کو تیاگ کر دیا جائے۔ تصوف یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر، آدمیوں کے بیچ، سارے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس کی راہ پکڑی جائے۔ کانٹے بھرے راستے پر چلتے ہوئے کانٹوں سے بچنا ہی اصل پرہیز گاری ہے۔"

ان دنوں وہ سب فارغ تھے۔ رات کا کھانا کھا کر صحن میں بچھے پلنگوں پر بیٹھ کر باتیں کرنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ کبھی یوں ہی باتیں کرتے کرتے بیت بازی شروع ہو جاتی۔

عثمان بھائی، جبران اور عفان ایک طرف ہو جاتے۔

بجیا، نادیہ اور آپی اور عالیہ دوسری طرف۔ کبھی کھلا چوائس ہوتا کہ جو مرضی ہو، شعر پڑھیں لیکن کوئی شعر معیار سے گرا ہوا اور گھٹیا نہ ہو۔ کبھی پابندی لگا دی جاتی کہ صرف اقبال، میر یا فراز کے اشعار ہوں۔ کبھی علمی و ادبی بحث چھڑ جاتی۔ دھواں دھار دلائل دیے جاتے۔ ہر ایک اپنے موقف کی وضاحت میں بڑے بڑے دلائل لاتا اور دوسرے کو قائل کرنے

کی کوشش کرتا۔ علمی و ادبی بحث کے دوران ابو بھی ان میں آ بیٹھتے۔ انہیں بولنے کا پورا پورا موقع دیتے۔ پھر اپنے وسیع علم سے انہیں مستفید کرتے اور ان کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ انہیں مذہب، سیاست، ادب ہر موضوع پر عبور حاصل تھا۔

کبھی عثمان بھائی کی تجویز ایک مصرع طرح دے دیا جاتا۔ ہر کوئی اس طبع آزمائی کی کوشش کرتا۔ اسی کوشش میں غزلے، دوغزلے، سہ غزلے ہو جاتے۔ تک بندی تو وہ سب ہی کر لیتے تھے مگر جبران بھائی جو کچھ کہتے، وہ تک بندی نہ ہوتی۔ ان کے کہے ہوئے ہر شعر پر کسی کہنہ مشق شاعر کے شعر کا گمان ہوتا۔

امی ان کے اس شوق سے بہت چڑتی تھیں۔ وہ اسے اینچیوں والا شوق کہتی تھیں۔

"یہ بھی کوئی شوق ہے بھلا کہ دنیا و مافیا سے بے خبر فکر سخن کیے جاؤ۔ بیکاروں کا مشغلہ، ناکاروں کا کام۔" وہ جھلا کر کہتیں۔

اصل میں وہ اپنے ماموں کی وجہ سے شعر و شاعری سے نالاں تھیں۔ ان کے ماموں علی حیدر شوق شاعر تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری کرتے رہے، جب دیکھو قلم سنبھالے فکر سخن میں غرق ہیں۔ گھر اور بال بچوں سے بالکل بے خبر۔ بچہ بیمار ہے بلا سے۔ گھر میں فاقہ ہے تو کوئی پروا نہیں۔ وہ فکر سخن میں غرق شعر کہے جاتے۔ گھر کی حالت ابتر تھی۔ بچے بگڑ رہے تھے، کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے مگر وہ ہر بات سے بے خبر مشاعرے اٹینڈ کیے جاتے اور داد لیے جاتے۔ اسی لیے انی جان شاعری سے چڑتی تھیں۔

مگر عثمان بھائی ہنس ہنس کر کہتے۔

"آج کا شاعر ماموں جان کی طرح خوابوں کی دنیا میں رہنے والا انسان نہیں۔ وہ اپنے دور کے مسائل کو سمجھتا ہے اور شاعری کے ساتھ ساتھ اسے بھی حل کرنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ وہ حالات کو دیکھ کر آنکھیں بند نہیں کرتا۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا ہے۔"

کبھی چھوٹی چھوٹی شرطیں لگا کر کارڈز کھیلے جاتے۔ کبھی چاندنی رات میں دور تک ٹہلا جاتا۔ ان دنوں بجیا کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔ عفان کو جو بڑا چلبلا، ہنس مکھ اور ڈھول کی طرح بجا بجا کر لے اٹھاتا۔

مکھڑے پہ سہرا ڈالے آجاؤ آنے والے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاند سی بجیا میری تیرے حوالے

سب عفان کے گرد جمع ہو جاتے۔ جبران خالی گھڑا اٹھا کر اس پر تال دینے لگتا۔ عالیہ اور نادیہ آپی بھی اس کے ہمنوا ہو جاتیں اور تو اور عثمان بھائی بھی ان میں آ شامل ہوتے۔ بجیا شرماتیں، جھلاتیں، گلابی ہو جاتیں مگر عفان سے کچھ نہ کہہ پاتیں کہ بے چارہ ہوسٹل کی زندگی سے اکتایا ہوا دنوں بعد گھر آتا تھا اور ایسی فراغت کبھی کبھی ہی ملتی تھی کہ ایسی محفلیں منعقد کی جائیں۔ جبران بھی ہنس کھیل کر سخت کی ہوئی محنت کی تھکن اتار رہا تھا اور عثمان بھائی بھی فراغت کے ان لمحوں کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔ ہاں، ابو جان کے آنے کا وقت ہوتا تو یہ ساری ہلڑ بازی اور ہنگامہ ختم کر دیا جاتا۔ کیوں کہ پاس ادب مانع تھا۔

ایف ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہوا تو سب ششدر رہ گئے۔ جبران نے بورڈ ٹاپ کیا تھا۔ ذہین تو وہ ہمیشہ سے ہی تھا اور پرچے بھی بہت اچھے ہوئے تھے مگر پھر بھی اتنا اعزاز متوقع نہ تھا۔ خود جبران کو بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنے زیادہ نمبر لے گا۔ وہ تو جب اخباری رپورٹرز اس کے اول آنے کی نوید لے کر اس کا انٹرویو لینے آئے تو بقول عفان تب انہیں پتا چلا کہ ان سے کتنا بڑا کارنامہ سرزد ہو چکا ہے۔ نادیہ آپی، بجیا اور عالیہ کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہ لگ رہے تھے۔ عفان اور عثمان بھی اڑے اڑے پھرتے، خود جبران کی خوشی کا بھی عجیب عالم تھا۔ ابو جان نے اس کے کندھوں کو تھپکتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے لیے یہ کچھ زیادہ غیر متوقع بھی نہیں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔''

اور ابو جان کا یہ جملہ اسے ساری تعریف و ستائش سے زیادہ بھاری لگا۔ امی جان بار بار نظر کی دعا پڑھ کر اس پر پھونکتیں۔

''کوئی ضرورت نہیں، اخبار میں تصویر وغیرہ چھپوانے کی، نظر لگ جاتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''امی جان۔ ایسا شہزادہ گلفام بھی نہیں آپ کا بیٹا' جو نظر لگنے کا احتمال ہو۔'' جبران کو ہنسی آ گئی۔

''کسی سے بھی کم نہیں ہے۔'' امی جان نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا'' کوئی میری آنکھ سے دیکھے......تو خیر جاؤ......خدا تمہارا نگہبان ہو۔''

''ارے، امی جان تو اس طرح جبران بھائی کو انٹرویو کے لیے بھیج رہی ہیں' جیسے وہ محاذ

جنگ پر جا رہے ہوں۔'' عفان نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ ماں ہیں عفان اور ماؤں کے دل بہت گداز ہوتے ہیں۔'' عثمان بھائی نے دھیمے لہجے میں سرزنش کی اور جبران کا بازو پکڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑے' جہاں اخباری نمائندے ان کے منتظر تھے۔

امی جان آنچل پھیلا کر دعا مانگنے لگیں۔

''خدایا! میرے بچوں کو شاد و آباد رکھنا۔ انہیں دین و دنیا کی سربلندی عطا فرمانا اور انہیں ہر دکھ سے بچانا۔''

دعا مانگتے مانگتے جانے کیوں ان کی آنکھیں بھیگ گئیں تو عالیہ جو وہیں بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی، بے چین ہو کر بولی۔

''امی جان آپ ہر خوشی کے موقع پر رونے کیوں لگتی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ جبران بھائی بغیر کسی سفارش اور ناجائز وسیلے کے صرف خدا کے بھروسے اور اپنی محنت کے بل بوتے پر اتنا بڑا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں پھر ان آنسوؤں کا مطلب۔''

''یہ خوشی کے آنسو ہیں پگلی!'' امی جان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لئے اٹھ گئیں۔

جبران کی شاندار کامیابی پر سب خوش تھے۔ لوگ مبارک باد دینے کے لیے آ جا رہے تھے اور ساتھ ہی اپنے مشورے بھی کہ اسے آگے کیا کرنا چاہیے۔ کون سے سبجیکٹ رکھنے چاہئیں اور کن سبجیکٹ میں اسکوپ زیادہ ہے۔ داخلے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان شاندار مارکس کے ساتھ وہ جس کالج میں بھی چلا جاتا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ چنانچہ اسے بڑی آسانی کے ساتھ داخلہ مل گیا۔ پرنسپل صاحب نے مختلف سوالات پوچھنے کے بعد اس کے مارکس شیٹ دیکھی تو چونک پڑے۔

''تم وہی جبران واسطی ہو نا جس نے بورڈ ٹاپ کیا ہے۔''

''یس سر!''

''یو آر اے جینئیس۔'' ان کا لہجہ بڑا تحسین بھرا تھا۔

''تمہارے داخلے کے لیے تو کسی انٹرویو کی ضرورت نہیں۔'' انہیں یہ پُر اعتماد سا لڑکا اچھا لگا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تھینک یو سر!'' جبران نے ممنون ہو کر کہا۔

اسی کے پورے کالج میں یہ خبر گردش کر گئی کہ بورڈ ٹاپ کرنے والے لڑکے نے اس کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ لڑکے بار بار ایک دوسرے سے پوچھتے کہ بھئی وہ جبران کون ہے جس نے بورڈ ٹاپ کیا ہے پھر اس سے ملتے اور مبارک باد دیتے۔ وہ سب اس کی دوستی کے خواہاں تھے۔

چند دن یوں ہی گزر گئے۔ کچھ نیو ایڈمیشن کا چکر۔ کچھ چھوٹے موٹے فنکشن پھر باقاعدہ پڑھائی شروع ہو گئی۔ جبران پورے طور پر کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اپنے شاندار ریکارڈ کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ وہ پڑھائی کو اپنے اعصاب پر سوار نہیں کرتا تھا بلکہ ایک ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھتا اور دوسری دلچسپیوں کے لیے بھی وقت نکالتا۔

کالج میں ڈیبیٹس ہو رہی تھیں۔ وہ بہت شروع سے پرائمری کلاسز سے ڈیبیٹس کرتا آ رہا تھا۔ اس کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا، دل نشیں اور الفاظ ٹھوس اور مدلل ہوتے۔ پرنسپل نے اس کی تقریر سنی۔ اس کے بولنے کا انداز، کھڑا ہونے کا اسٹائل، دوسروں پر چھا جانے والے تیور اور بات منوانے کا قرینہ وہ بڑے متاثر ہوئے۔ فرسٹ پرائز تو اس نے لینا ہی تھا مگر پرنسپل کی ستائش اس کے لیے سب سے بڑھ کر تھی۔

''تم تو ہر چیز میں ماسٹر ہو جبران۔'' انہوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا ''بہترین اسٹوڈنٹ، بہترین کھلاڑی، بہترین ڈیبیٹر، پتا نہیں کیا کیا جوہر چھپے ہوئے ہیں تم میں...... میاں دیکھنا تم کسی دن بہت مقام پر پہنچو گے۔ اتنے اونچے مقام پر جو ابھی تمہارے تصور میں بھی نہیں۔ تم ہمارے کالج کا فخر ہو۔''

''تھینک یو سر۔ آپ کے یہ الفاظ میرے لیے ہر انعام سے بڑھ کر ہیں۔'' جبران نے بڑی شائستگی سے شکریہ ادا کیا۔

پھر دوسرے کالجوں اور دوسرے شہروں میں اسے مختلف کمپٹیشن میں بھیجا جانے لگا۔ مشاعرے، ڈیبیٹس، مضمون نگاری، ہر مقام پر وہ چھا جاتا اور کوئی اس سے آگے نہ نکل پاتا۔ وہ کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بھی تھا۔ اس کی ٹیم ہمیشہ ٹرافی جیتتی۔ سب پروفیسر اور پرنسپل اس پر نازاں تھے۔ اس نے کالج کے وقار اور قدر و قیمت میں اضافہ کیا تھا۔ ہر طرف اس کی دھوم تھی۔

ان دنوں بین الکلیاتی مباحثے میں حصہ لینے کے لیے جبران اور اس کے کالج کے چند اور لڑکے پروفیسر نذر کی قیادت میں کراچی گئے ہوئے تھے کہ فزکس کے پروفیسر نقوی صاحب کا تبادلہ ہوا اور ان کی جگہ پروفیسر امین ملک آئے۔ جب جبران کراچی سے لوٹا تو اسے پہلی خبر یہی ملی۔

''کیسے ہیں نئے سر!''

''اچھے ہیں۔'' فیاض نے بتایا۔

''نقوی صاحب کی طرح بوڑھے نہیں ہیں، لگتا ہے نئے نئے لیکچرار لگے ہیں۔ جوان اور ویل ڈریسڈ، ہنس مکھ اور خوش مزاج، اسٹوڈنٹ سے ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتے ہیں اور پڑھاتے بھی اچھا ہیں۔''

''چلو پھر ٹھیک ہے۔'' جبران مطمئن ہو گیا۔

اگلے دن اس نے پروفیسر امین ملک کو دیکھا۔ ان کے مزاج میں شگفتگی غایت درجہ کی تھی۔ پڑھاتے پڑھاتے ایسا چٹکلا چھوڑتے کہ کلاس زعفران زار ہو جاتی۔ اس قسم کے پروفیسر اور لیکچرار اسٹوڈنٹ اور اپنے کولیگز میں بہت پاپولر ہوتے ہیں۔ ابھی انہیں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر لوگ انہیں پسند کرنے لگے تھے۔ جبران کو بھی وہ بہت اچھے لگے۔ انہوں نے آتے ہی پچھلے لیکچر کے متعلق چند سوالات کیے۔ جو بات کل کے لیکچر میں اسٹوڈنٹ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس کی وضاحت آسان لفظوں میں کی اور مثالیں دے کر سمجھایا۔ پھر جب دیکھا کہ سوال کرنے والے مطمئن ہو گئے ہیں تو انہوں نے اگلا ٹاپک بتایا اور اس پر لیکچر دینے لگے۔ لیکچر دیتے دیتے ان کی نظر جبران پر پڑی تو وہ چونکے۔

''یو...... نیو کمر...... واٹ از یور نیم......؟''

''جبران واسطی سر! اینڈ آئی ایم ناٹ نیو کمر۔'' جبران نے کھڑے ہو کر کہا۔

''اوہ......'' انہوں نے اوپر سے نیچے تک اسے غور سے دیکھا ''تو آپ ہیں وہ جو بین الکلیاتی مباحثے میں اول آئے ہیں؟''

''یس سر!''

''اور غالباً آپ ہی نے بورڈ ٹاپ کیا تھا؟'' انہوں نے عینک کے پیچھے سے اسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھا۔

"یس سر!"

"آپ کا کوئی عزیز ایجوکیشن کے شعبے میں ہے؟" وہ جیسے لفظوں کو چبا رہے تھے۔

طلباء زیرلب مسکرائے اور انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"نو سر! میرا کوئی عزیز اس شعبے میں نہیں۔" جبران نے براہ راست ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو پھر گورنمنٹ کا کوئی بڑا آفیسر؟"

طلباء کی زیرلب مسکراہٹیں دبی دبی ہنسی میں تبدیل ہوگئیں۔

"نو سر!" جبران نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "نہ تو میرا کوئی عزیز ایجوکیشن کے شعبے میں ہے نہ کوئی گورنمنٹ افیسر۔ میرے والد آئل کمپنی میں ٹیکنیکل انجینئر ہیں اور...... اور سر یہ سب اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیاں ہیں۔"

پروفیسر امین ملک جو کچھ اسے جتانا چاہ رہے تھے، اپنی بے پناہ ذہانت کی بدولت وہ سمجھ گیا تھا۔

"آپ پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیاں کچھ زیادہ نہیں ہو رہیں؟" پروفیسر امین ملک نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

لڑکے کھل کر ہنسنے لگے۔

پروفیسر امین ملک نے ان کی طرف دھیان دیے بغیر کہا۔

"میرا مطلب ہے، آپ خود کو اس کا اہل سمجھتے ہیں؟"

جبران کا رنگ بدلنے لگا۔ اسے لگا، جیسے پروفیسر امین ملک جان بوجھ کر اس کی انسلٹ کر رہے ہوں۔ اس کی صلاحیتوں کو چیلنج کر رہے ہوں۔ مگر پھر وہ ان سے فطری خوش طبعی سمجھا۔

"شاید۔ شاید سر مذاق کر رہے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔"

"سر اہلیت نااہلیت کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے' جس نے مجھے اس قابل کیا اور جس کے ہاتھ میں میزان ہے۔" اس نے مؤدب ہو کر کہا۔ "اور وہ جسے چاہتا ہے، عزت دیتا ہے اور

جسے چاہتا ہے ذلت۔"

پروفیسر امین ملک کچھ لاجواب سے ہوگئے۔

"سٹ ڈاؤن لڑکے۔ تم باتوں کے بھی شیر ہو۔ اینڈ ناؤ بی سیریس۔" انہوں نے باقی کلاس سے مخاطب ہو کر کہا اور دوبارہ لیکچر دینے لگے۔

پیریڈ آف ہوا تو تمام لڑکے جبران کے گرد جمع ہوگئے۔

"یہ کیسی گفتگو تھی بھئی، لگ رہا تھا جیسے دو پہلوان اکھاڑے میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں۔" سرفراز نے پوچھا۔

"تم لوگوں کی آپس میں کوئی خاندانی دشمنی تو نہیں ہے؟" علی نے تشویش سے کہا۔

"نہیں یار، میں تو ان کو جانتا تک نہیں۔ شاید ان کی مذاق کی عادت ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے، بہت شگفتہ مزاج ہیں۔ ویسے ہی چھیڑ رہے تھے تمہیں مگر یار، تم نے بھی انہیں لاجواب کر دیا۔"

جبران ایک دو دن الجھا الجھا سا رہا۔ گھر میں سر کے رویے کا ذکر کیا۔ ان کا طنزیہ سا تفتیشی انداز۔ جیسے وہ کسی جرم کی انکوائری کر رہے ہوں اور ٹٹولنے والی چبھتی ہوئی نظریں کہ آدمی خوامخواہ اپنے آپ کو مجرم سمجھے۔

عثمان بھائی نے سمجھایا۔ "خوامخواہ اثر لے رہے ہو۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے چبھتی ہوئی طنزیہ باتیں کرنے کی اور اس سے ان کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ جب تم ان کے مضمون میں اچھے نمبر لو گے تو انہیں خود ہی تمہاری اہلیت کا اندازہ ہو جائے گا پھر وہ خود بخود اپنا رویہ بدل لیں گے۔ یوں بھی یہ دور رشوت۔ اور سفارش کا ہے اور اگر انہوں نے تمہارے متعلق بھی ایسا سوچا ہے تو اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور نہیں۔ وہ خود ایجوکیشن کے شعبے میں ہیں اور اس شعبے میں ہونے والی ساری بدعنوانیاں ان کی نظر میں ہیں۔"

"مگر عثمان بھائی!" جبران نے احتجاج کیا۔ "اگر انہیں یہ شک بھی تھا کہ میں سفارش کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اس پوزیشن پر پہنچا ہوں، تو بھی انہیں یہ انکوائری علیحدگی میں کرنی چاہیے تھی اور اگر واقعی میں نے سفارش یا رشوت کے زور پر پوزیشن حاصل کی ہوتی تو کیا میں اقرار کر لیتا۔ نہیں عثمان بھائی وہ نہ صرف دوسروں کو باور کرانا چاہتے تھے کہ ایسا ہوا ہے یا کہ یوں بھی ممکن ہے۔" وہ ہمیشہ بات کی تہہ تک پہنچ جایا کرتا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ایسا ممکن نہیں۔ تمہاری ان کے ساتھ کوئی ایسی دشمنی نہیں تھی جو وہ بدلہ لیتے۔ عادتاً انہوں نے کچھ کہہ دیا۔ تم بھی اسے لائٹلی لو۔ گو انہیں کہنا چاہیے تھا مگر خطائے بزرگاں گرفتن خطا است۔"

"ٹھیک ہے، عثمان بھائی! شاید یہ ان کی عادت ہی ہو۔"

جبران نے بات ذہن سے نکال دی۔ ظاہر ہے اگر انہوں نے عادتاً کچھ کہہ دیا تھا تو اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ بہت دن ایکسٹرا ایکٹیویٹیز میں ضائع ہو گئے تھے اس لیے جبران سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔

اس دن بھی وہ بڑے دھیان سے پروفیسر امین ملک کا لیکچر سن رہا تھا وہ پہلے لیکچر دیتے رہے پھر بلیک بورڈ پر نیومیریکل کرنے لگے۔ جبران بڑے دھیان سے انہیں دیکھتا اور سمجھتا رہا پھر وہ یک دم چونکا۔ پروفیسر امین جو فارمولا اس نیومیریکل کو حل کرنے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ وہ یہاں پر یوز نہیں ہو سکتا تھا۔ سابقہ لیکچرز کا ایک پوائنٹ اس کے ذہن میں تھا۔

"کیا سر بے دھیانی میں یہ فارمولا لکھ گئے ہیں یا وہ اسٹوڈنٹ کو جانچنا چاہ رہے ہیں۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پل بھر کے لیے وہ ہچکچایا پھر اس کی خود اعتمادی عود کر آئی۔

"ایکسکیوزمی سر!" وہ یک دم کھڑا ہو گیا۔

"یس!" پروفیسر امین لکھتے لکھتے رکے اور چاک ہاتھوں میں لیے اس کی طرف مڑے اور بڑی ناگواری سے پوچھنے لگے۔

"واٹ از دی پرابلم۔"

"سر میرا خیال ہے کہ۔" وہ ذرا ہچکچایا۔ "میرے خیال میں سر یہاں نیومیریکل میں یہ فارمولا یوز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ......"

"خوب...... گویا آپ اتنے قابل ہو گئے ہیں کہ لیکچررز کی غلطیاں نکال سکیں؟" پروفیسر امین نے طنزیہ کہا۔

"نو سر! مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ فارمولا یہاں کیوں استعمال کیا گیا ہے کیوں کہ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ۔"

"صاحب زادے، تم مجھ سے زیادہ لائق، زیادہ پڑھے لکھے ہو۔ پھر تمہیں کلاسز اٹینڈ

کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

پروفیسر امین ملک چاک گھماتے اس کے قریب آ گئے۔ وہ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے گھور رہے تھے۔

جبران نے قدرے نروس ہو کر انہیں دیکھا۔ "میرا یہ مطلب نہیں سر! میں تو صرف سمجھنا چاہتا تھا۔"

"سمجھنا چاہتے تھے یا مذاق اڑانا۔" مارے غصے کے وہ چلا اٹھے۔

"میں تم جیسے لڑکوں کو لمحہ بھر کے لیے برداشت نہیں کر سکتا۔ میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔"

"مگر سر!" جبران نے قدرے حیران ہو کر کچھ کہنا چاہا۔

مگر پروفیسر امین کچھ اس قدر طیش میں آ چکے تھے کہ وہ حلق کے بل دہاڑے۔ "آئی سے گیٹ آؤٹ۔"

ان کا لہجہ ہی سخت نہیں تھا بلکہ وہ بے قابو ہو کر اس پر ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ جبران نے جو ان کے اس قدر شدید ردعمل پر ششدر سا تھا، اپنی طرف بڑھتے ان کے ہاتھ کو تیزی سے تھام لیا۔

پروفیسر امین ملک نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام سی کوشش کی مگر جبران نے غیر ارادی طور پر ان کے نازک سے کمزور ہاتھ کو اپنے مضبوط صحت مند ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"سر کالج رولز کے مطابق آپ مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ "اور میں تو صرف اپنے ذہن کی تشفی کے لیے آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اس سے آپ کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ پھر بھی سوری، آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

اس نے پروفیسر امین ملک کا ہاتھ چھوڑ دیا اور خاموشی سے سر جھکائے کلاس سے باہر نکل گیا۔ طلباء کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پروفیسر امین ملک تھوڑی دیر دم بخود سے کھڑے رہے۔ انہیں اس قسم کے لڑکے انتہائی ناپسند تھے' جو اتنے اعتماد سے ٹیچر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کریں اور ان کی غلطیاں پکڑیں۔ اس کے ہاتھوں کی وہ فولادی گرفت انہیں اب تک اپنی انگلیاں میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اسے جرأت کیسے ہوئی ان کا ہاتھ تھامنے کی اور انہیں روکنے کی۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ اگر خود سے ان کا ہاتھ نہ چھوڑتا تو وہ پوری طاقت صرف کر کے بھی اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکتے تھے۔ اس نے ان کا ہاتھ چھوڑ کر اور اپنی طاقت کا مظاہرہ نہ کر کے انہیں خفت سے بچا لیا تھا۔

بمشکل خود پر قابو پا کر وہ بلیک بورڈ کی طرف مڑے تو ٹھٹک سے گئے۔ وہ واقعی غلط فارمولا یوز کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے بے دھیانی میں وہ یہ غلطی کر گئے تھے اور جبران انہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہے تھے یا سننا نہیں چاہ رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اب اگر وہ کلاس کے سامنے دوسرا فارمولا یوز کریں تو کتنی سبکی ہو۔ یہ جبران اپنی ایکسٹرا آرڈنری ذہانت کی بدولت ان کی غلطی نوٹ کر گیا تھا جب کہ باقی طلبا تو ابھی اچھی طرح سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ انہوں نے ڈسٹر اٹھایا اور بلیک بورڈ صاف کر دیا۔

''آج میں مزید پڑھا نہیں سکوں گا۔'' انہوں نے چاک ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا۔

اور جب تمام ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل گئے تو ان کا غصہ عود کر آیا۔

''یہ کل کا لونڈا۔ میرے مقابلے پر اتر آیا ہے۔''

وہ اندر ہی اندر کھولتے ہوئے بار بار مٹھیاں بھینچتے اور کھولتے رہے۔

''تم ہو کس خیال میں جبران واسطی۔ تمہاری یہ ساری اکڑ نکال نہ دوں تو میرا نام بھی امین ملک نہیں۔''

انہوں نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

''سر! مے آئی کم آن سر۔'' جبران واسطی دروازے پر کھڑا ان سے اجازت مانگ رہا تھا۔

''نہیں۔ میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' انہوں نے کھولتے ہوئے ذہن کے ساتھ کہا۔

''سر پلیز! صرف دو منٹ۔''

''نیور۔'' انہوں نے ابلتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔ انہیں تیزی سے آتے دیکھ کر جبران جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر گئے۔

''سر پلیز۔ میری بات تو سن لیں۔ سر میں شرمندہ ہوں۔ وہ تیزی سے ان کے پیچھے لپکتے ہوئے بولا۔

مگر امین ملک اس کی سنے بغیر پرنسپل کے آفس میں گھس گئے۔

لڑکے جبران کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کچھ جبران کو داد دے رہے تھے، جب کہ باقیوں کا خیال تھا کہ جبران نے پروفیسر امین ملک کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ خود جبران کا بھی یہی خیال تھا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہائیلی ایجوکیٹڈ ہیں۔ مجھے انہیں ٹوکنا نہیں چاہیے تھا۔'' جبران حد درجہ شرمندہ تھا۔

''مگر یار، انہوں نے بھی تو بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اگر تمہیں کوئی بات کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی تو سمجھا دیتے۔'' ایاز نے احتجاج کیا۔

''شاید انہوں نے اسے گستاخی سمجھا۔ اسی لیے وہ ناراض ہو گئے۔'' جبران نے آہستہ سے کہا۔

''وہ معاف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔'' جبران نے مایوس ہو کر کہا۔

''اس وقت وہ غصے میں ہیں۔ شام کو ان کے گھر چلے جانا بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ میں اور شبیر بھی ساتھ چلیں گے۔ یار، وہ اتنے سخت دل نہیں ہو سکتے؟'' ایاز نے کہا۔

''ٹھیک ہے یہ کوشش بھی کر لیتے ہیں۔'' جبران نے بے یقینی سے کہا۔

اگلا پیریڈ سر نذیر کا تھا' جو اسلامیات پڑھاتے تھے۔ جبران کچھ اپ سیٹ سا بے دھیانی کی حالت میں ان کا لیکچر سن رہا تھا، جب چپڑاسی فضل داد چٹ لایا۔

''جبران واسطی۔ آپ کو پرنسپل نے اپنے آفس میں بلایا ہے۔'' پروفیسر نذیر نے چٹ پر سے نظریں ہٹا کر کہا۔

جبران پریشان سا پرنسپل کے آفس میں چلا آیا۔ وہاں پروفیسر امین کے علاوہ پروفیسر حسن بھی تھے۔ پرنسپل ایک فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

''یس سر!'' وہ مؤدب پرنسپل کے سامنے کھڑا ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

''جبران واسطی۔'' بالآخر پرنسپل عباس احمد نے فائل ایک طرف رکھ کر اسے دیکھا۔ ''کم از کم آپ جیسے ہونہار طالب علم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔''

''سر! میں سمجھا نہیں۔'' جبران نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

''آپ نے پروفیسر امین کی انسلٹ کی اور ان کے ساتھ غلط رویہ اختیار کیا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں سر! میں کیسے ان کی انسلٹ کر سکتا ہوں۔ درحقیقت میں سمجھ نہیں رہا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا۔" جبران نے صفائی پیش کی۔

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔" پرنسپل کا لہجہ ترش ہو گیا۔

"پروفیسر امین تمہارے گستاخانہ رویے کی بدولت ریزائن دینے پر تلے ہیں اور کوئی یوں ہی انتہائی قدم نہیں اٹھاتا۔ تمہارا رویہ ضرور ناقابل برداشت رہا ہوگا اور تم جیسے لڑکوں کو سبق دینے کے لیے میں تمہیں تین سال کے لئے آؤٹ کرتا ہوں۔"

"سر!" جبران چکرا سا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پرنسپل اتنا سخت قدم اٹھا لیں گے۔ "سر! خدا کے لیے یوں نہ کہیں۔" جبران کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"میرا مستقبل...... میرا کیریئر...... سر میں تباہ ہو جاؤں گا۔" وہ کراہ اٹھا۔

پرنسپل عباس احمد نے ایک نظر اسکے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا تو انہیں لگا، جیسے وہ بے ہوش ہو کر گرنے والا ہو۔ گھبرا کر انہوں نے پروفیسر امین کو دیکھا مگر ان کے چہرے کے نقوش اسی طرح تنے تنے سے تھے۔ بے اختیار انہوں نے اپنے سامنے فائل کھول لی۔

"اگر پروفیسر امین تمہیں معاف کر دیں تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے اضطراری کیفیت میں فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا "ورنہ میں مجبور ہوں۔"

"سر! میں سچ کہتا ہوں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کی توہین نہ تھا۔" وہ مضطرب سا ہو کر پروفیسر امین کی طرف بڑھ آیا۔ "آپ چاہے جو سزا مجھے دیں مگر میرا مستقبل، میری زندگی داؤ پر نہ لگائیں۔ سر آپ جتنا چاہیں مجھے مار لیں اپنا غصہ نکال لیں مگر اس طرح نہیں سر۔ خدا کے لئے میں آپ کی منت کرتا ہوں۔"

"یہاں تماشا مت دکھاؤ۔ پرنسپل کا آفس ہے۔ کوئی بازار نہیں۔" پروفیسر امین ترش روی سے کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

جبران کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آفس سے باہر آیا۔ پروفیسر حسن اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلے۔

"کیا بات ہوئی تھی جبران جو پروفیسر امین اتنے غصے میں ہیں۔" سر حسن کے لہجے میں ہمدردی بھی تھی اور تاسف بھی۔

"سر! میں سچ کہتا ہوں۔ مگر سر کو یقین نہیں آ رہا۔ وہ میری بات نہیں مان رہے۔"

جبران کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔

"حوصلہ کرو لڑکے اور ساری بات بتاؤ۔" سر حسن نے پھر کہا۔

جبران نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں ساری بات بتائی۔ سر حسن کسی سوچ میں پڑ گئے۔

"پروفیسر امین کا مطالبہ ہے کہ یا تو ان کا ریزائن قبول کیا جائے یا تمہیں تین سال کے لیے آؤٹ کر دیا جائے۔" سر حسن نے بتایا "ریزائن قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یوں بھی پرنسپل صاحب پروفیسر امین کے عزیز ہیں۔ تم ایسا کرو، پروفیسر امین کو پکڑو۔ کسی بھی طرح انہیں مناؤ۔"

وہ پریشان و مضطرب سا دوستوں میں چلا آیا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر سب نے پوچھا مگر وہ کچھ بتا نہ سکا۔ ہمیشہ سے وہ بیسٹ اور موسٹ اور بیڈ یننٹ اسٹوڈنٹ رہا تھا۔ اسکے اطوار پسندیدہ اور شائستہ تھے۔ اساتذہ اسے پسند کرتے تھے اور وہ ان کا احترام کرتا تھا۔ مگر اب اسے بدتمیزی سے کی وجہ سے تین سال کے لیے آؤٹ کیا جا رہا تھا۔ یہ واقعہ اس کی شاندار تعلیمی زندگی پر بدنما داغ تھا۔

اس کے حواس کھو رہے تھے۔

"آخر کیا بات ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں۔" علی نے اس کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"علی! میں ایسا نہیں ہوں، جیسا سب سمجھ رہے ہیں۔"

جبران نے بے بسی سے کہا۔ "وہ...... وہ کالج سے نکال رہے ہیں علی۔ وہ مجھے تباہ کر رہے ہیں۔" جبران سسک اٹھا۔

علی ششدر رہ گیا۔ "نہیں...... ایسا اندھیرا۔"

"ہاں۔ مجھے انہیں ٹوکنا نہیں چاہیے تھا۔ مگر میرا ذہنی تجسس۔ میرے خدا! میں تباہ ہو گیا۔" جبران نے سر تھام لیا۔

"نہیں یار۔ ایسے کس طرح ہو سکتا ہے ہم ان سے بات کرتے ہیں، ملتے ہیں ان سے۔"

ایاز نے دلاسا دیا اور وہ سر امین کو ڈھونڈنے لگے۔ مگر سر امین مل ہی نہیں پا رہے تھے۔ وہ شاید جان بوجھ کر چھپ گئے تھے۔ لاچار ہو کر انہوں نے چھٹی کے بعد ان سے ملنے کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فیصلہ کیا۔

مگر جب وہ علی اور ایاز کے ساتھ پروفیسر امین ملک کے گھر گیا تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ جبران کا چہرہ اتر گیا۔

"یار، اتنے فکر مند مت ہو۔ ایک دو دن میں ان کا غصہ اتر جائے گا تو پھر بات کریں گے۔"

جبران چپ کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے قلم نکالا اور پاکٹ ڈائری سے صفحہ پھاڑ کر لکھا۔

"سر خدا کے لئے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے صرف ایک موقع دیں، آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"پھر کاغذ کی وہ چٹ منت سماجت کر کے اندر بھجوا دی۔

چند منٹ بعد نوکر آیا اور گیٹ بند کرنے لگا۔ "تم نے وہ چٹ پروفیسر صاحب کو دی۔" علی نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"پھر؟"

"انہوں نے کہا ہے کہ گیٹ بند کر دو۔" نوکر نے بے رخی سے کہا اور گیٹ بند کر دیا۔

وہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

"میرا خیال ہے، اب واپس چلتے ہیں۔ کل دیکھیں گے۔" ایاز نے مایوس ہو کر کہا۔

جبران خاموش سر جھکائے ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"میں کتنا احترام کرتا ہوں سر امین کا۔ مگر انہوں نے سمجھا کہ میں ان کی انسلٹ' میں سچ کہہ رہا ہوں ایاز۔ میرا ذہن مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ میں صرف اپنی تشفی چاہتا تھا۔"

جبران نے دل گیر ہو کر کہا۔

"تم ایکسٹرا آرڈنری ذہانت رکھنے والے لڑکوں کی یہ مصیبت بھی ہے تمہارا ذہن مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ تم ہر بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتے ہو۔ بعض اوقات یہ غیر معمولی ذہانت نقصان بھی پہنچا دیتی ہے۔ تمہیں انہیں ٹوکنے کی ضرورت کیا تھی۔" علی نے کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی مگر اس سے پہلے پروفیسر الطاف نے میری عادتیں بگاڑ رکھی تھیں

تمہیں معلوم ہے، میں سوال کیے جاتا اور وہ خوش دلی سے جواب دیے جاتے۔ اسی لیے شاید میں یہ جرأت کر بیٹھا۔"

"اور جرأت بھی جرأت رندانہ۔" ایاز مسکرایا۔ "جب وہ تمہیں تھپڑ مارنا چاہ رہے تھے تو تم نے ان کی یہ کوشش بھی ناکام دی۔ اس وقت ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ تمہیں کچا چبا جاتے۔"

"وہ ایک غیر شعوری حرکت تھی۔ مجھے افسوس ہے۔" جبران مزید شرمندہ ہو گیا، "مگر اس حرکت نے ان کے طیش کو سوا کیا۔ کاش میں ان کا ہاتھ نہ پکڑتا۔"

"اور چپ چاپ پٹ جاتے۔ نہیں میرے شیر جو کچھ تم نے کیا ٹھیک کیا۔ جب کالج رولز میں مارنے کی اجازت نہیں ہے تو۔ اب سوچنا یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کا غصہ کس طرح کم کیا جائے۔"

"میں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" جبران کا سر چکرا رہا تھا۔ "ان سے کہو مجھے مار لیں، جتنا دل چاہے۔ اپنا غصہ نکال لیں مگر اس طرح نہ کریں یوں میرے مستقبل سے نہ کھیلیں۔"

"ٹیک اٹ ایزی جبران۔ اتنے جذباتی مت بنو۔ یہ وقتی غصہ ہے۔ امید ہے کل تک اتر جائے گا۔" علی نے دلاسا دیا۔

"تم ایسا کرو۔ اب آرام کرو جا کر۔ صبح دیکھا جائے گا اور دیکھو یار، زیادہ سوچنا نہیں۔" ایاز نے کہا۔

مگر جبران بہت پریشان تھا۔ عثمان بھائی لاہور گئے ہوئے تھے ورنہ انہی سے مشورہ لیتا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے پروفیسر امین ملک اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کی نفرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں اور ان کی وہ کینہ توز چمک اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔

"بھلا سر مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟" انتہائی بے بسی سے اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور جب اس جواب کی جستجو میں اس کا ذہن لاچار ہو گیا اور دماغ پھٹنے لگا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر صحن میں نکل آیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے چلائے اور اپنا سر دیواروں سے ٹکرا دے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ جو اتنا فرماں بردار تھا اسے سر اٹھن گستاخ سمجھ رہے تھے اور اس کی غلطی کو معاف نہیں کر رہے تھے۔

کیا کرے وہ...... کہاں جائے؟

وہ کراہ اٹھا۔ اسے لگا جیسے وہ تھوڑی دیر اور سوچتا رہا تو اس کا دماغ پھٹ جائے گا گھبرا کر اس نے عالیہ کے دروازے پر دستک دی۔

"عالیہ...... عالی......"

عالیہ جو سوئی ہوئی تھی گھبرا کر اٹھی۔ "کیا ہے؟ کون ہے؟"

"یہ میں ہوں جبران، عالیہ دروازہ کھولو۔" جبران نے پتھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عالیہ نے دروازہ کھولا تو جبران لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آیا۔

"کیا ہوا؟ جبران بھائی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" بھائی کو لڑکھڑاتے دیکھ کر عالیہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"عالی...... عالی...... میں مر جاؤں گا۔" جبران نے سختی سے اپنے بالوں کو ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو جبران بھائی!" اس نے بمشکل اس کے ہاتھوں سے بال چھڑوائے۔

"ہوا کیا ہے...... کچھ بتائیں تو، خیرت ہے نا؟" وہ بے حد پریشان تھی۔

"کیا بتاؤں عالی! انہوں نے مجھے تباہ کر دیا۔"

جبران کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور چہرہ زرد پڑ رہا تھا' جیسے کسی نے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو۔

"میرا مستقبل، میری زندگی سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے عالی! وہ مجھے کالج سے نکال رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اتنی ذلت کے بعد میں زندہ نہ بچوں گا۔" جبران نے اپنا سر بازوؤں پر گرا دیا اور مارے ضبط کے ہونٹ کاٹ لیے۔

عالیہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"مگر کیوں کس جرم کی پاداش میں، وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔" بمشکل وہ بول سکی۔

"میرے مس بی ہیو کی وجہ سے۔" وہ شرمندگی سے نظریں نہ اٹھا سکا۔

"سب لوگ کیا سوچیں گے، میرے بارے میں۔ ابو جان، امی جان اور عثمان بھائی

اف!" اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ "عالیہ مجھے مر جانے دو۔ دعا کرو کہ کل صبح کا سورج نہ دیکھ سکوں۔ اس سے پہلے کہ سب کو خبر ہو۔ میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ خدایا، میں اب تک کیوں زندہ ہوں۔ میں مر کیوں نہیں جاتا۔" وہ کراہ اٹھا۔

"مت کہیں ایسا جبران بھائی۔" عالیہ بے قرار ہو گئی۔

"خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ ہمیں کتنے عزیز ہیں، ہم سب کو۔ اور ہمیں آپ پر کتنا اعتماد ہے، کتنا مان ہے۔ ہم میں سے کوئی آپ کے متعلق غلط نہیں سوچ سکتا، غلط نہیں سمجھ سکتا۔"

"میں نے اپنے خاندان کے نام کو بٹا لگایا۔ میں زندہ رہنے کا قطعاً مستحق نہیں۔"

جبران کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ "کل سارے شہر میں خبر پھیل جائے گی کہ مجھے کالج سے نکال دیا گیا تو ابا جان سر نہ اٹھا سکیں گے۔ عثمان بھائی کسی سے نظریں چار نہ کر سکیں گے۔ وہی لوگ جو ہمیں سراہتے ہیں، ہماری تعریفیں کرتے ہیں، ہمیں منہ در منہ برا کہیں گے، حقارت سے ہمیں دیکھیں گے اور نظروں سے گرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے عالی۔ آدمی نظروں سے گر کر نہیں بچ پاتا۔"

جبران کرسی کے بازو پر سر رکھ کر سسک اٹھا۔

"جبران بھائی۔ خدا کے لیے حوصلہ کریں۔" جبران نے تڑپ کر عالیہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"کسی کو مت جگاؤ۔ میں اس وقت کسی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ میں...... میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔" وہ دہشت زدہ سا کھڑا ہو گیا۔

"نہیں جبران بھائی......" کسی نامعلوم خوف سے گھبرا کر عالیہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ "میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ چلیے میں کسی کو نہیں جگاتی مگر آپ یہیں بیٹھیں میرے پاس اور مجھے ساری بات بتائیں۔"

جبران نے تفصیل بتائی تو وہ ششدر رہ گئی۔

"اتنی ذرا سی بات پر اتنا بڑا ایکشن، یقین نہیں آتا۔ پرنسپل کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ ڈانٹ ڈپٹ لیتے، فائن کر دیتے مگر کسی سٹوڈنٹ کی زندگی سے کھیلنا اتنا بڑا قدم اٹھانا کہ کسی کا کیریئر تباہ ہو جائے۔ یہ تو انتہائی سفاک اور کینہ پرور شخص کا کام ہے۔ کم از کم کالجوں اسکولوں کے کسی سربراہ کو اتنا ظالم اور تنگ نظر نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں تو کشادہ دل، کشادہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ذہن کے ساتھ اسٹوڈنٹ کے مسائل کو سمجھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ نکال باہر کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پرنسپل کو آپ سے کوئی سخت خارش ہے۔"

"پرنسپل کو نہیں سر امین کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے۔" جبران نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں سچ کہتا ہوں عالی انہیں مجھ سے بے پناہ نفرت ہے۔ بے تحاشا......"

"مگر کیوں، جبران بھائی کیوں...... آخر کوئی سبب تو ہوگا اس کا۔"

"کیا پتا جبران بھائی۔ انہیں نفرت نہ ہو، محض غصہ ہو۔" عالیہ نے کچھ سوچ کر کہا" اور شاید جب ان کا غصہ اتر جائے تو وہ آپ کی بات سن لیں۔ آپ ایک بار پھر ان سے بات کر کے دیکھیں۔"

"میں ان سے بات کروں گا عالی مگر مجھے کچھ زیادہ امید نہیں۔" جبران کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"پھر بھی جبران بھائی آپ کوشش تو کریں اور پریشان مت ہوں۔ پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا کریں اس وقت آرام سے سو جائیں تاکہ صبح سلیقے سے بات کر سکیں۔"

مگر جبران کو کسی کل چین نہیں تھا۔

وہ کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا، کبھی بے قرار ہو کر ٹہلنے لگتا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی۔

"سر مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ ایسی بے اندازہ اور شدید نفرت۔ آخر کیا بگاڑا ہے میں نے ان کا۔"

مگر کوئی نہیں تھا' جو اس کے سوال کا جواب دیتا۔ اس کا جواب تو صرف سر امین کے پاس تھا اور صرف وہی جانتے تھے کہ کیوں اس لڑکے کو دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھتا ہے۔ یہ خوش رو لڑکا جو اپنی حد درجہ ذہانت کے باوجود پہلے ہی دن سے ان کی نظروں میں اپنا مقام کھو بیٹھا تھا بلکہ وہ تو اس سے بن دیکھے ہی نفرت کرنے لگے تھے۔ اس دن سے جب انہوں نے پہلی بار اسے معین ملک کے مقابل دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی معین ملک پر کتنی محنت کی تھی۔ اسے پڑھانے میں دن رات ایک کر دیے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنا

سارا علم اسے گھول کر پلا دیں۔ معین خود بھی ٹیلنٹڈ تھا اور کچھ بڑے بھائی کی توجہ نے اسے نکھار ڈالا تھا۔ انہیں معین سے بڑی توقعات تھیں۔ مڈل کے امتحان میں تو انہیں یقین تھا کہ وہ بورڈ سے ٹاپ کرے گا' اس کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ مگر جب رزلٹ تیار ہو گیا اور انہوں نے اپنے سورسز سے پتا کروایا تو انہیں یہ جان کر شاک سا لگا کہ معین کی تو بورڈ میں کوئی پوزیشن نہیں ہے اور کوئی لڑکا جبران واسطی ٹاپ کر رہا ہے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی لڑکا معین سے زیادہ ذہین بھی ہو سکتا ہے اور اس سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ خود گئے اور معین کی پوزیشن دیکھی۔ معین نے خاصے اچھے نمبر لیے تھے مگر وہ بورڈ میں چوتھی پوزیشن پر تھا۔ انہوں نے جبران اور معین دونوں کے پرچے نکلوا کر دیکھے کہ کہیں معین کے ساتھ کوئی زیادتی بھی ہو سکتی ہے اور اس سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔ جبران واسطی واقعی بورڈ ٹاپ کرنے کا مستحق تھا مگر ایسی کوئی بات نہ تھی مگر معین صرف بیس نمبروں کی کمی پر فورتھ پوزیشن پر آ رہا تھا اور یہ بات پروفیسر امین کو کسی طرح منظور نہ تھی۔ انہوں نے اپنے سورسز چلائے۔ وہ ہر صورت میں معین کو ٹاپ کروانا چاہتے تھے مگر مجبوری یہ تھی کہ رزلٹ تیار ہو چکا تھا لسٹیں بن چکی تھیں۔ اب اگر معین ملک کو پہلی پوزیشن پر اور جبران واسطی کو دوسری پوزیشن پر لانے کیلئے نمبروں میں رد و بدل کیا جاتا تو دوسری اور تیسری پوزیشن پر آنے والے لڑکوں کے نمبروں میں بھی تبدیلی ضروری تھی اور اُن میں سے کسی منسٹر کا بیٹا تھا۔ اس لئے سب شش و پنج میں تھے اور رزلٹ نہیں بھیج رہے تھے کہ مشکل کا کیا حل ہو۔ پروفیسر امین ملک کو بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ وہ ایجوکیشن کے شعبے میں تھے اور ایک دوسرے سے کام پڑتا رہتا تھا۔ چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد معین ملک کو اکیس نمبر زیادہ دے کر پہلی پوزیشن لایا گیا اور جبران واسطی کے بیس نمبر کم ہو گئے جس سے وہ چوتھی پوزیشن پر پہنچ گیا۔ اس طرح دوسری اور تیسری پوزیشن لینے والے لڑکوں کے نمبروں میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی اور معین ملک نے پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ اب پروفیسر امین نے معین پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی اور پڑھائی کے اوقات بھی بڑھا دیے مگر اس کے باوجود میٹرک کے رزلٹ میں جبران واسطی کے نمبر زیادہ تھے اس بار معین دوسری پوزیشن پر تھا۔ پروفیسر امین حیران ضرور ہوئے مگر ان کے سورسز کام آ گئے چنانچہ معین پہلی پوزیشن پر آ گیا اور اب ایف ایس سی میں بھی نتیجہ وہی تھا۔ جبران ٹاپ کر گیا تھا اور معین نے دوسری پوزیشن لی تھی اور دونوں کے نمبر میں سات کا فرق تھا۔ اب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پروفیسر امین کے سورسز بھی کام نہ آئے کیوں کہ واسطہ ایک بہت ایمان دار اور با اصول شخص سے پڑ گیا تھا جو کسی صورت ایک نمبر بھی بڑھانے یا گھٹانے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ جبران اول آ گیا اور اس کا نام ایک خلش بن کر پروفیسر امین کے ذہن میں زندہ رہ گیا۔ انہیں خوامخواہ ہی اس لڑکے سے چڑ ہو گئی تھی جو انجانے میں ان کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ جب وہ واپس اپنے سامنے نظر آیا تو وہ اپنی دلی نفرت پر قابو نہ پا سکے اور ایک دم پھٹ پڑے۔ مگر جبران کو یہ سب کچھ معلوم نہ تھا وہ تو حیران تھا کہ سر امین کو آخر ہو کیا گیا ہے جو وہ ایک معمولی سی بات کا سہارا لے کر اس کے مستقبل سے کھیل رہے ہیں۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے جبران کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ عالیہ ناشتہ بنا کر لائی مگر جبران نے صرف چائے کا کپ لیا۔ عالیہ کے اصرار بھی اس نے کچھ نہ لیا۔

''نہیں عالیہ مجھے کچھ مت کہو۔ میرے حلق میں چائے بھی اٹک رہی ہے۔ زبردستی کچھ کھایا تو سب کچھ باہر نکل آئے گا۔'' عالیہ نے پھر اصرار نہ کیا اور خاموشی سے بھائی کو دیکھنے لگی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور آنکھیں سوج رہی تھیں۔

''جبران بھائی میں ابو جان کو بتاؤں۔'' عالیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی نہیں، خوامخواہ انہیں پریشانی ہو گی۔'' جبران نے بے چینی سے کہا۔ ''میں سر امین سے بات کر لوں پھر واپس آ کر خود انہیں بتاؤں گا۔''

''خدا کرے سر مان جائیں۔'' عالیہ نے متفکرانہ ہو کر کہا۔

''ہاں خدا کرے، بات سدھر جائے ورنہ۔''

آگے جبران سے کچھ نہ بولا گیا۔ چائے کا گھونٹ جیسے حلق میں پھنسنے لگا۔ اس کا چہرہ یوں زرد پڑ گیا، جیسے اس نے کوئی بہت بھیانک چیز دیکھ لی ہو۔ گھبرا کر اس نے کپ میز پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

''جبران بھائی یہ چائے تو پی لیں اور حوصلہ رکھیں خدا آپ کی مدد کرے گا۔''

''نہیں بس میں اب جاتا ہوں۔'' جبران نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''سر سے ملتا ہوں شاید......''

وہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر باہر نکل گیا حالانکہ عالیہ نے اسے بلایا بھی کہ ابھی تو بہت سویرے ہے اور اتنی صبح وہ وہاں جا کر کیا کرے گا۔ مگر جبران نے شاید سنا نہیں، وہ تیزی سے نکلتا چلا

گیا۔

عالیہ بہت پریشان تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ مارے پریشانی کے وہ اسکول بھی نہ گئی۔ امی نے پوچھا تو اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیا۔ مگر اس کا دل گھبرا رہا تھا کہ اگر سر نے جبران بھائی کو معاف نہ کیا تو کیا ہو گا۔ جبران بھائی تو اتنے حساس ہیں کہ وہ تو کسی صورت برداشت نہ کر سکیں گے۔ کہیں ان کی جان پر نہ بن جائے۔

وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومتی اور بے چین ہوتی رہی اور جبران سر امین کو ملنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا مگر سر امین ملک نے اس سے ملنے سے یکسر انکار کر دیا۔ وہ اپنے موقف پر سختی سے جمے ہوئے تھے کہ اگر جبران کو نہ نکالا گیا تو وہ ریزائن دے دیں گے۔ چنانچہ پرنسپل نے مجبور ہو کر جبران کو تین سال کے لئے آؤٹ کر دیا۔ جبران سکتے کے عالم میں پرنسپل کے سپاٹ چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

علی نے جبران کی حالت دیکھ کر کہا۔ ''یہ تو بہت زیادتی ہے جب کالج کے بہترین سٹوڈنٹ کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو پھر یہاں ہمارا مستقبل کیسے محفوظ ہو سکتا ہے۔ خدارا، کچھ سوچیں۔''

''آپ جا سکتے ہیں سوری۔'' پرنسپل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ تو علی جبران کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا۔ جبران کے کالج سے نکالے جانے کی خبر پل بھر میں سارے علاقے میں پھیل گئی اور لڑکے جبران کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ جبران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک ہو گیا ہے۔ اس کے اُڑے اُڑے ذہن میں کوئی بات نہیں ٹھہر رہی تھی اور اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، جیسے جسم کا بوجھ نہ سہار سکتے ہوں۔ اسے ڈولتا دیکھ کر علی اسے لڑکوں کے درمیان سے نکال لایا۔ وہ اسے پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ جبران کچھ سن نہیں رہا تھا اس کا تو دل چاہ رہا تھا کہ شہر کی کسی اونچی عمارت پر سے چھلانگ لگا دے یا چلتی ہوئی ٹرین کے سامنے سر رکھ دے یا پھر خواب آور گولیوں کی ایک بڑی مقدار پھانک لے۔ یا سر امین ملک کا گریبان پکڑ کر پوچھے۔

''سر! آپ نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا۔ یوں لخت لخت کرنے سے پہلے مجھے میرے جرم کا حساب تو بتایا ہوتا۔''

مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا، بس سر جھکائے علی، ایاز اور اسد کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے

ہونٹ سختی سے بھینچے تھے آنکھیں لال انگارا ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں پر قابو پانے کے لیے اپنی پوری قوت بروئے کار لا رہا تھا مگر گھر کی دہلیز پر پہنچتے ہی اس کا سارا حوصلہ جواب دے گیا اور ضبط کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ اس کے ہونٹوں سے ایک گہری آہ نکلی اور وہ گھر کی چوکھٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ ایاز گھبرا کر اس پر جھک گیا۔

”جبران...... جبران یار، ہوش میں آؤ۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے کم حوصلہ ہو۔ کم آن یار۔“ مگر جبران ہوش میں نہیں تھا جو انہیں بتاتا کہ وہ کم حوصلہ نہیں ہے، وہ موت کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر مسکرا سکتا ہے، وہ موت کی چوٹیوں کو فتح کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑا چیلنج قبول کر سکتا ہے۔ مگر دوسروں کی نظروں سے گر کر زندہ رہنا اور بغیر کسی قصور کے سزا پانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جو اپنے والدین کے سنہرے روپہلے خوابوں کو تعبیر دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہ جو پوری ایمانداری سے ایک روشن اور سنہرے مستقبل کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہا تھا۔ وہ جو دنیا کے لیے ایک خوبصورت، روشن مثال بننا چاہتا تھا۔ یک لخت اپنے خوابوں کی موت پر حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب کوئی سنہرا خواب نہیں تھا۔ گہرے تاریک، دور تک پھیلتے اندھیرے تھے جو تیزی سے اس کے سنہرے خوابوں کو نگل رہے تھے اور وہ سرامین جو اس سارے کرائسس کا سبب تھے۔ شاید اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اپنی فتح پر مسکرا رہے ہوں۔

علی ہولے ہولے جبران کے رخسار تھپکنے لگا۔

”جبران اٹھو بھئی۔ کیا کرتے ہو یار۔ اب اٹھ بھی جاؤ۔“

مگر جبران کی آنکھیں اور ہونٹ سختی سے بند تھے اور اس کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی۔ گھبرا کر ایاز نے دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔ دروازہ جبران کے ابو نے ہی کھولا۔ جبران کو زمین پر بے سدھ پڑا دیکھ کر وہ بدحواس سے باہر نکل آئے۔

”کیا ہوا اسے...... خیر تو ہے؟“

”سر......“ ایاز نے مودب ہو کر کہا۔

”جبران بے ہوش ہے۔ پہلے اسے اندر لے چلیں، تفصیل بعد میں......“

”مگر، خیر اچھا ٹھیک ہے چلو۔“ انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ ایاز، علی اور اسد اسے بازوؤں پر اٹھا کر اندر لائے اور احتیاط سے اسے بستر پر لٹا دیا۔ عثمان بھائی اسی وقت آئے تھے اور جوتے اتار دیے تھے، وہ گھبرا کر ننگے پاؤں دوڑے آئے۔

”یہ کیا ہوا۔ جبران کو کیا ہوا؟“

”صدمے سے بے ہوش ہے۔“ علی نے آہستہ سے بتایا۔

”کس چیز کا صدمہ؟“ عثمان نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”انہیں کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ تین سال کے لیے۔“

ابو جان کو دھکا سا لگا۔

”مگر کیوں؟ کیا کر دیا اس نے؟“ ان کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی مگر۔“ ایاز نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

عثمان کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر وہ مزید کوئی سوال کیے بغیر جبران کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر جب کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی تو وہ ڈاکٹر کو لانے کے لئے دوڑے۔

عالیہ نے انہیں پریشان باہر کی طرف لپکتے دیکھا تو گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے عثمان بھائی۔ آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟“

”کچھ نہیں۔ ہاں جبران کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ عجلت میں کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

”جبران بھائی۔“ عالیہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ ”تو انہیں کیا کالج سے نکال دیا گیا؟“

وہ تیزی سے ان کے کمرے کی طرف آئی مگر اندر ابو جان کے علاوہ جبران بھائی کے دوست بھی تھے۔ وہ ٹھٹک کر باہر ہی رک گئی اور کھڑکی سے جھانک جھانک کر جبران کو دیکھنے لگی جو بے حرکت بستر پر پڑا تھا۔

گھبرا کر وہ برآمدے میں آ گئی جہاں امی جان تخت پوش پر بیٹھی تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھ رہی تھیں۔

”امی جان۔ جبران بھائی، ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اندر کمرے میں وہ بے ہوش پڑے ہیں شاید۔“ عالیہ کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

امی جان کے ہاتھوں سے تسبیح گر پڑی۔

”الٰہی خیر...... خدایا، تو میرے بچوں کا حافظ و نگہبان ہو۔“ وہ بدحواس ہو کر اٹھنے لگیں تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گرتے گرتے بچیں۔

"کیا ہوا ہے جبران کو؟"

"پتا نہیں۔"

عالیہ کی سسکیاں امی جان کو بولائے دے رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ بجیا نے آکر انہیں سہارا دیا اور انہیں جبران کے کمرے تک چھوڑ کر واپس آئیں تو عالیہ ابھی تک رو رہی تھی۔

"یہ کیا نحوست ہے؟" بجیا نے اسے ڈانٹا۔ "بند کرو یہ رونا دھونا اور خدا سے خیر و سلامتی کی دعا مانگو اور یہ قصہ کیا ہے۔ جبران بھائی کو ہوا کیا؟"

عالیہ نے روتے روتے ساری بات بتا دی۔

"اور تم نے رات کیوں نہ بتایا۔" بجیا نے اسے گھورا۔

"اگر جبران نے منع بھی کیا تھا تو۔ خیر اب اٹھو نماز کا وقت ہے۔ وضو کرو اور خدا سے بہتری کی دعا مانگو۔"

بجیا خود فکر مند ہو گئی تھیں مگر اسے تسلی دے رہی تھیں۔

عالیہ خدا کے سامنے جھک گئی مگر اس کی آنکھیں بھری آ رہی تھیں۔

"خدایا، کیا ہو گا آخر، جبران کی تو زندگی تباہ ہو گئی۔"

عثمان بھائی ڈاکٹر کو لے آئے مگر ہزار ہا کوشش کے باوجود جبران ہوش میں نہ آسکا۔ ڈاکٹر نیازی کبھی جبران کی نبض پر ہاتھ رکھتے، کبھی پلکیں اٹھا کر آنکھوں کی پتلیاں دیکھتے اور پھر انجکشن گھونپ دیتے۔ مگر جبران پتھر کی طرح ساکت پڑا رہا۔ لاچار ہو کر انہوں نے عثمان بھائی سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ انہیں گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ آپ انہیں فوراً ہاسپٹل ایڈمٹ کریں۔ وہاں ڈاکٹرز کے باہمی مشورے سے انہیں بہتر ٹریٹمنٹ دیا جا سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب کوئی خطرے والی بات تو نہیں۔" ابو جان نے تشویش سے پوچھا۔

"جب تک انہیں ہوش نہ آئے، کیا کہا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نیازی خود بھی متفکر تھے۔

"آپ انہیں ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کریں بلکہ آپ کہیں تو میں خود ہی ایمبولینس کے لیے فون کر دوں۔"

"ضرور ڈاکٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی۔" عثمان نے ممنونیت سے کہا۔

ایاز، علی اور اسد ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر تک گئے، وہ جبران کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ عالیہ جو کمرے کے آس پاس ہی منڈلا رہی تھی، کمرے میں گھس آئی۔

"کیا جبران بھائی کو ہوش نہیں آیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

عثمان بھائی نے نفی میں سر ہلایا تو عالیہ کا چہرہ اتر گیا اور اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا جو اچانک بگولوں کی زد میں آ گیا ہو۔ اس نے بے سدھ پڑے جبران کو دیکھا۔ جس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا، جیسے جسم میں خون کی بوند تک نہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے جیسے دنیا کی زیادتیوں پر احتجاج کرتے کرتے تھک چکے ہوں اور خوبصورت سیاہ آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ اس بھدی، بدصورت دنیا کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا جہاں آدمی، آدمی کا گلا کاٹتے ہیں اور پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور اچانک پاؤں کے نیچے سے سیڑھی کھینچ لیتے ہیں۔ شاید وہ بہت خفا تھا اس دنیا سے، دنیا کے لوگوں سے اور اپنے آپ سے بھی۔ اسی لیے وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی صفائی، کوئی وضاحت پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

امی جان اس کے سرہانے اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ وہ ایک ٹک جبران کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

عالیہ کی نظر امی جان پر پڑی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ سسکیاں بھرتی باہر بھاگ آئی۔ جہاں بجیا اور آپی فق چہروں کے ساتھ پریشان کھڑی تھیں۔

عثمان بھائی نے باہر آکر انہیں دلاسا دیا اور بتایا کہ وہ جبران کو ہاسپٹل لے جا رہے ہیں تاکہ بہتر ٹریٹ منٹ دیا جا سکے اور یہ کہ وہ لوگ پریشان نہ ہوں، وقتی صدمہ ہے اور ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں۔

عثمان بھائی انہیں تسلی دے رہے تھے مگر خود بہت پریشان تھے۔ جبران جیسے حساس لڑکے کے لیے یہ حادثہ واقعی بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ سکتا تھا اور اسے مکمل طور پر تباہ کر سکتا تھا۔ جبران جن اذیتوں اور عذابوں سے گزر رہا تھا، عثمان بھائی کو اس کا احساس تھا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اس بحران سے کیسے نکالیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ابھی تو ویسے بھی وہ حواسوں میں نہ تھا۔ ایمبولینس آگئی تو جبران کو فوری طور پر ہاسپٹل منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نیازی کی وجہ سے اس پر خصوصی توجہ دی گئی۔ عثمان بھائی نے مختصر طور پر بے ہوشی کا سبب بتایا تا کہ ٹریٹ منٹ دینے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹرز کچھ دیر ڈسکس کرتے رہے پھر جبران کو ہوش میں لانے کی کوششوں میں لگ گئے۔ مگر جبران کی بے ہوشی طویل ہی ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر دس گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے بعد جبران نے پلکیں جھپکیں تو ڈاکٹرز کے چہرے چمک اٹھے۔ جبران نے آنکھیں کھولیں اور پل بھر یوں ہی خالی الذہنی کے عالم میں اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظریں ڈاکٹر نیازی پر پڑیں تو وہ چونکا، اگلے ہی لمحے جیسے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ ساری واردات جو اس پر گزری تھی اور وہ ساری اذیتیں جنہوں نے اسے یوں توڑ پھوڑ کر اپنے آپ سے بے گانہ کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گہرا کرب جھانکنے لگا۔ اس نے گہری مایوسی اور دل شکستگی کی حالت میں اپنے اردگرد کھڑے ڈاکٹروں کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ عثمان بھائی نے جو اس کی ساری کیفیتوں کو بغور دیکھ رہے تھے، اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"جبران میرے بھائی حوصلہ کیوں ہار رہے ہو۔ ہمت کرو۔" جبران نے آنکھیں نہیں کھولیں مگر اس کا دل بھر آیا۔

وہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں رونا نہیں چاہتا تھا مگر جی امڈ آیا تھا۔ دانت پر دانت جما کر اس نے قابو پانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اسے جن اذیتوں سے گزرنا پڑا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اس کا چہرہ کرب و اذیت سے سیاہ پڑنے لگا اور ہونٹوں کے کنارے سفید ہو گئے۔ اس کے دل پر عجیب سی کپکپی طاری ہو گئی پھر یہ کپکپاہٹ ہولے ہولے اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی اور اس کا پورا وجود جیسے انجانے زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ عثمان بھائی جو جبران کا ہاتھ تھامے اس کی ساری کیفیتوں کو رنج و اندوہ سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ہاتھوں کی کپکپی کو محسوس کر رہے تھے، گھبرا گئے۔ ڈاکٹر نیازی اسے ایک طرف ہٹا کر جبران کے لرزتے کانپتے جسم پر جھک گئے اور جبران ضبط کی کوشش کرتے کرتے غافل ہو گیا۔ اگلے چند دن جبران کی یہی کیفیت رہی۔ وہ ہوش میں آتا تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ پھر یہ لرزہ بڑھتے بڑھتے اتنا شدید ہو جاتا کہ اس کا جسم کئی کئی انچ بیڈ سے اوپر کی طرف اچھلتا۔ اسے ماہئ بے آب کی طرح تڑپتے دیکھ کر ڈاکٹر اسے اس اذیت سے نکالنے کے لیے نیند آور

ادویات دینے پر مجبور ہو جاتے۔ گھر والوں کی حالت ابتر تھی۔ امی جان تو مستقل جبران کے سرہانے بیٹھی بھیگی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے قرآنی دعائیں اور آیات پڑھ پڑھ کر پھونکتیں مگر آنسو تھے کہ امڈے آتے اور دل تھا کہ ڈوبا جاتا۔ ابو جان بظاہر حوصلے دار تھے مگر جوان بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بے بسی سے اترے اترے چہرے کے ساتھ کبھی ڈاکٹروں کے چہرے تکتے اور کبھی جبران کو دیکھنے لگتے جو زیادہ تر ادویات کے زیر اثر غشی کی حالت میں ہوتا۔ عثمان بھائی پریشان، متفکر سے کبھی گھر کا چکر لگاتے، کبھی ہاسپٹل کا۔ نہ ان سے جبران کی حالت دیکھی جاتی تھی اور نہ بہنوں کی جو رو رو کے بے حال ہو رہی تھیں۔ عالیہ تو جبران کی پریشانی میں خود بستر پر پڑ گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر روتی اور پرنسپل امین کو جی بھر کر کوستی۔

کالج سے دوست احباب، ملنے جلنے والے جبران کو دیکھنے کے لیے چلے آ رہے تھے، جو بھی سنتا، ہاسپٹل دوڑا آتا۔ جبران جیسے ذہین اسٹوڈنٹ کو اس حالت میں دیکھ کر ہر ایک افسردہ تھا۔ علی اور ایاز تو صاف صاف جبران کی حالت کا ذمے دار پروفیسر امین کو ٹھہرا رہے تھے۔ کالج کی فضا کشیدہ تھی۔ جبران کو بلاقصور کالج سے نکالنے پر لڑکے اسٹرائک کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک جبران کو کالج سے نکالنے کا فیصلہ واپس نہیں لے لیا جاتا، اس وقت تک نہ وہ خود پڑھیں گے نہ کسی کو پڑھنے دیں گے۔ لڑکوں کے اس ارادے کی سن گن پروفیسرز کو بھی مل گئی تھی۔ انہوں نے لڑکوں کو تسلی دلاسا دے کر وقتی طور پر سنبھال لیا تھا اور پروفیسر امین اور پرنسپل دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں اور جبران کی غلطی کو معاف کر دیا جائے۔

عثمان بھی پرنسپل سے ملا تھا مگر پرنسپل نے اس کی کوئی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جب عثمان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ جبران کا بھائی ہے تو پرنسپل نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"آپ تو اس کالج کے قابل فخر طالب علم رہے ہیں۔ بہت فرماں بردار، بے حد بریلینٹ اور ڈیسنٹ مجھے علم نہیں تھا کہ جبران آپ کا بھائی ہے۔"

"سر، جبران بھی کچھ کم ذہین نہیں۔ نہ ہی وہ ڈس اوبیڈینٹ ہے۔ آپ کو ضرور اس کے متعلق کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ اس کو ایک موقع دیں تو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں جبران کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔" انہوں نے سختی سے کہا۔

"سر" عثمان کے لہجے میں نرمی اور شائستگی تھی۔ "سر، اس طرح تو آپ جبران کے مستقبل سے ہی نہیں اس کی زندگی سے بھی کھیل رہے ہیں۔ آپ جس اعلیٰ مقام پر ہیں یہاں تو آپ کو معاف کر دینا ہی زیب دیتا ہے۔"

"میں نے کہا نا، مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں سننا" ان کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

"سر! آپ ایک لڑکے کی زندگی سے اس کے تین سال منہا کر رہے ہیں۔ زندگی کے تین طویل سال عمر کا ایک دور، اس عرصے میں وہ آگے بڑھ سکتا ہے، ترقی کر سکتا تھا، بہت کچھ پا سکتا تھا یا بہت کچھ پانے کے لیے جدوجہد کر سکتا تھا۔ مگر آپ نے اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں اور اسے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ حالانکہ آپ چاہتے تو محض سرزنش کر کے بھی چھوڑ سکتے تھے۔ سر ذرا سوچیں تو یہ تین سال اس کی پوری زندگی پر محیط ہو سکتے ہیں۔ اسے توڑ پھوڑ سکتے ہیں، اس کی شخصیت کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اسے تباہ ہونے سے بچائیں سر۔ اس نے غلطی کی ہے تو آپ ہی فراخ دلی سے کام لیں، معاف کر دیں اسے۔"

"سر! میں آپ سے بھی اور سر امین سے بھی معافی مانگنے کو تیار ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔" عثمان نے پر امید ہو کر کہا۔

"سوری آپ جا سکتے ہیں۔" پرنسپل نے رکھائی سے کہا۔

"سر، قلم آپ کے ہاتھ میں ہے فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف درخواست کر سکتا ہوں ویسے اگر آپ چاہتے تو اس سے بہتر بھی فیصلہ کر سکتے تھے۔"

عثمان افسردہ سا ہاسپٹل لوٹ آیا۔ امی جان نماز پڑھ رہی تھیں اور جبران نیم غنودہ سا آنکھیں کھولے جیسے کسی سوچ میں گم تھا۔ دنوں بعد اسے ہوش میں دیکھ کر عثمان کو پتہ اطمینان سا ہوا۔ اس نے پیار سے جبران کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" جبران نے آنکھیں پوری کھول کر عجیب یاسیت سے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

عثمان نے پیار سے کہا "دیکھو جبران آنکھیں بند کر لینا کسی مسئلے کا حل نہیں۔ تمہیں اسے فیس کرنا ہے اور پچھاڑنا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم اس اذیت سے تنہا گزر رہے ہو۔ نہیں ہم سب بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ حوصلے سے کام لو اور اپنے آپ کو سنبھالو۔"

جبران کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"عثمان بھائی مجھ سے مت کہیں، میری ساری ہمتیں جواب دے چکی ہیں۔"

"نہیں جبران، تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ ہماری خاطر اور خود اپنی خاطر۔" عثمان نے نرمی سے سمجھایا۔

"تم ہماری امید ہو۔ ہمارا خواب ہو۔ تمہیں بکھرنا نہیں چاہیے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا عثمان بھائی۔" جبران نے بے بسی سے کہا "میں کوشش تو کرتا ہوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی۔ مگر سارے دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔"

"تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو، بس یہ عہد کر لو کہ تمہیں ہم سب کی خاطر سنبھلنا ہے۔" عثمان نے سمجھایا۔

"تبھی تم اس ڈسٹربنس سے نکل سکو گے۔"

"عثمان بھائی کیا پرنسپل اپنا آرڈر واپس لے لیں گے؟" جبران نے پر امید ہو کر پوچھا۔

"امید تو ہے میں خود ان سے بات کروں گا۔" عثمان نے کہا "مگر تم ابھی یہ سب کچھ نہ سوچو۔ یہ سب ہم پر چھوڑ دو۔"

جبران خاموش ہو گیا مگر اس کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔

"نہیں نہ پرنسپل مانیں گے، نہ سر امین اف وہ تین سال اور میں بھلا کیا جی پاؤں گا۔ اور یہ عثمان بھائی یہ بہلا رہے ہیں مجھے، بچہ سمجھتے ہیں۔"

اس کی آنکھیں خوں رنگ ہونے لگیں اور کرب کے سائے چہرے پر پھیل گئے۔ ایک نامعلوم سی اذیت میں مبتلا وہ سر پٹخنے لگا۔

"حوصلہ کرو جبران تم تو اتنے بزدل نہ تھے۔" عثمان نے اسے دلاسا دینا چاہا مگر وہ چلا اٹھا۔

"نہیں ہے، مجھ میں حوصلہ عثمان بھائی۔ چھوڑ دیں مجھے میرے حال پر۔" وہ اور زور زور سے پلنگ کی پٹی پر سر پٹخنے لگا۔

عثمان نے کچھ کہنا چاہا مگر دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"یس کم ان۔" اس نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے جبران کے ہاتھ تھام لیں۔" پاگل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے ہو کیا کر رہے ہو، ہوش میں آؤ۔" عثمان نے ڈانٹا۔

"ہاں، میں پاگل ہو گیا ہوں، دماغ ٹھیک نہیں ہے میرا۔ چھوڑ دیں مجھے اکیلا بس۔"

جبران کی آنکھوں میں عجیب وحشت سی سا گئی تھی اور وہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ عثمان نے قدموں کی آواز پر دیکھا، سر حسن اور سر نذیر اس کے قریب کھڑے تھے۔

"السلام علیکم سر!" اس نے جبران کے ہاتھ تھامے تھامے کہا۔

"کیا حال ہے اب؟" سر حسن نے آہستہ سے پوچھا۔

"دیکھ لیجیے کچھ خاص امپروومنٹ نہیں۔" عثمان نے افسردگی سے کہا۔ پھر وہ جبران پر جھک گیا۔ "جبران ہوش میں آؤ دیکھو سر حسن آئے ہیں تمہیں دیکھنے اور سر نذیر بھی۔"

بے چینی سے سر پٹختا جبران ساکت ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "کیسے ہو جبران؟" سر نذیر نے پوچھا۔

"سر۔" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "سر میں تباہ ہو گیا، ختم ہو گیا میں......"

"مت کہو ایسا۔" سر حسن نے نرمی سے اس کے شانے تھپکے۔ "خدا نہ کرے کہ تم تباہ ہو۔"

"مگر میں تباہ ہو گیا سر! آئی ایم ڈیڈ۔"

جبران کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ سر حسن نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور اسے تسلی دینے لگے۔ روتے روتے جبران کی ہچکی بندھ گئی۔ امی جان وظیفہ ادھورا چھوڑ کر دوڑی چلی آئیں۔ جبران کی حالت دیکھ کر خود ان کے رخسار آنسوؤں سے تر ہونے لگے۔ جبران روتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔

"آئی ایم ڈیڈ سر...... آئی ایم ڈیڈ۔"

پھر یک لخت اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے اور وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔ عثمان ڈاکٹر کو بلانے باہر دوڑا اور تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر نیازی کو لیے واپس آیا۔ ڈاکٹر نیازی جبران کی نبض دیکھنے لگے۔ جبران کا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید پڑ رہا تھا اور بے ہوشی کی حالت میں بھی جسم پر ہلکی ہلکی سی کپکپاہٹ طاری تھی۔ ڈاکٹر نیازی نے انجکشن لگایا۔ چند منٹ بعد ہی جبران کے چہرے کی رنگت بحال ہونے لگی اور سانس اعتدال پر آ گیا۔

ڈاکٹر نیازی نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"یہاں اردگرد شور مت کریں اور پیشنٹ کو سونے دیں۔ اس قسم کی ذہنی ڈسٹربینس میں سکون بھری نیند بہت ضروری ہے۔" انہوں نے نصیحت کی۔

"ڈاکٹر صاحب کوئی خطرے کی تو بات نہیں۔ یہ تشنج کا سا دورہ اسے پہلی بار پڑا ہے۔" عثمان نے تشویش سے پوچھا۔

"تشنج نہیں، شدید صدمہ اور صدمہ جتنا شدید ہو، اسے زائل ہونے میں بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے۔"

ڈاکٹر نیازی جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو پروفیسر حسن اور پروفیسر نذیر بھی کھڑے ہو گئے اور چلتے چلتے ڈاکٹر نیازی رکے۔

"یہ جبران غالباً آپ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ سوچ لیجیے اسے کچھ ہو گیا تو حرف آپ پر بھی آئے گا۔" انہوں نے تیکھی نظروں سے پروفیسر حسن کو دیکھا۔

"جی ہم تو خود متاسف ہیں اور پرنسپل کے اقدام کو درست نہیں سمجھ رہے مگر کیا کر سکتے ہیں، دعا کرنے کے سوا۔" پروفیسر حسن جو جبران کی حالت پر واقعی افسردہ تھے، آہستہ سے بولے۔

"کیوں...... پروفیسر امین آپ کے کولیگ ہیں آپ مجبور کر سکتے ہیں انہیں، دباؤ ڈال سکتے ہیں ان پر، بہت کچھ کر سکتے ہیں آپ۔"

"ہم کوشش تو کر رہے ہیں، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" پروفیسر نذیر نے کہا۔

"خدا آپ کو کامیاب کرے۔" ڈاکٹر نیازی کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

"ڈاکٹر نیازی ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔" پروفیسر نذیر نے کہا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔" پروفیسر حسن پرخیال انداز میں کچھ سوچ کر رہ گئے۔ اگلے دن جب سٹاف روم میں کچھ سیاسی صورت حال پر بحث ہو رہی تھی تو اچانک پروفیسر حسن نے پروفیسر امین کو مخاطب کیا۔

"امین صاحب میرا خیال ہے کیا نام ہے، اس لڑکے کا ہاں جبران وہ بہت سزا بھگت چکا۔ اب اسے معافی مل جانی چاہیے۔"

پروفیسر امین ان کے اس اچانک حملے پر ششدر سے ان کا منہ تکنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں واقعی۔" پروفیسر نذیر نے تائید کی۔

"اگر اس نے غلطی کی بھی تو اسے کافی سزا مل چکی ہے اب اسے معاف کر دیں۔ ایسے ہونہار بچے تو قوم کا اثاثہ ہیں۔ یہ اثاثہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس بچے کو دیکھنے گیا تھا اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔" پروفیسر نے افسوس سے کہا۔

"آپ کا خیال ہے، میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہے۔" پروفیسر امین کے لہجے میں ترشی تھی۔

"نہیں ہمارا یہ خیال نہیں مگر بڑوں کی شان تو معاف کر دینا ہے، انتقام لینا نہیں۔" پروفیسر حسن نے کہا۔

"آپ سب لوگوں کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ میں پرنسپل سے بات کروں گا۔" پروفیسر امین نے گہری سانس لی۔

یوں بھی کالج کی کشیدہ فضا اور پروفیسروں کے بدلے بدلے رویے سے وہ بد دل ہو رہے تھے۔

"اس میں آپ کی سبکی نہیں، امین صاحب! بڑا پن ہے، عظمت ہے۔ آپ کی اس اعلیٰ ظرفی سے آپ کا احترام بڑھے گا۔ لوگ آپ کی پہلے سے زیادہ عزت کریں گے۔" پروفیسر نذیر نے کہا۔

"اور وہ لڑکا جبران اس قدر حساس ہے کہ اگر اسے واپس نہ لیا گیا تو شاید وہ ذہنی مریض بن جائے، یا ہو سکتا ہے جان سے ہی گزر جائے اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو گئی تو لوگ ہمیں بھی بخشیں گے نہیں۔" پروفیسر حسن نے کہا۔

میں نے کہا نا، میں پرنسپل سے بات کروں گا۔" پروفیسر امین نے آہستہ سے کہا۔

"مگر ہم آپ کو بھی کھونا نہیں چاہتے۔ اس ادارے کو آپ جیسے صاحب علم کی بہت ضرورت ہے۔ آپ کو وعدہ کرنا ہو گا کہ آپ ریزائن نہیں دیں گے۔" ڈاکٹر حسن نے کہا

پروفیسر امین انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ وہ خود بھی ریزائن نہیں دینا چاہتے تھے وقتی طور پر اشتعال میں آ کر انہوں نے ایک بڑا اقدام اٹھا لیا تھا مگر اب لوگوں کی نظروں میں اپنے لیے نفرت اور برہمی دیکھ کر وہ حوصلہ ہار رہے تھے۔ نہیں، انتقام یوں نہیں لیے جاتے کھلم کھلا۔ لوگوں کی نفرتیں مول لے کر، انتقام تو ایسا ہونا چاہیے کہ کسی دوسرے کو پتا نہ چلے ایک ہاتھ

سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ پروفیسر امین نے بہت سوچ سمجھ کر بظاہر اپنے کولیگز کی خاطر جبران کو معاف کر دیا اور پرنسپل نے اپنا آرڈر واپس لے لیا۔ ہاسپٹل میں یہ خبر علی اور ایاز نے پہنچائی۔ امی جان تو فوراً سجدے میں گر پڑیں۔ عثمان کو بھی اطمینان سا محسوس ہوا۔ اس کا جی تو بھی چاہ رہا تھا کہ فوراً جبران کو جگا کر یہ خوش خبری سنائے مگر ڈاکٹر نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ جب تک وہ خود نہ جاگے، اسے نہ جگایا جائے۔

جب جبران بیدار ہوا اور عثمان نے اسے بتایا کہ پرنسپل نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے تو جبران پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ اس دن دیر تک باتیں کرتا رہا اور پھر باتیں کرتا کرتا سو گیا۔

ڈاکٹر نیازی کے خیال میں ٹرنکلائزر کے بغیر سو جانا ایک امید افزا بات تھی۔ اب رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہونے لگی۔ اب تو اس پر بے ہوشی طاری ہوتی نہ لرزے کا کوئی دورہ پڑتا۔ ہاں، باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے اور وہ ساری اذیتیں اسے یاد آ جاتیں جن سے وہ گزرا تھا۔ جلد ہی اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اب بظاہر وہ بالکل ٹھیک تھا اور ڈاکٹروں نے بالکل فٹ قرار دیا تھا۔ مگر گھر آ کر وہ گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

سارا دن بستر پر پڑا جانے کیا سوچا کرتا۔ امی جان اور ابا جان نے کئی بار کہا کہ اب وہ کالج جانا شروع کر دے، اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ عثمان بھائی نے بھی سمجھایا مگر جبران نے بے دلی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں عثمان بھائی میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟ پاگل ہوئے ہو؟ اس پڑھائی کی خاطر تم نے اپنی جان پر بنا لی تھی اور اب اسی سے بےزار ہو؟"

"ہاں کیا فائدہ اس پڑھائی کا۔" اس نے اداسی سے سوچا۔

"اتنا پڑھ لکھ کر سر امین مجھے نہ سمجھ سکے۔ میری تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے مجھ سے بدلہ لے لیا۔ مجھے ختم کر دیا۔ کیا ہوتا اگر وہ ذرا سی اعلیٰ ظرفی سے کام لیتے اور نرمی سے سمجھا دیتے۔ مگر مجھے مٹا کر شاید ان کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہوئی ہے۔"

عثمان بار بار جبران کو سمجھاتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جبران، میرے بھائی، مانا کہ تم ایک بڑے بحران سے گزرے ہو مگر وہ بحران گزر گیا۔ اب تم خدا کا شکر ادا کرو اور اپنے آپ میں لوٹ آؤ۔ دیکھو امی جان تمہارے لیے کتنی پریشان ہیں۔ اب حوصلہ پکڑو اپنے آپ کو سنبھالو۔ سب کچھ بھول کر نئے سرے سے پڑھائی میں جت جاؤ۔ ہمیں تم سے بڑی توقعات ہیں، بڑی امیدیں ہیں اور ہم نے تمہارے حوالے سے بڑے خواب دیکھے ہیں۔"

مگر جبران خاموش بیٹھا سر جھکائے سوچتا رہا۔

"ہاں مگر وہ سب امیدیں جل کر راکھ ہوئیں اور وہ سارے خواب میری آنکھوں میں ہی جل مرے۔ اب مجھے اس چھچھوری، جھوٹی، ہرجائی دنیا سے کوئی توقع نہیں۔"

اس کی خوبصورت آنکھوں میں دور تک اندھیرے ہوتے' جیسے اب اسے دنیا کی کسی اچھائی پر اعتماد نہ رہا ہو۔ جیسے ہر طرف خوبصورتیوں کا خاتمہ ہو چکا ہو۔ جیسے اس دنیا کے کسی گوشے میں کوئی چیز بھی ایسی نہ رہی ہو' جس کی خاطر جیا جا سکے۔

"دیکھو بھائی! زندگی ایسی چیز نہیں کہ اسے معمولی سی بات پر مایوسیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ زندگی میں بڑے بڑے نشیب و فراز آتے ہیں۔ انسان کو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے جو بات آج تمہیں بہت اہم لگ رہی ہو، کل اتنی اہم نہ لگے اور ہوا بھی کیا ہے آخر۔ تمہیں یہی دکھ ہے نا کہ لوگوں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم ایسے نہیں ہو جیسا سر امین نے سمجھا تو میرے پیارے بھائی، لوگوں کے پاس کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جس سے وہ دلوں کا حال جان سکیں اور ہر ایک کے پاس وہ نظر نہیں ہوتی' جو ہیرے اور پتھر میں فرق کر سکے۔ پھر کیا ہیرے کی قدر و قیمت میں فرق آ جاتا ہے؟"

عثمان بھائی ہولے ہولے نرمی اور محبت کے ساتھ اسے سمجھاتے۔ وہ اسے گہری یاسیت کے سمندر سے نکال کر پھر زندگی کی طرف لانا چاہتے تھے۔

مگر جبران کی اداس آنکھوں میں شکوے سے مچلتے رہتے۔

"تو نظروں سے گر جانا معمولی بات ہے کیا۔ انہوں نے مجھے اِل مینرڈ اور گستاخ سمجھا۔ حالانکہ میں دل سے اساتذہ کی عزت کرتا ہوں پھر بھی۔"

عثمان بھائی اس کے دکھ کو سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں۔ مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ جبران اس دکھ کو حرزِ جاں بنا کر اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدم روک لے

اور ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں گھر جائے۔ وہ اسے اس مقام پر دیکھنا چاہتے تھے' جو اس جیسے کسی ذہین باصلاحیت لڑکے کا مقدر ہونا چاہیے۔ مگر کتنے خواب ہیں جو پورے ہوتے ہیں اور کتنی امیدیں ہیں جو تکمیل کے مراحل سے گزرتی ہیں۔ حالانکہ عثمان بھائی کا اپنا دل غم کی دھیمی دھیمی آنچ میں پگھل رہا ہوتا مگر وہ اس کی آنکھوں کے شکوے کو یکسر نظرانداز کر دیتے۔

"آخر اب تمہیں کیا دکھ ہے؟" ان کے لہجے میں ہلکی سی ترشی آ جاتی۔ "ایک سانحہ تھا' جو گزر چکا۔ پرنسپل نے اپنا آرڈر واپس لے لیا۔ اب تم بھی گزری ہوئی باتوں کو بھول جاؤ۔ کوئی تمہیں اچھا سمجھتا ہے یا برا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم جیسے ہو۔ ویسے ہی رہو گے۔ اب کیا لوگوں کی خاطر تم اپنے والدین کی توقعات خاک میں ملا دو گے؟"

پھر ان کا لہجہ نرم ہو جاتا۔

"دیکھو اتنے بڑے بڑے طوفان آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ تم بھی یہی سمجھو کہ ایک طوفان میں سے گزرے ہو مگر اب فضا پرسکون ہے۔ طوفان ختم ہو چکا۔ پھر کیا تم اسی غم میں مبتلا رہو گے کہ طوفان کیوں آیا تھا؟"

"اور جب طوفان آتا ہے تو بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔" جبران جوتے کی نوک زمین میں چبھوتے ہوئے سوچتا۔ "میں بھی وہ درخت ہوں جو اپنی جڑوں سے اکھڑ چکا ہے۔ اب اسے دوبارہ زمین میں لگانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ اب مجھے کسی بہار کا انتظار نہیں۔"

اور جبران کی آنکھوں میں دم بدم ٹھہرے ہوئے اندھیروں کو دیکھ کر عثمان بھائی سر تھام لیتے۔

"خدایا، میں اس لڑکے کو کیسے واپس لاؤں۔ یہ جو خاندان کا فخر ہے اور اب خاک میں مل رہا ہے۔"

عثمان بھائی گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیتے۔

"جبران میرے بھائی تم کوشش کیوں نہیں کرتے واپس لوٹنے کی۔ جس آگ میں تم جلے ہو، اس سے ہم بے خبر نہیں، اس کی آنچ ہمارے دلوں تک بھی پہنچی ہے۔ دیکھو سونا آگ میں جل کر کندن بنتا ہے تمہیں بھی کندن بننا ہے۔ تم ہمارا، ہمارا سرمایہ افتخار ہو۔ اپنے آپ کو ضائع مت کرو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تو ابھی مجھے اور جلائیے۔ ڈال دیجئے مجھے کسی تپتی بھٹی میں۔ میں ابھی کندن نہیں بنا۔"

اس کے خاموش لب احتجاج کرتے۔

اور اسے یوں خاموش خاموش اپنے آپ سے روٹھا اور ساری دنیا سے خفا دیکھ کر عثمان کو اس پر پیار آ جاتا، اور وہ اس کے گلے میں بازو ڈال دیتا۔

"جبران میرے بھائی۔ تمہیں ہم سب کی خاطر واپس لوٹنا ہوگا۔ دیکھو، تم اس ایک شخص سرائمن کی وجہ سے ہم سب کو سزا دو گے۔ مجھے اور امی جان کو اور ابو جان کو۔" انہوں نے سمجھایا۔

"عثمان بھائی!" جبران نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"میں کیا کروں عثمان بھائی میں وہاں کسی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ مجھ میں کسی کو فیس کرنے کی ہمت نہیں۔"

جبران کے لہجے میں اتنی بے بسی اور لاچاری تھی کہ عثمان بھائی تڑپ اٹھے۔

"کیوں؟ کیوں تم کسی کو فیس نہیں کر سکتے۔ تم نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے۔ کس بات پر تم شرمندہ ہو بلکہ تم تو سرخرو ہو کہ انہوں نے خود اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ یاد رکھو کہ اگر آج تم دوسروں کو فیس کرنے کی ہمت پیدا نہ کر سکے تو زندگی کے ہر مقام پر پیچھے رہو گے اور کبھی کسی سے نظر ملا کر بات نہ کر سکو گے۔"

***

عثمان بھائی صحیح کہہ رہے تھے۔ جبران تا دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اُٹھا کر عثمان کو دیکھا۔

"عثمان بھائی...... میں دنیا کو فیس نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں' زندگی کے بارے میں یہ کوئی صحت مند رویہ نہیں۔ میں اس رویے کے خلاف اپنے آپ سے لڑ بھی رہا ہوں مگر دل ہر چیز سے اُکتا چکا ہے اور مجھے ہر چیز بے کار اور فضول لگنے لگی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک کونے میں پڑا رہوں یا دنیا کی وسعتوں میں کہیں گم ہو جاؤں۔"

"اور تم خود تسلیم کر رہے ہو کہ یہ کوئی صحت مند رویہ نہیں۔ تمہیں اس رویے کو شکست دینی ہے جبران۔ تمہیں اس کے خلاف لڑنا ہے، اپنی پوری توانائیوں اور حوصلے کے ساتھ۔"

"میں کوشش کروں گا عثمان بھائی۔" جبران نے سر جھکا کر کہا "مگر میں یہاں اس کالج میں ان کی نظروں کا سامنا نہیں کر سکتا۔ آپ میری مائیگریشن کروا دیں۔ کسی اور کالج میں کسی اور شہر میں جہاں میں اپنے آپ کو یک جا کر سکوں۔"

اس تمام عرصے میں پہلی بار جبران نے کوئی امید افزا بات کہی تھی۔

عثمان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"ٹھیک ہے تم جہاں کہو اور جس طرح بھی یکسوئی حاصل کر سکو۔ میں جلد سے جلد تمہاری مائیگریشن کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی اپنا ذہن سیٹ کرنے کی کوشش کرو۔"

جبران نے وعدہ کیا کہ وہ پوری کوشش کرے گا۔

اگلی صبح وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا۔

"میں ان سب کو فیس کر سکتا ہوں' مجھے ان سب کو فیس کرنا ہے۔"

اس نے بمشکل اپنی بکھری ہوئی خود اعتمادی کو سمیٹا۔ کھوئی ہوئی قوت ارادی کو یکجا کیا او

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کالج جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

عثمان بھائی نے اسے فائل اٹھائے ناشتے کی میز پر دیکھا تو انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

''کہیں جا رہے ہو کیا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں کالج۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اسے زندگی کی طرف لوٹتے دیکھ کر عثمان بھائی کی آنکھیں فرطِ مسرت سے بھر آئیں۔

''خدایا، میرے بھائی کو ہمیشہ سر بلند رکھنا اور اسے زندگی کی ساری مسرتوں سے نوازنا۔'' انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی اور اپنی نم آنکھیں چھپانے کے لیے چائے کے کپ پر جھک گئے۔

جبران کچھ مضطرب سا چائے کا آدھا کپ پی کر اٹھ گیا۔

''کیوں ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟'' عثمان بھائی نے پوچھا۔ ''یہ سلائس لے لو یا یہ بوائل ایگ، خالی پیٹ مت جاؤ۔''

''کچھ جی نہیں چاہ رہا عثمان بھائی، وہاں کینٹین سے کچھ کھا لوں گا۔'' جبران نے بے دلی سے کہا۔

''جبران۔'' عثمان بھائی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ مت ہارنا میرے بھائی۔ یقین رکھو، لوگوں کے پاس اتنا وقت اور اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے رہیں، یہ صرف اپنے احساسات ہوتے ہیں جو انہیں شکست سے دوچار کرتے ہیں۔''

''فکر مت کریں عثمان بھائی۔'' اس نے عثمان بھائی کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں جانتا ہوں، مجھے اپنی جنگ خود ہی لڑنی ہے اور میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔'' اس کے لہجے میں ارادے کی پختگی دیکھ کر عثمان بھائی کو بہت اطمینان محسوس ہوا۔

مگر کالج میں آ کر اس کی خود اعتمادی ختم ہونے لگی۔ ہر آنکھ اور ہر چہرہ اسے اپنا تمسخر اڑاتا ہوا محسوس ہوتا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس کے دوست، کلاس فیلوز اسے دوبارہ اپنے درمیان پا کر بہت خوش تھے اور اپنی پرخلوص محبت کا اظہار کر رہے تھے۔

''یار تمہارے بغیر تو کالج ویران ہو کر رہ گیا تھا۔'' ایاز نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''واقعی کالج لائف بے رونق اور ڈل ہو گئی تھی۔'' علی نے تائید کی۔

غرض سب نے ہی کچھ نہ کچھ کہا مگر اس نے اس ساری گرم جوشی کا کوئی خاص اثر نہ لیا۔

کلاس میں بھی وہ خاموش سر جھکائے، لاتعلق سا بیٹھا رہا۔ پروفیسر امین کے پیریڈ میں تو اس کا اضطراب حد سے بڑھ گیا تھا مگر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پروفیسر امین ملک نے کئی بار اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ بہت کھویا کھویا سا اور مضطرب تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھاتا اور اپنے آپ سے لڑتا وہ بہت قابلِ رحم لگ رہا تھا۔

''رول نمبر 1۔ آر یو ہیر؟''

اچانک نیوٹن کے ذراتی نظریے پر لیکچر دیتے دیتے پروفیسر امین نے اسے مخاطب کیا۔

''یس...... یس سر!' وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''تو پھر نیوٹن کے ذراتی نظریے اور ہائگنز کے روشنی کے نظریہ تموج کا بنیادی فرق واضح کریں؟''

''سر۔''

جبران کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی اپنی پوری اسٹوڈنٹ لائف میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ یوں گھبرایا تھا۔ وہ جواب دینا چاہتا تھا مگر کسی خوف کے زیرِ اثر اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے لگا جیسے اس نے جواب دیا تو کوئی بہت بڑا سانحہ رونما ہو جائے گا۔ پہلے سے بھی کہیں بڑا۔

''سر۔سر۔''

وہ جو بہترین ڈیبیٹر تھا اور اپنی بے پناہ ذہانت سے اکثر اساتذہ کو بھی لاجواب کر دیا کرتا تھا، کسی غبی، کند ذہن، نااہل بچے کی طرح ہکلا رہا تھا۔

''سر آئی ڈونٹ نو۔'' اس نے پزل ہو کر کہا۔

پروفیسر امین زیرِ لب مسکرائے۔ جیسے اس کی بے بسی سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ جبران پسینہ پونچھتا بیٹھ گیا۔ مگر اس کی آنکھیں پروفیسر امین کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ چکی تھیں۔ کسی اندرونی خوشی کا تاثر، ہنستی آنکھیں، مسکراتے لب۔''

کاش، کاش میں اس بے جواز نفرت کا سبب جان سکتا۔ جبران نے اداسی سے سوچا۔

عثمان بھائی کو کسی اشد ضروری کام کے لیے ملتان جانا پڑا۔ اس لیے مائی گریشن کا کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الٹوا میں پڑ گیا۔ جبران خود بھی مائی گریشن کے لیے پرنسپل سے مل سکتا تھا۔ مگر وہ ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے عثمان کا انتظار تھا۔ کلاسیں وہ باقاعدگی سے اٹینڈ کر رہا تھا مگر خاموشی اور بے دلی کے ساتھ۔ پروفیسرز کو بھی اس کی خاموشی کھل رہی تھی۔ اس کی پُر معنی اور پُر مغز گفتگو اور ہلکے پھلکے جملے جو لیکچر کو پُر لطف بنا دیتے تھے، کہیں کھو گئے تھے۔ طلباء کو بھی لیکچر بے رنگ اور بے جان محسوس ہوتے اور وہ بوریت محسوس کرنے لگے تھے۔

پروفیسر نذیر نے کئی بار اسے چھیڑا۔

"بھئی کیا گونگے کا گڑ کھا کر آئے ہو؟"

"کیا بات ہے، آج بڑی خاموشی ہے۔"

"بولتے رہا کرو بھئی۔ کہیں اندر زنگ نہ لگ جائے۔"

مگر پروفیسر امین نے اس کی زبان کاٹ لی تھی اور وہ بولنے کا فن بھول چکا تھا۔

جب صدا کے راستے بے سبب کاٹے جائیں تو زبان پر ایسی ہی خاموشی چھا جاتی ہے۔

پروفیسر حسن لیکچر کے بعد حسبِ معمول پوچھتے۔

"کوئی سوال......کوئی الجھن؟"

وہ بطورِ خاص اس کی طرف دیکھتے مگر وہ سر جھکائے فائل کے اوراق الٹاتا رہتا۔

"اس لڑکے کی شخصیت مسخ ہو گئی ہے اور یہ اپنا آپ گم کر بیٹھا ہے۔" وہ افسوس کرتے مگر کچھ نہ پاتے۔

انہی دنوں جب وہ اپنے آپ میں لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا، کالج میں دبا دبا سا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ایم اے او کالج بڑے مشاعرے کا اہتمام کر رہا تھا۔ انہیں بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مشاعرہ فی البدیہہ تھا۔ پروفیسر نذیر نے اسے بلا کر مشاعرے میں شرکت کے لیے کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔

"کیوں؟" پروفیسر نذیر نے اسے بغور دیکھا۔ "تمہیں شریک ہونا پڑے گا لڑکے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے کالج کی طرف سے کچھ اور لڑکے بھی شرکت کریں گے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کالج میں تم جیسا باصلاحیت لڑکا کوئی اور نہیں۔" انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"مگر میں اپنی ساری صلاحیتیں کھو بیٹھا ہوں۔" اس نے پست لہجے میں کہا۔ "سوری سر

میں مجبور ہوں۔"

مگر پرنسپل نے اسے بلا کر حکمیہ کہا کہ اسے ہر قیمت پر کالج کے وقار کی خاطر مشاعرے میں شریک ہونا ہے۔

"مگر کیسے؟" اس نے بے بسی سے نظریں اٹھائیں۔

"میری تو زبان کٹی ہے، ہاتھ بندھے ہیں مگر کوئی میری مجبوری سمجھ نہیں رہا۔ اس خون ٹپکتی گونگی زبان کے ساتھ میں کیسے اپنی جادو بیانی دکھاؤں۔"

"سر" اس نے لاچاری سے کہا۔ "میرے ہتھیار کند پڑ گئے ہیں۔ اور میرا جادو اپنا اثر کھو بیٹھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اسٹیج پر آ گیا تو کالج کا وقار بڑھنے کے بجائے بہت گھٹ جائے گا۔ اور پھر سر یوں بھی میں جا رہا ہوں کالج سے۔ پلیز مجھے معاف کریں۔" وہ سر جھکائے باہر نکل آیا۔

پرنسپل کو اس اتنے ہونہار لڑکے کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے پاس کھڑے پروفیسر حسن سے کہا۔

"پروفیسر حسن، کسی طرح اس کو روکیے۔ یہ ہمارے کالج کا فخر ہے اگر یہ چلا گیا تو کالج ایک بڑے خسارے سے دوچار ہو گا۔ ایسے ہونہار لڑکے کہیں صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔"

ایاز پرنسپل کے دفتر کے باہر اندر کی باتوں پر کان لگائے کھڑا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"یار یہ تم کہاں جانے کی بات کر رہے تھے؟"

"کسی ایسی دنیا میں جہاں لوگوں کے رویے پارہ پارہ نہ کرتے ہوں۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"تم کالج چھوڑ رہے ہو؟" ایاز نے پوچھا۔

"ہاں، میرے لیے مزید یہاں رہنا ممکن نہیں۔" جبران نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کے مائیگریشن کی خبر سارے کالج میں گردش کر رہی تھی۔

"کچھ سنا تم نے جبران جا رہا ہے۔"

ہر ایک دوسرے کو بتا رہا تھا یا تصدیق چاہ رہا تھا۔

پروفیسر امین کو جبران کے جانے کا جب علم ہوا تو وہ کچھ چپ سے ہو گئے۔ ایسا تو وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس کی شکست و ریخت کا سارا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے نروس انداز اور اعتماد سے عاری گفتگو ان کے لیے طمانیت کا باعث تھی۔ انہیں احساس تھا کہ وہ کم حوصلہ نہیں صرف صدمے کی عارضی کیفیت سے دوچار ہے اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہے اور انہیں کچھ شبہ سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ سنبھل گیا تو اس خاک سے ایک ایسا جبران جنم لے گا جو پہلے سے زیادہ با اعتماد مضبوط اور ناقابل شکست ہوگا۔ اسی لیے وہ سوچ میں پڑ گئے۔

عثمان بھائی ابھی تک نہیں لوٹے تھے' اس لیے جبران نے خود ہی مائیگریشن کے کاغذات تیار کروائے اور ان پر سائن کروانے کے لیے پرنسپل کے آفس گیا۔ مگر پرنسپل کسی ضروری کام سے گھر چلے گئے تھے۔ وہ واپس لوٹ رہا تھا کہ چپڑاسی نے اسے پروفیسر امین کا پیغام دیا کہ وہ اسے اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ اسے قدرے حیرت ہوئی مگر پھر کچھ سوچ کر وہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ نے بلایا ہے سر؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بلایا تو ہے آؤ بیٹھو۔" ان کا لہجہ نارمل تھا۔

"وہ شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

"سنا ہے تم جا رہے ہو؟" ان کی نظریں سوالیہ تھیں۔

"یس سر!" جبران نے سر جھکا لیا۔

"کیوں؟"

"کیا کہوں سر کیوں؟"

اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں میں اذیتوں کے سارے رنگ اتر آئے۔ جب زخم لگانے والے ہی زخموں کا سبب پوچھیں تو آدمی کیا کہے۔

اذیتوں کے تمام نشتر
مری رگوں میں اتار کر وہ
بڑی محبت سے پوچھتا ہے
تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے

"اگر تم میری وجہ سے جا رہے ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے۔" انہوں نے لفظوں کو چبا چبا کر کہا۔

"میں تمہارا دشمن نہیں میرے عزیز۔ استاد اتنے کم ظرف نہیں ہوتے کہ اپنے شاگردوں کے خلاف دلوں میں بغض رکھیں اور دشمنیاں پالتے رہیں۔"

"ہاں، وہ تو بس پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لیا کرتے ہیں۔" جبران کی خاموش نظریں جیسے شکوہ کناں تھیں۔ مگر پروفیسر امین نے اس کی نگاہوں کے شکوے کو نظر انداز کر دیا۔

"مجھے وقتی طور پر اشتعال آ گیا تھا۔ بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔ تمہارے ساتھ کچھ زیادتی ہو گئی۔ اس کا مجھے دلی قلق ہے مگر قصور تمہارا بھی ہے۔" وہ زخموں کو کرید رہے تھے یا ان پر مرہم رکھ رہے تھے' اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"تمہیں کلاس کے سامنے مجھے ٹوکنا نہیں چاہیے تھا۔" وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ رہے تھے۔ "اس طرح ٹیچر اپنی انسلٹ محسوس کرتا ہے۔ بہرحال میں نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے کالج سے جاؤ۔ اس طرح میں گلٹی محسوس کروں گا۔"

"سوری سر۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔" اس نے سر جھکا لیا۔

وہ گلٹی فیل کر رہے تھے یا نہیں، وہ ایک ایسے شخص کی خاطر نہیں رک سکتا تھا' جس نے اس کی رگ رگ میں اذیتوں کے نشتر اتار دیے تھے۔

"یقین جانو جبران تم مجھے بہت عزیز ہو۔ تمہارے جانے کا مطلب ہوگا کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔ حالانکہ میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔" انہوں نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شفقت سے کہا۔

"کیا ایک بڑے بھائی کو اپنے چھوٹے بھائی کو ڈانٹنے ڈپٹنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اور مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو میں تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ حالانکہ تم سے بڑا ہوں اور تمہارا استاد ہوں۔"

لگا کے زخم بدن پہ قبائیں دیتا ہے
وہ شہریار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

وہ زخم لگا کے مرہم لگانے کا ہنر خوب جانتے تھے اور نفسیاتی طور پر اسے چت کرنے کے لیے داؤ پیچ استعمال کر رہے تھے۔ اور وہ اپنی بے پناہ ذہانت کے باوجود دنیا کی چالاکیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سیاستوں سے نا آشنا تھا۔

''سر'' اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ ''سر ایسا نہ کہیں یہ آپ کی عظمت ہے کہ آپ ایسا سوچتے ہیں۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تو بے اختیار سر امین نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور اس کا سارا غصہ آنسوؤں میں بہہ گیا۔ پھر جب وہ سنبھلا تو اپنی کمزوری پر بہت جھینپ رہا تھا۔

''سر، سوری میں شرمندہ ہوں۔'' اس نے نگاہیں جھکا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں، غبار چھٹ جائے تو آدمی کو بہتر نظر آنے لگتا ہے؟'' سر امین مسکرائے۔ ''اور دیکھو، ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔'' ان کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی اور اصرار بھی۔

جبران نے مائیگریشن کے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیے۔

''شکریہ تم نے میرا مان رکھ لیا۔'' انہوں نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے کاغذات چاک کر دیے اور اس کے ٹکڑے باسکٹ میں ڈال دیے۔

''مجھے بار بار شرمندہ نہ کریں سر۔ آپ میرے استاد ہیں اور میرے لیے قابل احترام۔'' اس نے محجوب ہو کر کہا اور پھر ان کی اجازت سے باہر چلا آیا۔

اس دن سے سر امین بہت مہربان ہو گئے تھے۔ وہ اس سے بہت محبت و شفقت سے بولتے۔ اکثر اس سے کہتے کہ وہ فارغ وقت میں پڑھنے کے لیے ان کے پاس آ جایا کرے، مگر وہ ہر بار ٹال جاتا۔ اسے بلا وجہ کسی کا احسان لینا پسند نہ تھا۔

اس دن کالج ٹائم کے بعد وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر شام تک اسے اپنے ساتھ رکھا۔ اور اس کے بار بار کہنے کے باوجود بھی اسے کھانا کھائے بغیر نہ جانے دیا۔

جبران ان کی عنایات پر حیران تھا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بدلے بدلے حوصلہ افزا رویے نے اس کی بکھری ہوئی شخصیت کو یکجا کرنے میں کافی مدد دی۔ اس کے اندر علم کی پیاس اور طلب تھی۔ ہر چیز کے متعلق جستجو اور کرید تھی۔ وہ بہت کم وقت میں زیادہ حاصل کر لینا چاہتا تھا مگر جو ذہنی دھچکہ اسے لگا تھا اس کی وجہ سے اسے خاصی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی پچھلی کمی پوری کر لینا چاہتا تھا۔ جب امتحان ہوئے تو پروفیسر امین اس کا پیپر دیکھ

کر دنگ رہ گئے۔ ایک مکمل کمپلیٹ پیپر جس میں کوئی ایک لفظ یا ایک نقطہ تک قلم زد کرنے کے ناقابل تھا۔ کورس کے علاوہ ایکسٹرا معلومات مگر ایک جملہ بھی آؤٹ آف پوائنٹ نہیں۔ انہیں دل ہی دل میں اس کی ذہانت اور علمی قابلیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ بلاشبہ وہ اپنی کھوئی ہوئی تمام صلاحیتیں بحال کر چکا تھا اور اب پھر اس مقام پر تھا' جہاں اس کا مقابل کوئی نہ تھا۔

سر امین کی نوازشیں اس پر بڑھتی جا رہی تھیں۔ کلاس میں وہ اکثر اس کی حد درجہ ذہانت اور علمی قابلیت کی تعریف کرتے نظر آتے اور اسے جینیئس کہتے۔ لڑکے حیران تھے کہ یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی۔ کہاں تو اتنی سخت مخالفت کہ کالج سے نکلوانے کے لیے تیار ہو گئے اور کہاں اس قدر مہربانیاں۔

''یار لگتا ہے وہ تمہاری بیماری سے ڈر گئے ہیں۔'' علی مذاق کرتا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں۔'' ایاز تردید کر دیتا۔

''اصل میں وہ جبران کی ذہانت سے متاثر ہو گئے ہیں۔''

عثمان بھائی کا خیال تھا کہ انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ ایک قسم کی تلافی کر رہے ہیں۔

کچھ بھی تھا ان کا رویہ جبران سے بہت بدل گیا تھا۔ اور وہ بہت مشفق اور مہربان ہو گئے تھے۔ انہوں نے جبران سے پھر کہا۔

''لڑکے، پھر اس دن کے بعد تم آئے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم جیسے لڑکوں کی ذہنی تشنگی کلاس میں نہیں ہو سکتی۔ تمہاری ہمہ پہلو شخصیت کی تراش خراش کے لیے خصوصی توجہ کی ضرورت ہے اور میں تم پر وہ توجہ دینا چاہتا ہوں۔ پھر نہیں کیا اعتراض ہے۔''

''نہیں سر۔ اعتراض تو کوئی نہیں بس یونہی۔ ان کے بار بار کے اصرار پر وہ ان کے گھر جانے لگا اُسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے۔ اس کی اتنی خاطر مدارات کرتے کہ وہ اتنی بے پناہ پذیرائی پر شرمندہ ہو جاتا۔ اکثر اُسے کھانے پر روک لیتے۔ اور اُس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس پر نوازش کیے جاتے۔ کبھی کوئی قیمتی پین کبھی ادبی کتابوں کا کوئی سیٹ یا کوئی خوبصورت سوٹ یا کوئی چھوٹا موٹا سا تحفہ ہر دس پندرہ دنوں کے بعد وہ اُسے تھما دیتے۔ وہ ہچکچاتے انکار کرتا، شرمندہ ہوتا مگر وہ کہتے۔

''یار لے لو یہ میں استاد شاگرد کے رشتے سے نہیں دے رہا ایک بھائی کی حیثیت سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے رہا ہوں۔ یوں اُستاد شاگرد کے درمیان بھی میں فرینکنس کا قائل ہوں۔ مجھے اپنا دوست سمجھو بھائی سمجھو اور تکلف مت کیا کرو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ ان کے حد درجہ خلوص کے سامنے مجبور ہو جاتا۔

وہ اسے بڑے پیار و شفقت سے پڑھاتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے پڑھانے میں انہیں لطف آنے لگا تھا' جب وہ پڑھتے پڑھتے اچانک کوئی پوائنٹ اٹھاتا تو وہ ہر ممکن طریقے سے اس کے ذہنی تجسس کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے پاس بے پناہ علم تھا۔ شاید دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو ان کی نظروں سے نہ گزری ہو۔ وہ ہر موضوع پر مدلل بحث کر سکتے تھے اور مخاطب کو مطمئن کر سکتے تھے ان کی نگرانی میں جبران کی پیاس بجھنے لگی۔ وہ اپنا زیادہ یہاں گزارنے لگا اور یہیں ان کی صحبت میں اسے سگریٹ پینے کی لت پڑی۔ پروفیسر امین چین اسموکر تھے۔ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے چلے جاتے۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں اور ہونٹ سگریٹ پی پی کر قرمزی ہو گئے تھے۔ جبران کو پڑھاتے وقت بھی سگریٹ ان کے ہاتھ میں ہوتا اور سگریٹ کے کش پر کش لگاتے دلائل پر دلائل اور لیکچر پر لیکچر دیے چلے جاتے اور وہ مبہوت و مرعوب سا ان کی علمی قابلیت سے مستفید ہوتا رہتا اور ان کے ایک ایک حرف کو اپنے ذہن کی لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا۔ وہ سر امین سے بہت زیادہ متاثر ہونے لگا تھا اور وہ اسے ایک آئیڈیل شخصیت نظر آنے لگے تھے۔

جب وہ پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتے تو دین محمد کو چائے کا کپ لانے کا کہہ کر دراز سے کارڈ نکال لیتے۔

"چلو بھائی کارڈز ہو جائیں، بہت تھک گئے۔"

شروع شروع میں جبران جھجکا۔ اسے سر امین سے کارڈ کھیلنا خلاف ادب لگا مگر سر امین نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا۔

"کم آن یار، اتنی زیادہ محنت کے بعد کچھ ہلکی پھلکی سی تفریح ہو جائے تو ذہن فریش ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے اسے کارڈز کے بہت سے کھیل سکھائے اور انہوں نے کارڈز پھینٹتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"بھئی جبران لو ایک کش تم بھی لگاؤ۔ کیا خوشبو دار سگریٹ ہے، مزہ آ گیا۔"

"نہیں سر میں نہیں پیتا۔" اس نے معذرت کی۔

"اچھا واقعی۔" انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"کیا تم نے واقعی کبھی سگریٹ نہیں پیا، یقین نہیں آتا۔"

"یہ سچ ہے سر۔"

"لگا تو ایک کش بھئی، تم بچے نہیں ہو اور بھئی دنیا کے سارے تجربے حاصل کرنے چاہئیں۔ اور ہر ذائقہ چکھنا چاہیے۔"

انہوں نے اصرار کیا۔

وہ بڑے کھلاڑی تھے ان کا شاطرانہ ذہن ہر چال خوب سوچ سمجھ کر چل رہا تھا۔

جبران ان کے کہنے پر اکثر سگریٹ کا ایک آدھ کش لگا لیتا۔ مگر اس کے ضمیر پر بہت بوجھ تھا۔ اس دن عثمان بھائی عالیہ کو الجبرے کا کوئی سوال سمجھا رہے تھے کہ وہ ان کے پاس چلا آیا۔

"عثمان بھائی یہ سر امین کبھی کبھی مجھے پر اسرار، بہت الجھے ہوئے، بہت گمبھیر نظر آنے لگتے ہیں۔" اس نے اپنا سارا مسئلہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آنے لگتی ہے جیسے کوئی شکاری گھات لگائے بیٹھا ہو۔ حالانکہ وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں کہ تقریباً مجھے برابری کا درجہ دے رکھا ہے وہ مجھے سگریٹ آفر کرتے ہیں اور میرے ساتھ کارڈز کھیلتے ہیں اور ایسی دوستانہ اور بے تکلفانہ بات چیت جیسی دو ہم عمر دوستوں میں ہوتی ہے اور پتا نہیں کیوں مجھے یہ سب کچھ مصنوعی سا لگتا ہے۔"

عثمان بھائی نے فائل سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جب عنایتیں حد سے زیادہ سوا ہو جائیں تو غیر فطری لگنے لگتی ہیں وہ اپنی زیادتی کی تلافی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اور تمہارے دل پر شاید ان کی زیادتی کا کوئی عکس باقی ہے۔"

"پتا نہیں۔" جبران الجھ رہا تھا۔ "کبھی کبھی ان کا حد درجہ خلوص اور بے پایاں عنایت مجھے ہراساں کر دیتی ہے ان کے طلسم نے مجھے جکڑ لیا ہے اور لگتا ہے کہ میں اس سحر سے باہر نہ آ سکوں گا۔"

"تمہیں خدشہ کیا ہے آخر؟" عثمان بھائی فائل رکھ کر اسے دیکھنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "مگر کبھی کبھی میں ڈسٹرب ہو جاتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ پر چھا رہے ہوں جیسے میں مکمل طور پر ان کی گرفت میں ہوں۔ جیسے میں ان کی مرضی اور رضا کے خلاف ایک قدم نہیں چل سکتا۔ اگر کبھی وہ میرے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ دے کر کہیں کہ لو میرے عزیز پی لو اسے تو شاید میں بلا چون و چرا پی لوں۔ انکار نہ کرسکوں۔ انہوں نے میری خود اعتمادی کو سلب کر لیا ہے میں ہپناٹائز ہو گیا ہوں۔"

"اگر وہ اس درجہ تم پر حاوی ہو رہے ہیں تو تم ان کے گھر آنا جانا چھوڑ دو۔ کنارہ کرلو ان سے۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر کھینچ لو۔" عثمان بھائی نے نصیحت کی۔

"یہی سوچ رہا ہوں مگر کیا وہ مجھے کنارہ کرنے دیں گے۔" ان کا خلوص و محبت، اپنائیت کے انداز، روزمرہ دعوتیں اور تحفے تحائف۔ میں کس کس بات سے انکار کر دوں۔ ایک دو بار میں نہیں گیا تو انہوں نے نوکر بھیج دیا کہ رات ادھر ہی کھانا کھاؤ۔ آپا نے بطور خاص تمہارے لیے اہتمام کیا ہے۔ وہ مجھے بالکل گھر کے ایک فرد کی حیثیت دے رہے ہیں ایسے میں آدمی کیا کرے۔"

"میرا خیال ہے تم کوشش کر دیکھو۔ کبھی جاؤ کبھی نہ جاؤ، دھیرے دھیرے اپنے آپ کو کھینچو۔ ایک دم نہیں، کھانے پر روکیں تو کبھی کوئی عذر، کبھی کوئی معذرت۔ مگر کبھی کبھی رک بھی جاؤ تا کہ انہیں احساس نہ ہو۔ اور ہاں کبھی کبھی سگریٹ کا ایک آدھ کش لگا لینے میں بھی کوئی حرج نہیں، اسے اپنے ضمیر کا بوجھ مت بناؤ۔ ہاں اسے عادت مت بنا لینا۔" عثمان نے سمجھایا۔

"اور گو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ محض اپنی زیادتی کی تلافی کر رہے ہیں پھر بھی اگر وہ تمہاری ڈسٹربنس کا باعث ہیں تو ان سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔" عثمان بھائی نے کہا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اتنے مقدس پیشے سے تعلق رکھنے والا شخص ایسی سطحی سوچ بھی رکھ سکتا ہے۔ اور ایسے داؤ پیچ بھی کھیل سکتا ہے کہ جس کا آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ مکڑی کی طرح بڑی خوبصورتی اور ذہانت کے باوجود ان کے جال میں پھنسا تھا مگر کبھی کبھی وہ چونک پڑتا۔

اس کے اندر گھنٹی سی بجنے لگتی۔ جیسے اسے کوئی وارننگ دے رہا ہو کسی آنے والے خطرہ

سے آگاہ کر رہا ہو۔ اور ایسا اس وقت ہوتا جب پروفیسر امین کے چہرے پڑا ہوا نقاب پیچھے سرک جاتا اور ان کے ہونٹوں سے کوئی چبھتا ہوا فقرہ آزاد ہو جاتا اور وہ بے اختیاری میں دل کی بات کہہ جاتے مگر فوراً ہی سنبھل کر وہ بات کا رخ خوبصورتی سے پلٹ دیتے اور جبران بات کو سمجھتے سمجھتے یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ شاید ان کے بات کرنے کا انداز یہی ہے۔

زندگی ان دنوں کتنی خوبصورت ہو گئی تھی۔ عثمان بھائی کو بطور اے ایس پی کوئٹہ تعینات کیا گیا تو امی جان نے ان کے جانے کا سن کر جھٹ چچا میاں کی منجھلی لڑکی زوبی سے ان کی بات طے کر دی۔ نرم نرم بولنے والی ہنس مکھ سی زوبی گھر میں سب کو ہی پسند تھی۔ امی جان کا ارادہ تو شروع سے اس کو بہو بنانے کا تھا مگر وہ بات منہ سے نکالنے سے پہلے چاہتی تھیں کہ بیٹا کچھ بن جائے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ چچا میاں اور چچی جان بھی عثمان بھائی جیسا لائق فائق داماد پا کر خوش تھے۔ دونوں گھروں میں خوب تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کی رم جھم سی برستی نظر آتی۔

ادھر بجیا کے سسرال والوں نے جلدی شادی کا شور مچا دیا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ بجیا کی بارات اور عثمان بھائی کا ولیمہ ایک ہی دن ہو۔ مصروفیت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ جہیز اور بری کی تیاری میں بازاروں کے چکر پر چکر لگ رہے تھے۔ اور خاصی افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔

جبران نے بطور خاص اصرار سے سر امین کو بمع فیملی مدعو کیا۔

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بھئی میری فیملی تو آپا بیگم ہیں اور ان کے بچے سو وہ آجائیں گے۔"

"سر" جبران نے قدرے جھجک کر انہیں دیکھا۔

"سر ایک بالکل ذاتی سا سوال ہے۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔"

"یہ کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" پروفیسر امین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "اس کی کوئی بھی لمبی چوڑی وجہ نہیں میرے عزیز، آپا بیگم بہت کم عمری میں بیوہ ہو گئی تھیں، اور میں نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک بچے کسی مقام تک نہیں پہنچ جاتے، میں شادی نہیں کروں گا۔ کیا معلوم آنے والی یتیم بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی اور مجھے آپا بیگم اور ان کے بچے بہت پیارے ہیں۔ پھر ابا کے بعد چھوٹے بھائی معین کی ذمے داری بھی مجھ پر تھی۔ اور میں ان سب کو بیچ منجدھار میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ سو اب تک ان کو کسی منزل تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہنچانے کی تگ و دو میں ہوں۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"سر آپ بہت عظیم ہیں۔ آریئل گریٹ مین۔" وہ عقیدت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"عظیم کیا بھئی۔ اپنی ذمے داریاں تھیں۔ ظاہر ہے خود ہی نبھانی تھی۔ کوئی اور بات کرو۔" وہ اکتا سے گئے۔

جبران کے دل میں ان کی عزت پہلے سے بڑھ گئی۔

"یہ سر امین تو سراپا ایثار و وفا ہیں۔ وہ خوامخواہ ہی ان کے متعلق شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی کم فہمی، یا حد سے زیادہ زود رنجی۔ کیا اس کا ظرف واقعی اتنا چھوٹا ہے۔" وہ دیر تک سوچتا رہا اور خود کو ملامت کرتا رہا۔

اس دن عثمان بھائی کا ولیمہ تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ بار بار بہانے سے دلہن کے کمرے میں گھس آتے تو سب لڑکیاں شور مچا دیتیں۔ زوبی گلابی ہو جاتی اور عثمان بھائی کی آنکھوں میں روشنیاں سی تڑپنے لگتیں۔ اس وقت بھی زوبی کی کزنز اور سہیلیوں نے عثمان بھائی کو گھیرا ہوا تھا۔ جبران کسی کام سے اندر آیا۔

"دولہا بھائی یہ آپ بار بار اندر باہر کیوں آ جا رہے ہیں۔ کیا پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔"

زوبی کی کسی کزن نے کہا۔

"جی نہیں تو...... دراصل وہ۔" عثمان بھائی کھسیا کر سر کھجانے لگے۔ "وہ میں کچھ بھول گیا تھا یہاں۔"

"کیا دل؟"

کسی نے شرارت سے پوچھا۔

"آں ہاں شاید۔" عثمان بھائی ہنس پڑے۔

"زوبی بھابی، ذرا پاؤں ہٹانا، یہیں کہیں پڑا ہوگا۔"

شاید زوبی کی کوئی دوست تھی۔

"زوبی بھابی اتنی ناقدر دان نہیں جو اتنی قیمتی چیز کو یونہی پھینک دیں۔" جبران بھائی کی حمایت میں بول پڑا۔

"اور یہ تو ان کی خوش قسمتی ہے کہ عثمان بھائی جیسے لائق فائق، چندے آفتاب، چندے

ماہتاب۔"

"کتنی رشوت ملی ہے تعریف کی؟" کسی نے تیزی سے بات کاٹی۔

"رشوت' آپ جیب میں کچھ چھوڑتیں تو رشوت ملتی، سب کچھ تو نکلوا لیا۔ سلامی کے وقت۔"

"آہ بے چارے غریب۔"

ٹھنڈی آہ بھری گئی۔

"دو چار روپوؤں کی ضرورت ہو تو۔"

"انہیں اپنے سر پر وار کر صدقہ تو دے دیجئے گا۔" جبران نے جل کر کہا۔

چند مترنم قہقہوں کے درمیان کچھ سرگوشیاں سی ابھریں جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے جبران نے زوبی سے کہا۔

"اچھا بھابی آپ خود فیصلہ کریں، ہے کوئی اس پوری دنیا میں عثمان بھائی جیسا۔ اور آپ کو اپنی خوش قسمتی میں شک ہے کیا؟"

"خوش قسمت تو عثمان بھائی بھی کچھ کم نہیں۔"

عفان زوبی کے پاس گھستا ہوا بولا۔

"اتنی تو پیاری ہے میری بھابھی۔"

"چل چپ غدار، دشمنوں کے ٹولے میں جا ملے ہو، برادر یوسف؟" جبران نے اسے ڈانٹا۔

"اور تم یہاں کیا کر رہے ہو لڑکیوں میں، چلو باہر کام بہت ہے۔" وہ لڑکیوں کی دبی دبی سی ہنسی سے بے نیاز اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

بارات آنے والی تھی۔ جبران پھولوں کے ہار پہنے اندر آیا تھا' جب وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔

"آپ دولہا کے بھائی ہیں غالباً۔" جیسے یہ آواز پہلے بھی کہیں سنی ہو۔

"اگر آپ کی مراد عثمان بھائی ہیں تو یقیناً...... اور اگر آپ ڈاکٹر جواد کے متعلق کہہ رہی ہیں تو نہیں۔"

جبران نے بغور اسے دیکھا۔ بڑا سا گرین دوپٹہ شانوں پر پھیلائے وہ بہت نکھری نکھری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سی لگ رہی تھی۔ کچھ جانی پہچانی سی مگر وہ اسے پہچان نہ سکا۔

''تو آپ ہیں وہ مشہور زمانہ ہستی جن کے چرچے ایک عرصے سے سنے جارہے تھے؟''

''قابلِ تعریف تو آپ بھی کچھ کم نہیں۔''

اس کی نکھری نکھری رنگت اور نقوش کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''جی؟''

اس کے لہجے میں حیرانی اتر آئی۔

''جی۔'' جبران نے جھک کر قدرے شوخی سے کہا۔

''ویسے بائے داوے چرچے کس سلسلے میں۔''

''یہ کہ آپ بڑے لائق فائق، ذہین وفطین ہیں اور ایف ایس سی میں آپ نے ٹاپ کیا' وغیرہ وغیرہ......''

''تو آپ کو کچھ شک تھا جو تصدیق کے لیے دوڑی آئیں۔''

''آں ہاں، لگتے تو نہیں آپ کچھ ایسے۔'' اس نے شرارت سے ہونٹ دبائے۔

''اچھا تو ذہین وفطین لوگوں کے سروں پر سینگ ہوتے ہیں؟''

''نظر تو نہیں آ رہے۔'' اس کے رخساروں کے ڈمپل مسکرا اٹھے۔

ویسے خوشی ہوئی آپ سے مل کر، میں ثمن ہوں۔ بڑی خواہش تھی آپ سے ملنے کی۔''

اس وقت جبران کو یاد آیا کہ ارے، یہ تو وہی لڑکی ہے' جس نے کہا تھا کہ کتنی رشوت ملی ہے، تعریف کرنے کی۔ شاید زوبی بھابی کی کوئی دوست۔

''آپ وہی ہیں جو ابھی زوبی بھابی کے پاس۔''

''جی جی وہی...... ماشاء اللہ......خوب یادداشت پائی ہے آپ نے۔'' چبھتا ہوا سا لہجہ جس میں ہلکا سا شکوہ بھی تھا شاید۔

جبران کچھ کہنا چاہتا تھا مگر باہر ابا جان اسے پکار رہے تھے۔ پھر ادھر ادھر جاتے ہوئے کئی بار اسے یہ ہنستی مسکراتی لڑکی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے ساختہ مسکرا اٹھتی اور اس کے رخساروں کے کنول کھل اٹھتے اور پتا نہیں کیوں، جبران کا جی چاہتا کہ وہ یوں ہی مسکراتی رہے اور اس کے رخساروں کے کنول کھلتے رہیں۔ اور ایک نوخیز سا جذبہ جانے کیوں بار بار اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا۔ مگر فریحہ بجیا کی رخصتی کے ہنگامے میں وہ اپنے دل میں اٹھنے والے

اس جذبے کو سمجھ نہ سکا۔

فریحہ بجیا ڈاکٹر جواد کی ہمراہی میں پیا دیس سدھاریں تو زوبی بھابی نے ان کی کمی کافی حد تک دور کر دی۔ عفان تو بھابی کا دیوانہ تھا، بھابی بھابی کہتے اس کا منہ سوکھتا۔ عالیہ اور نادیہ آپی بھی زوبی بھابی کی مدارات میں بچھی جاتیں۔ زوبی بھابی ان سب کی محبتیں دیکھ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتیں۔ عثمان بھائی کے کوئٹہ جانے کے دن قریب آرہے تھے۔ امی جان متفکر تھیں نئے گھر کی سیٹنگ اکیلی زوبی کیسے کرے گی۔ ابھی نئی نویلی دلہن ہے، اکیلے بھیجنا تو مناسب نہیں۔ آخر انہوں نے خود ساتھ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ زوبی کو وہاں سیٹ کرنے میں تھوڑی بہت مدد کر سکیں۔ وہ نادیہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔

عفان کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اس لیے وہ بھی واپس چلا گیا۔ سب کے جانے کے بعد گھر میں بالکل ویرانی سی ہو گئی تھی۔ عالیہ اداس اداس سی سارے میں پھرتی رہتی۔

جبران عالیہ کے خیال سے کالج ٹائم کے بعد زیادہ تر گھر میں رہتا۔

پندرہ دن کے بعد امی جان اور نادیہ آپی واپس آگئیں پھر بھی گھر میں عثمان بھائی، بجیا اور زوبی بھابی کی کمی محسوس ہوتی رہی مگر رفتہ رفتہ وہ عادی سے ہو گئے۔

جبران ایک بار پھر سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عثمان بھائی کے کہنے پر اس نے سر امین کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ بس کبھی کبھار ان کے اصرار پر چلا جاتا۔ مگر ان کی شفقتوں اور محبتوں کا انداز وہی ہوتا۔ اس دن بہت دنوں کے بعد وہ ان کے ہاں گیا تھا۔

پروفیسر امین اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''اچھا ہوا تم آگئے میں ابھی تمہیں بلوانے والا تھا۔''

''خیریت سر!'' جبران نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں بھئی خیریت ہی ہے۔ میرا بھائی معین آیا ہوا ہے، اسلام آباد سے۔ وہیں ہوسٹل میں رہتا ہے بے حد ذہین اور قابل لڑکا ہے۔ تمہارا ہم عمر بھی ہے اور ہم جماعت بھی۔ سوچا، تمہیں اس سے ملوا دوں۔'' انہوں نے دین محمد کو کہہ کر معین کو بلوایا۔

سر امین کی طرح دبلا پتلا، چھریرا سا بدن، جیسے بہار کا اولین جھونکا اور گہری اندر تک اتر جانے والی بے حد چمکیلی آنکھیں۔ جبران کو اس کی شکل بے حد مانوس سی لگی۔

''یہ معین ہے میرا چھوٹا بھائی معین ملک۔ اور جبران واسطی کا نام تمہارے لیے اجنبی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں ہوگا غالباً۔''

''جبران واسطی۔'' معین نے بھنویں اچکائیں۔

''وہی تو نہیں جنہوں نے ٹاپ کیا تھا، ایف ایس سی میں؟''

''ہاں ہاں وہی۔''

''تو آپ ہی ہیں جنہوں نے میرا حق مارا؟'' اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ وہی حقارت یا نفرت جو کبھی پروفیسر امین کے لہجے میں ہوا کرتی تھی۔

''آپ کا حق؟ میں سمجھا نہیں۔'' جبران واقعی حیران تھا۔

''میرا مطلب ہے، ٹاپ تو میں نے کرنا تھا پھر آپ کیسے آگئے سرفہرست۔'' مغرور سا انداز جیسے کسی کو اپنے برابر نہ سمجھتا ہو۔

''ہر کسی کو اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے بھئی۔'' پروفیسر امین نے بات سنبھالی۔ ''اور تم نے ٹاپ کرنا ہے تو اب کے بار زیادہ محنت کرنا۔''

''او کے۔'' یک دم معین مسکرایا۔ ''جب بھائی جان کہہ رہے ہیں تو واقعی آپ اس اعزاز کے مستحق ہوں گے۔ ویسے محنت تو میں نے بہت کی تھی۔ اینی وے بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

جبران کو یاد آیا کہ یہ معین ملک تو وہی ہے جس نے مڈل اور میٹرک میں اول اور ایف ایس سی میں دوم پوزیشن حاصل کی تھی۔ چنانچہ بڑی گرمجوشی سے معین کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے اس کی تصدیق چاہی۔ اور جب معین نے اقرار میں سر ہلایا تو اسے بہت خوشی ہوئی۔

''سر آپ نے پہلے کیوں نہیں ملایا معین صاحب سے۔ ان کی رفاقت یقیناً میرے لیے باعث فخر ہوتی۔'' جبران کا لہجہ پُرجوش تھا۔

''بات یہ ہے کہ میں دوستوں کے بارے میں ایک خاص ذوق کا مالک ہوں اور انہیں سے دوستی کرنا پسند کرتا ہوں جو اس ذوق پر پورا اترتے ہیں۔'' معین نے پُرخیال نظروں سے جبران کو دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں آپ کے معیار پر پورا نہیں اترا۔ کیوں؟'' جبران نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں خیر، ایسی بات بھی نہیں، غور کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے پر کیونکہ۔''

معین کچھ سوچ کر ہنسا۔

''ایک اچھا دوست خدا کا انعام ہوتا ہے اور میں اتنا ناشکرا تو نہیں کہ اس انعام کو ٹھکراؤں۔''

''آپ بھی سر امین کی طرح بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور میں جبھی تو متاثر ہونے لگا ہوں آپ سے۔'' جبران مسکرایا۔

''اور میں مرعوب بھی ہوں جناب سے۔ کس طرح فتح پر فتح کرتے چلے جاتے ہیں آپ نے مجھے بیٹ کیا۔ حالانکہ میں نے اتنی محنت کی تھی اور میں ٹاپ کرنا چاہتا تھا مگر آپ نے مجھے پچھاڑ دیا۔''

''کیا خبر اگلی بار آپ مجھے پچھاڑ دیں۔'' جبران خوش دلی سے مسکرایا۔ ''اور یہ تو لک کی بات ہوتی ہے چند ایک نمبروں سے کوئی اوّل آ جاتا ہے اور کوئی دوئم۔ اس سے آدمی کی ذہانت کم نہیں ہوتی۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں پھر بھی میں ایٹ دا ٹاپ آف دی لسٹ رہنا چاہتا ہوں اور میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ اس دفعہ میں۔''

''افوہ بھئی...... یہ کیا تم دو دشمنوں کی طرح تو نہ بی ہیو کرو۔'' سر امین نے مداخلت کی۔

''دونوں محنت کرو، خوب محنت۔ بھئی مزہ تو جب ہے نا جب کمپی ٹیشن سخت ہو پھر دیکھو کون آگے نکلتا ہے۔ اور اس اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جب وقت آیا تو دیکھا جائے گا۔'' معین نے لاپروائی سے ہاتھ جھٹکے۔

''کیوں مسٹر جبران، میں نے ٹاپ کیا تو آپ کے تاثرات کیا ہوں گے؟''

''مجھے یقیناً خوشی ہوگی اور میں خوش دلی سے آپ کو مبارکباد دوں گا۔ کیونکہ میری اجارہ داری نہیں کہ میں ہمیشہ ٹاپ کروں' کوئی بھی مجھ سے زیادہ ذہین، مجھ سے زیادہ بہتر اور لائق لڑکا اوّل پوزیشن لے سکتا ہے۔''

''واقعی اتنا ظرف ہے آپ کا۔'' معین نے حیرانی سے کہا۔

''آزمائش شرط ہے۔'' جبران نے اعتماد سے کہا۔

''ویسے مجھے یقین ہے کہ میں کسی کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔''

''او کے لڑکو اب اس بحث کو ختم کرو، میرا خیال ہے وقت بہترین پارس ہے جو کھرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور کھوٹے کی پہچان کراتا ہے تم بھی یہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔"

"اب میں چلتا ہوں سر۔" جبران کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو میاں، کھانا کھا کر جانا۔ معین مدت بعد آیا ہے، گپ شپ لگائیں گے۔"

"نہیں سر، پھر کبھی سہی۔ آج مجھے ضروری کام ہے مجھے اجازت دیں۔ ویسے معین صاحب کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔"

وہ معذرت کر کے چلا آیا۔ مگر اس کا ذہن کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ پتا نہیں، معین کے رویے میں کیا ناقابلِ فہم سی بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ عثمان بھائی نہیں تھے اس نے عالیہ اور نادیہ آپی سے ملاقات کا حال بیان کیا۔ نادیہ نے کہا کہ اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ان لوگوں کے بات کرنے کا انداز ہی یہی ہے۔

اس نے بتایا کہ "شادی میں پروفیسر امین کی بھانجیاں نازیہ اور شازیہ آئی ہوئی تھیں، ان کی باتیں بھی پرُتکبر اور طنزیہ تھیں۔ جیسے اپنے برابر کسی کو نہ سمجھتی ہوں۔ عجیب رعونت بھرا انداز، بہرحال اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے، بات کرنے کا۔ اس میں اتنا اثر لینے کی ضرورت نہیں۔"

جبران چپ ہو گیا واقعی بعض لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا اور وہ ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو دوسروں کو چھلنی کر دیتی ہے یا پھر یہ کہ وہ ہی اتنا زود رنج اور حساس ہو گیا تھا کہ ہر بات کو زیادہ محسوس کرتا تھا۔ نہیں، اس دنیا میں رہنے کے لیے اتنی حساسیت درست نہیں مجھے اپنے آپ پر قابو پانا ہے اور اس حساسیت کو دور کرنا ہے۔ ورنہ چھوٹی چھوٹی باتیں میرے دل میں ترازو ہوتی رہیں گی اور یہ ایک مرد کی شان نہیں۔ وہ دیر تک اپنے آپ کو سمجھاتا رہا۔

✸✦✸

کالج میں انسدادِ منشیات کے موضوع پر تقاریر ہو رہی تھیں۔ جبران ابھی ابھی تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے اترا تھا اور اب ثمن مسعود کا نام پکارا جا رہا تھا۔ ثمن اسٹیج پر آئی تو جبران ایاز سے باتیں کرتے کرتے چونک پڑا۔ ارے یہ تو وہی ہے گرین دوپٹے والی جس کے رخسار پر کنول کھلتے تھے اور جس کی طرف بار بار دیکھنے کو جی کرتا ہے۔ وہ جس کے ہنستے ہوئے شوخ چہرے نے کئی بار رات کی تنہائیوں میں اسے ڈسٹرب کیا۔ اور کتاب پر جھکے جھکے کئی بار اس کی مترنم ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ وہی ثمن۔ وہ اسٹیج پر کھڑی دھواں دھار بول رہی تھی اور وہ مبہوت کھڑا اسے سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے ڈائس پر ہاتھ مارتے ہوئے جوش سے کہا۔

"جناب صدر! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اربابِ اختیار پرُجوش تقریریں تو کر دیتے ہیں۔ اور اخبارات میں بڑے بڑے بیانات بھی چھپوا دیتے ہیں مگر اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور مضبوط قدم نہیں اٹھاتے۔ اگر منشیات کے کاروبار میں ملوث افراد کو بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں یہ کہ گھناؤنا کاروبار اپنی موت آپ نہ مر جائے اور معاشرہ اس لعنت سے پاک ہو جائے۔ آخر میں مجھے اربابِ اختیار سے صرف یہ کہنا ہے کہ معاشرے کو زہر آلود کرنے والے ان افراد کے ساتھ کسی قسم کی نرمی نہ برتی جائے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ جو آگ آج دوسروں کے گھروں کو جلا رہی ہے، کل وہی آپ کے دامن تک آ پہنچے۔"

ثمن اسٹیج سے اتری تو جبران بڑی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا، چونکا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ ثمن اسے پہنچان کر رک گئی۔

"آپ بہت اچھا بولیں مس ثمن۔ آپ کی تقریر جذباتی مگر دل پر اثر کرنے والی تھی۔ بہت اپیلنگ۔" جبران نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھا۔ آپ نے اپنے آپ کو پرائز کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مستحق ثابت کر دیا۔

"میں نے کسی پرائز کے لالچ میں تقریر نہیں کی۔" سمن آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ "یہ میرے دل کی آواز تھی اور شاید وہ نفرت' جو مجھے منشیات فروشوں سے ہے، میرا بس چلے تو ان کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں اور ان کی بوٹی بوٹی چیل کوؤں کو کھلا دوں۔" اس کے لہجے میں آگ سی سلگ رہی تھی۔

جبران نے سمن کے تپتے تپتے لہجے اور سلگتی آنکھوں کو بغور دیکھا۔

"مس سمن آپ اتنی انتہا پسند تو نہیں لگتیں۔ شاید آپ کے لہجے میں شدت اس لیے ہے کہ آپ ابھی تک اپنی تقریر کے الفاظ کی گرفت میں ہیں، کسی خاص مگر طاقت ور جذبے کے زیر اثر۔"

"ہاں، اس لیے کہ میرا دامن بھی اس آگ میں جل چکا ہے۔" اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "اور اب اس آگ کی تپش میرے الفاظ تک آ پہنچی ہے۔ تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"آپ' میں سمجھا نہیں کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔"

جبران الجھ سا گیا۔

"میرا بھائی نوید وہ بھی اس لعنت کا شکار ہو گیا تھا۔" سمن کی سیاہ آنکھیں شفاف پانیوں سے بھر گئیں اور ہمیں تب پتا چلا جب کچھ بھی کرنا ہمارے اختیار میں نہ رہا۔ پھر بھی ہم نے بہت کوشش کی' ہر ممکن کوشش۔ مگر اس کی جان بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ ہمیشہ کے لیے۔" آنسوؤں سے اس کی آواز بوجھل سی ہو گئی۔

"اوہ ویری سیڈ۔" جبران نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"مجھے واقعی افسوس ہوا۔ نہ جانے یہ آگ کتنے گھروں کو جلا چکی ہے۔"

"قاتل صرف ایک فرد قتل کرتا ہے۔ جب کہ منشیات فروش پورے خاندان کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے لیے تو کوئی ایسی عبرتناک سزا ہونی چاہیے کہ پھر کوئی فرد اس گھناؤنے کام کی جرأت نہ کر سکے ان کے پورے خاندان کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا جائے۔ یا پھر پرانے زمانے کی طرح کولہو میں پلوا دیا جائے۔"

بہتے پانیوں میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔

جبران اس کی جذباتی کیفیت کا سبب جانتا تھا۔ اسی لیے اس کے لہجے کی سفاکی کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے، جذباتی یا پرجوش ہونا کسی مسئلے کا حل نہیں۔ اس کے لیے کوئی ٹھوس اقدام اٹھانا ضروری ہے۔ یہ لعنت معاشرے سے اسی وقت دور ہو سکتی ہے، جب معاشرے کا ایک ایک فرد اس جہاد میں حصہ لے۔ ہم کچھ طلباء نے مل کر چھوٹے پیمانے پر اس جہاد کا آغاز کر دیا ہے۔ اور بالواسطہ طور پر انسداد منشیات کی مہم میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہم نے ایک انجمن بنائی ہے' جس کا مقصد منشیات کی علت میں مبتلا لوگوں کو اس علت سے نکالنا اور انہیں معاشرے کا ایک مفید فرد بنانے کی کوشش کرنا ہے۔ آپ کے جذبے کو دیکھتے ہوئے میں آپ کو بھی اس جہاد میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ کی پرجوش تقاریر یقیناً اس مقصد میں ہماری معاون ثابت ہوں گی۔"

"ضرور، آپ بے شک مجھے بھی اس انجمن میں شامل سمجھیے۔" سمن نے پرجوش ہو کر کہا۔ "یقین کریں، میں پہلی بار اسٹیج پر آئی ہوں، دراصل میرے اندر اک آگ لگی ہوئی تھی اور یہی آگ مجھے اسٹیج پر لے آئی۔ ورنہ مجھ میں اتنے لوگوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔"

"اور پہلی بار ہی آپ خوب بولیں۔" جبران مسکرایا۔ "میں تو آپ کو کوئی منجھی ہوئی مقررہ سمجھ رہا تھا۔"

"شکریہ۔ بہرحال میں مانتی ہوں کہ میری تقریر اتنی مدلل نہ تھی۔"

"مگر آپ بات کہنے کا قرینہ جانتی ہیں۔ یہ اعتراف آپ کو کرنا پڑے گا۔ ویسے میں سٹیج پر آپ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ آپ یہیں پڑھتی ہیں اس کالج میں۔"

"آپ کو اپنے اردگرد دیکھنے کی فرصت ہو تو پتا بھی چلے۔ ویسے آپ کو تو ہر طرف اپنا آپ ہی نظر آتا ہو گا۔ اس ہرن کی طرح' جسے اپنی ہی خوشبو دیوانہ رکھتی ہے۔"

"نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" جبران جھینپ گیا۔

"بس اتفاق ہے کہ کبھی آپ پر نظر نہ پڑی۔ اس دن کے بعد آج آپ کو اسٹیج پر دیکھا تو خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ یہ شریر سی لڑکی تو اپنی ہی کولیگ ہے۔" جبران کے لہجے میں خلوص کی جھلک تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"واقعی، حیرت ہے کہ آپ نے پہچان لیا۔" ثمن کے رخساروں کے ڈمپل مسکرا اٹھے۔

"حالانکہ میں ایک بار ہی آپ سے ملی ہوں۔"

"بعض اوقات ایک بار ملنا ہی کافی ہوتا ہے۔" غیر ارادی طور پر جبران کے ہونٹوں سے نکلا اور پھر وہ اپنے ہی الفاظ پر ٹھٹھک کر چپ ہوگیا۔

ثمن نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں۔" شرمندہ سے جبران نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"اور آپ سے ملاقات کو کچھ اتنا عرصہ نہیں ہوا۔"

"ہاں مگر میرا خیال تھا کہ آپ نرگسیت کا شکار ہیں۔ سارے جہان سے بے خبر، محض اپنے آپ میں گم، صرف اپنا ہی طواف کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو ہی بہت کچھ سمجھتے ہوئے۔" ہلکا سا گلہ تھا شاید اس کی آواز میں۔

"اوہو یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا۔ معاف کیجیے گا میں کسی کمپلیکس کا شکار نہیں ہوں، نہ احساس برتری، نہ احساس کمتری۔" جبران نے سنجیدگی سے کہا۔ "اور اگر مجھ سے آپ کو نظر انداز کرنے کا جرم سرزد ہوا ہے تو محض لاعلمی میں۔ اس کی وجہ میری کوئی نفسیاتی کمزوری نہیں۔ بہرحال شکریہ۔"

"اوہ آپ تو سنجیدہ ہوگئے۔ اور یہ شکریہ کس بات کا بھلا۔"

"یہ کہ آپ نے یاد رکھا اور انجانے ہی میں سہی، میری بے اتفاقی کو محسوس کیا۔" جبران نے جگمگاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے آپ اندازہ لگانے میں ماہر ہیں۔"

ثمن کو حیرت ہوئی۔ اس نے تو اپنے لہجے میں شکایت کا کوئی تاثر نہ آنے دیا تھا پھر وہ کیسے جان گیا۔ ثمن کو واقعی گلہ تھا۔ ارے بھئی یہ کیسا بددماغ اور مغرور سا شخص ہے کہ کیسے بنا پاس سے گزر جاتا ہے، بنا نظریں اٹھائے اور بنا مخاطب کیے حالانکہ اتنا اجنبی بھی نہیں مگر شاید واقعی کبھی اس نے دیکھا نہ ہو۔

"تو کیا غلط ہے میرا اندازہ؟" جبران نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پلیز مس ثمن! مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میں آنکھوں کے راستے

سے دل میں اتر جاتا ہوں۔"

"اچھا! بڑی خوش فہمی ہے۔" ثمن کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"تو کیا غلط ہے؟" جبران نے اس کی آنکھوں میں جھلمل کرتی کرنوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ بعض لوگوں کو ہلکی سی مسکراہٹ کتنا خوبصورت بنا دیتی ہے۔ سانولی سلونی سی ثمن کا چہرہ اس کی مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا تھا۔

"اب میں آپ کی تردید کر کے خوامخواہ آپ کو شرمندہ کیا کروں۔" ثمن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس لیے جو بھی سمجھیں۔"

"شکریہ آپ کی اس دریا دلی کا۔ واقعی بہت شکریہ۔"

جبران بھی ثمن کی ہنسی میں شریک ہوگیا۔

"میں تو واقعی اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں۔"

"سچ۔" ثمن نے ہنستی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں، بالکل سچ۔ ویسے آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں نا کہ میں اپنے آپ کو بہت کچھ؟" جبران کا انداز مزید شوخ ہوگیا۔

"ارے۔" ثمن نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا' تقاریر تو ہو بھی چکیں اور ججز نے غالباً فیصلہ بھی کر لیا اور...... جبران بھی سٹیج کی طرف متوجہ ہوگیا۔

حسب معمول جبران کو فرسٹ پرائز کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ مگر ثمن یہ سن کر واقعی حیران رہ گئی کہ سیکنڈ پرائز کے لیے اس کا نام پکارا جا رہا ہے۔ تالیوں کی گونج میں ششدر سی ثمن نے پرائز لیا۔ جوں ہی وہ پرائز لے کر واپس آئی۔ جبران نے آگے بڑھ کر اسے پرجوش مبارک باد دی۔ ثمن جھلملاتی آنکھوں سے شکریہ کہہ کر رہ گئی۔

پھر جبران واسطی کو دوستوں نے گھیر لیا تو ثمن بھی اپنی فرینڈز کے گھیرے میں وہاں سے نکل آئی۔

انسداد منشیات کے لیے طلباء نے جو چھوٹی سی انجمن قائم کی تھی، وہ روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ اس کے سارے ممبرز پورے خلوص سے اپنی اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ ممبران کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور فنڈز کی رقم بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ پروفیسر حسن جیسے لڑکوں نے متفقہ طور پر انجمن کا چیئر مین اور خزانچی مقرر کیا تھا۔ بہت سلیقے سے اس

رقم کو منشیات کے مریضوں پر خرچ کر رہے تھے۔ لڑکے نہ صرف منشیات کے خلاف تقاریر کر کے لوگوں کو ابھار رہے تھے بلکہ وہ پوری تن دہی سے [illegible] اٹھا کر رہے تھے اور منشیات کے ان عادی مریضوں کو جو زیر علاج تھے، جذباتی سپورٹ بھی فراہم کر رہے تھے۔ جبران اور سمن ان سب کاموں میں آگے آگے تھے۔ سمن جب کسی مریض کو لرزتے کانپتے اور کرب و اذیت سے تڑپتا دیکھتی تو پاگل ہونے لگتی۔

''خدایا، ان پر ایسا عذاب نازل فرما۔ جیسا عذاب تو نے پہلے کسی پر نازل نہیں کیا۔'' وہ بلبلا کر دعا مانگتی اور کبھی کبھی تو بے ساختہ رو پڑتی۔ الٰہی یہ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔''

جبران اسے حوصلہ دیتا۔

''ہمت سے کام لو سمن۔ اگر ہم بھی حوصلہ ہار بیٹھے تو یہ بے چارے تو بالکل ہی جی چھوڑ دیں گے۔ ہمیں انہیں بچانا ہے اس دلدل سے نکالنا ہے اور اس کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔ ہم نے کسی ایک فرد کو بھی اس دلدل سے نکال لیا تو سمجھو ایک اور نوید تباہ ہونے سے بچ گیا۔''

''میں کم حوصلہ نہیں ہوں مگر کبھی کبھی ہمت ہارنے لگتی ہوں۔'' سمن آنسو پونچھ لیتی۔ ''تم نہیں جانتے نوید نے کیسی کیسی اذیت سہی، کتنا کتنا تڑپا، خود کتنا رویا اور ہمیں کتنا رلایا۔ میرا دل ایک آبلہ بن چکا ہے۔ ذرا سی ٹھیس پر تڑپ اٹھنے والا۔ مگر تم اطمینان رکھو، میرا یہی دل منشیات فروشوں کے خلاف ایک پتھر بن چکا ہے۔ ایک کبھی نہ ٹوٹنے والی چٹان۔''

اس دن بھی ہسپتال سے واپسی پر سمن پر اداسی کا دورہ پڑا تھا۔ جبران ادھر ادھر کی باتوں سے اسے اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سمن دھیان نہیں دے رہی تھی۔

''غریب لوگوں کے تو بہت سے مسائل ہوتے ہیں، زندگی کی بے شمار تلخیاں اور محرومیاں۔'' سمن نے چلتے چلتے سر اٹھا کر جبران کو دیکھا۔

''وہ اپنے حالات سے فرار کے لیے اپنے خیال میں نسبتاً آسان راستہ چنتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اچھے پڑھے لکھے ایجوکیٹڈ لوگ اس دلدل میں کیسے گر جاتے ہیں۔''

سمن کے ذہن میں شاید ابھی تک اس لڑکے کا خیال تھا' جو آج ہی ہسپتال میں علاج کے لیے داخل کروایا گیا تھا۔ کسی اچھی فیملی کا تھا۔ مگر پتا نہیں کیسے نشہ کرنے لگا تھا۔ اس کی

سو بری امی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھیں اور ابو سر تھامے بدحواس سے بیٹھے تھے۔ جیسے ساری پونجی بیچ راستے ہی میں لٹ گئی ہو۔

''تم کیا سمجھتی ہو' کیا امیر لوگوں کے مسائل نہیں ہوتے؟'' جبران نے پوچھا۔

''پتا نہیں، شاید ہوتے ہوں۔'' اس کے لہجے میں غیر یقینی تھی۔

''پاگل ہو تم۔ مسائل کی نوعیت ضرور بدل جاتی ہے۔ مگر مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں۔'' جبران نے سمجھایا۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ نوید کیسے اس طرف آیا؟''

''شاید غلط صحبت یا......'' وہ رک گئی۔ ''اصل میں محبت۔ وہ بہت حساس تھا، بے حد زود رنج، ہر وقت خفا خفا سا رہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں، وہ سمجھتا تھا کہ گھر میں اس سے کوئی محبت نہیں کرتا، اہمیت نہیں دیتا۔ سب مجید بھائی کو چاہتے ہیں وہ اکثر اپنی حق تلفی کا گلہ بھی کرتا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مجید بھائی چونکہ سب سے بڑے تھے اور بے حد ذمے دار بھی اس لیے قدرتی طور پر امی جان ان پر مہربان تھیں۔ مگر باقی اولاد سے بھی وہ لاپروا نہیں تھیں۔ پھر جانے کیسے اس نے یہ سمجھ لیا۔''

''پھر کیا تم لوگوں نے اسے احساس نہیں دلایا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔''

''جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ نشہ کرنے لگا ہے تو ہم نے اسے واپس لانے کی بہت کوشش کی مگر بے کار۔ ہماری ساری محبتیں بھی اسے واپس نہ لا سکیں۔ وہ ایسا روٹھا کہ منائے نہ من سکا۔'' سمن نے گہرا ٹھنڈا سانس لیا۔

''ہاں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں' جو ناکافی محبتوں پر نہیں جی سکتے۔ انہیں بھرپور اور مکمل محبتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' جبران نے کہا۔ ''شاید نوید، تمہارا بھائی بھی ایسا ہی تھا۔ اسے ماں باپ کی محبتوں میں بہن بھائیوں کی شرکت بھی گوارا نہ تھی۔''

''ہاں شاید'' سمن نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''مگر ہم اس کی طلب کی وسعت سے آگاہ نہ تھے۔ ورنہ شاید اسے اس کی طلب سے سوا ہی مل جاتا۔''

جبران کا جی چاہا پوچھے۔ ''کیا محبتیں مانگنے سے مل جاتی ہیں اور کیا مانگنے کی محبتیں بھی بے طلب محبتوں جیسا مزہ رکھتی ہیں۔'' مگر وہ سمن کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

اور سمن جو اپنے ہی دھیان میں ڈوبی کسی سوچ میں گم تھی، اس کی آنکھوں میں جلتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے چراغوں کو نہ دیکھ سکی اور اس دن گھر آ کر جبران نے اپنی بہن عالیہ کو چپکے سے بتایا۔

"سنو عالی یہ جو تمہارا بھائی ہے نا جبران واسطی۔ یہ کچھ انوکھے سے سنہرے روپہلے خواب دیکھنے لگا ہے۔ اور اسے سانولی سلونی سی لڑکی اچھی لگنے لگی ہے۔ ساری دنیا کی لڑکیوں سے اچھی۔"

عالیہ کو معصومیت سے اعتراف کرتے جبران پر بے حد پیار آیا۔

"اچھا تو پھر میں کہوں، امی جان سے کہ صاحبزادے کے گلے میں لگام ڈال دیں۔ بہت پھر چکے بے مہار؟" عالیہ نے شرارت سے پوچھا۔

"ارے نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" جبران نے جلدی سے وضاحت کی۔ "میں تو اپنے خوبصورت راز میں کسی کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ اپنی پیاری بہن کے ساتھ اپنی خوشیاں شیئر کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میری منزل تو ابھی بہت دور ہے۔ جب تک میں کسی مقام تک نہ پہنچ جاؤں۔ ایسا سوچنا بھی بے کار ہے ہاں اگر کبھی امی جان میرے متعلق سوچیں تو پھر تم امی جان تک میری خواہش پہنچا دینا۔"

"ایک شرط پر۔" عالیہ نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"مجھے پہلے بتائیں کہ وہ کون ہے، کیسی ہے، کہاں ہے اور؟"

"بس بس۔ وہ ایک لڑکی ہے اور بہت اچھی اور اسی دنیا میں ہے۔" جبران نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ "ویسے تم نے اسے دیکھا ہوا ہے۔"

"اچھا کب، کہاں؟" وہ مارے اشتیاق کے اچھل پڑی۔

"یہیں، اسی گھر میں۔" جبران نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں، شادی میں اتنی بہت ساری لڑکیاں آئی ہوئی تھیں، اب مجھے کیا پتا سمن کون ہے؟" وہ جھنجلا گئی۔ "آپ بس مجھے اس سے ملوائیں۔ جلدی۔"

"اچھا ملواؤں گا مگر ابھی کسی سے کہنا نہیں۔" جبران نے تاکید کی۔

مگر وہ خود الجھن میں پڑ گیا تھا۔ ابھی تک تو اس نے اپنے جذبوں کو سمن پر آشکار ہی کیا بھی نہیں تھا۔ مگر کیا واقعی وہ بے خبر تھی۔ سمن پر نگاہ پڑتے ہی جبران کی آنکھوں میں جو روشنیاں اتر آتی تھیں کیا اس کی نظروں سے پوشیدہ تھیں؟ اس کی لو دیتی آنکھوں کی تاب نہ لا کر سمن کی نگاہیں جھک جاتیں اور اس کے رخساروں پر انار کی کلیاں سی کھل اٹھتیں۔ جبران کہیں گم سا

ہونے لگتا، کھو جاتا۔ سب کچھ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور صرف پرکشش آنکھوں والی سمن رہ جاتی جو دھیمے دھیمے مسکراتی جانے کیوں گلابی ہو جاتی۔ اور جبران بے اختیار سا ہونے لگتا۔ اس کا جی چاہتا، وہ سمن سے کہے۔

"سنو سمن، یہ میں ہوں، جبران واسطی۔ جس نے اپنا خوبصورت دل تمہارے سامنے ہار دیا ہے۔ میں جو ہمیشہ فاتح رہا ہوں، مفتوح ہو چکا ہوں۔ اب کیا اپنے شہر دل میں مجھے تھوڑی سی جگہ دو گی؟"

مگر وہ اپنے آپ کو روک لیتا۔ اپنے جذبوں پر پہرے بٹھا دیتا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک اپنے جذبوں کو عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک کسی مقام پر نہ پہنچ جائے۔ اس لیے اس نے اپنے جذبوں کو کسی خوبصورت بھید کی طرح اپنے دل میں نہاں رکھا۔ مگر کہیں کوئی خوشبو کو بھی اسیر کر سکا ہے۔ سمن کے مسکراتے ہونٹ اور جبران کی جگمگاتی آنکھیں اَن کہا بھید کہے دے رہی تھیں۔ جذبے کبھی اظہار کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ سمن بھی بن کہے جبران کے دل کی بات جان گئی تھی۔ سمن پر نگاہ پڑتے ہی جو بے اختیاری کیفیت جبران پر طاری ہوتی اور جس طرح سمن کے رخساروں پر گلاب سے کھل اٹھتے وہ دیکھنے والوں کی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے۔ کالج والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ایک خوبصورت کہانی جنم لے چکی ہے مگر جبران کا حد درجہ محتاط رویہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیتا تھا۔

اس دن وہ پیریڈ اٹینڈ کر کے باہر نکلا تو سر امین نے اسے روک لیا۔

"کیا بات ہے بھئی۔ بہت دنوں سے آئے نہیں۔ کیا ناراض ہو؟"

"نہیں سر۔" وہ شرمندہ ہونے لگا۔ "یونہی بس مصروفیت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔"

"کیسی مصروفیت۔" انہوں نے عینک کے پیچھے سے گھورا۔

"یہی سر پڑھائی اور کچھ فنڈ وغیرہ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ۔"

"اچھا وہ جو انسداد منشیات کی انجمن تھی۔ اس سلسلے میں۔"

"جی سر۔" جبران نے سعادت مندی سے کہا۔

پروفیسر امین نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔

"خطرناک کام ہے میاں سنبھل کر رہنا۔ تم نے سنا ہو گا، شیر سدھارنے والا کبھی کبھی خود بھی شیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور سانپ پکڑنے والا بعض اوقات سانپ کے کاٹے سے مرتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔"

"سر یہ آپ میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں یا حوصلہ شکنی۔"

جبران کی ذہین آنکھوں میں الجھن تھی۔

"اور سر میں تو آپ سے استدعا کرنے والا تھا کہ آپ بھی اس سلسلے میں ہمارا ساتھ دیں۔ سر حسن کی طرح۔ اس طرح ہماری حوصلہ افزائی ہو گی۔"

"خوب...... حوصلہ ہے تو ستاروں کے علم لہراؤ۔ مگر بہت اونچی اڑان اڑ رہے ہو میاں۔ ایسا نہ ہو کہ منہ کے بل زمین پر آ رہو۔"

"سر، بازوؤں میں طاقت اور دل میں حوصلہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ آدمی منہ کے بل گرے اور سر میرے پاس بھی حوصلے اور طاقت کی کمی نہیں۔"

"خدا تمہاری مدد کرے میاں۔ ویسے صرف یہی مصروفیت تھی یا کچھ اور بھی۔" سر امین کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شاید ان تک بھی سمن کی کہانی پہنچ چکی تھی۔ خوشبو کے پر نہیں ہوتے مگر وہ ہواؤں کے دوش پر بہت دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ جبران کے دل کو مہکانے والی خوشبو بھی پابند نہ رہ سکی تھی۔

"نہیں سر اور تو کوئی بات نہیں۔" جبران نے سر امین کے انداز پر چونک کر صفائی پیش کی۔

"اچھا واقعی۔ مگر تمہارے یہ متبسم لب، چمکتی آنکھیں اور سرشاری کیفیت تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔"

"سر...... سر ایسی باتیں نہ کریں۔" وہ جھینپ سا گیا۔

"قصور تمہارا بھی نہیں میرے عزیز۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ لا ابالی، جذباتی اور خواب دیکھنے والی۔ جب سارے موسم اپنی دسترس میں لگتے ہیں اور سارے خواب پورے ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ جی کو کوئی روگ نہ لگا لینا میاں۔"

"سر اب میں کیا کہوں۔" وہ ادھر ادھر راہ فرار ڈھونڈ رہا تھا۔

"نہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری آنکھوں میں جلتے چراغ سب کچھ کہے دے رہے ہیں۔"

سر امین کی آنکھوں میں زہر سا گھل رہا تھا۔ مگر شاید جبران ان کی طرف دیکھ نہیں رہا

تھا۔

"اچھا بھئی، کبھی کبھی آتے رہا کرو، عادت سی پڑ گئی ہے تمہاری۔ تم نہ آؤ انتظار سا رہتا ہے۔ اور بھئی یہ محبوبوں والے انداز میرے ساتھ نہ آزماؤ۔ استاد ہوں تمہارا۔" وہ جاتے جاتے ہلکا سا طنز کر گئے۔

جبران محجوب سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

جبران کافی دنوں کے بعد سر امین کے ہاں گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اسے اپنے ساتھ لگائے لگائے ڈرائنگ روم میں آئے۔

"بڑے دنوں کے بعد آئے میاں۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"ویسے آج میں تمہیں بلوانے والا تھا۔"

"کیوں سر...... کیا کوئی کام تھا مجھ سے؟" جبران نے پوچھا۔

"کام ہی سمجھو۔" سر امین اب جال کی ڈوریوں کو کس رہے تھے۔ "بات یہ ہے کہ ہر جمعے کی شام کو میرے یہاں کچھ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، کچھ اہل علم حضرات، دانشور، ادیب، شاعر صحافی وغیرہ۔ ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران مختلف موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ اور سب اپنے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی ان محفلوں میں شریک ہوا کرو تاکہ تمہارے ذہن کو جلا ملے۔"

"شکریہ سر۔ یہ تو میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔" جبران نے خوش ہو کر کہا۔ اسے ہمیشہ سے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں سے ملنے کا شوق تھا۔ خوبصورت لفظوں کے موتی پرونے والے خوبصورت ذہن اسے بہت اپیل کرتے تھے۔

اس محفل میں وہ کئی مشہور و معروف ہستیوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ان میں سے ایک مشہور صحافی صدیقی جالبی' تھے جو ایک معروف انگریزی روزنامے سے وابستہ تھے۔ آج کل ان کے بے لاگ سیاسی تبصروں نے خاصی دھوم مچا رکھی تھی۔ پھر کالم نگار حیدر علی تھے' جن کے طنزیہ و مزاحیہ کالم وہ کام کر دکھاتے تھے' جو بڑے بڑے سنجیدہ مضامین بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہنستے مسکراتے، میٹھی میٹھی چٹکیاں لیتے وہ کوئی ایسی سنجیدہ بات کہہ جاتے تھے جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ طنز نگاری کے میدان میں انہوں نے اپنا آپ منوا لیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنل جواد احمد تھے' جو پولو کے بہترین کھلاڑی تھے اور ایک عالم سے اپنی مہارت کا لوہا منوا چکے تھے۔ اور ڈاکٹر مستجاب رضوی تھے' جن کے کئی سفرنامے مقبولیت عام حاصل کر چکے تھے۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ وہ یہ سفر اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے طے کرتے ہیں اور چونکہ یہ سفرنامے انہوں نے ڈرائنگ روم میں محض تخیل کے سہارے تخلیق کیے ہیں اس لیے زیادہ داد کے مستحق ہیں۔

پھر مشہور و معروف رائٹر اور شاعر وارث علوی تھے جو کمیونزم کے زبردست حامی تھے۔ کچھ لوگ انہیں "سرخا" کہتے تھے اور بعض تو کھلم کھلا انہیں روس کا پٹھو کہتے تھے۔

یہیں اس کی ملاقات تیزی سے ابھرتے ہوئے سیاسی لیڈر سکندر نواز سے ہوئی۔ بظاہر وہ حکومت کی ایک مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا تھا مگر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ ملک دشمن عناصر سے ملا ہوا ہے۔ ملک کے کسی گوشے میں کوئی معمولی سا واقعہ بھی رونما ہو جاتا تو وہ اسے لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے کے لیے فوراً استعمال کرتا۔ مشہور تھا کہ اگر کہیں راہ چلتے دو افراد بھی آپس میں ٹکرا جائیں تو اسے فرقہ وارانہ رنگ دے کر لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے کے لیے وہ ید طولیٰ رکھتا تھا۔ عام لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ایک مخصوص طبقے میں اس کی پذیرائی کی جاتی تھی۔

اور یہیں وہ ذوالفقار زلفی سے متعارف ہوا۔ زلفی کا نام جبران نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔ وہ ایک باصلاحیت نوجوان شاعر تھا' جس نے بہت جلد معروف شاعروں کی ٹولی میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ اس کے متعلق ایک افواہ یہ بھی گردش کرتی رہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہیروئن کے کاروبار میں ملوث ہے' مگر اس کے ہمدردوں کا کہنا تھا کہ ذوالفقار احمد زلفی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر یہ افواہ کسی دل جلے نے پھیلائی ہے۔

سر امین نے بطور خاص جبران کا تعارف اس سے کروایا۔ "یہ ذوالفقار احمد زلفی ہیں' ان کا نام یقیناً تم نے سنا ہوگا۔ شعر کہتے ہیں اور نئے نئے جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ اور یہ ہے' میرا ہونہار شاگرد جبران واسطی۔ انسداد منشیات کے سلسلے میں خاصا کام کر رہا ہے ویسے بھی بہت باصلاحیت نوجوان ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' خوب نبھے گی۔" زلفی نے گہری چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "یوں بھی مجھے ایک اچھے دوست کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ بہت خوشی ہوئی مل کر۔"

"مجھے بھی۔" جبران نے خوش دلی سے کہا۔

اسے ان بڑے شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں کچھ الجھن سی ہو رہی تھی۔ زلفی کا دم اسے غنیمت محسوس ہوا۔

وہ ایک بے تکلف سا شخص تھا اور لوگوں کو گرویدہ کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس لیے اس نے ذرا بھی جبران کو اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیا اور سارا وقت اپنے ساتھ لیے رہا۔ جبران کو اس کی خوش خلقی نے خاصا متاثر کیا۔ اور دل ہی دل میں اس کا ممنون بھی ہوا۔ اس رات جب سب جا چکے اور زلفی جانے کے لیے اٹھنے لگا تو پروفیسر امین نے پوچھا۔

"کیوں میاں زلفی یہ لڑکا جبران تمہیں کیسا لگا؟"

"اچھا ہے...... ذہین اور خوش کلام۔"

"ہاں یہ لڑکا جبران بہت ذہین ہے اور باصلاحیت ہے مگر میں اسے چت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا ہے اور ساری دنیا فتح کرنے کے خواب دیکھتا ہے اور میں جانتا ہوں اگر یہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔"

"تو پھر؟" ذوالفقار احمد زلفی نے گویا تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"تو پھر یہ ضروری نہیں کہ اس کے خواب پورے ہوں۔" پروفیسر امین کی آنکھوں میں جیسے بہت سے سانپوں نے پھن کاڑھ لیے ہوں۔

زلفی چند ثانیے ان کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"اور وہ انجمن انسداد منشیات۔"

پروفیسر امین نے قہقہہ لگایا۔

"سمجھتا نہیں کن لوگوں سے ٹکرا رہا ہے۔ حوصلے تو اتنے بلند کہ ڈرگ مافیا سے پنجہ لڑانے کو تیار ہے۔ حالانکہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا کسی کا۔ مگر پریشانی کا باعث تو بن سکتا ہے۔" انہوں نے رک کر زلفی کو دیکھا۔

"امین صاحب۔" زلفی بے اختیار ہنس دیا۔ "کچھ لوگ بگاڑنے کے لیے نہیں، کچھ سنوارنے کے لیے اس میدان میں آتے ہیں۔ بڑے بڑے دعوے لے کر اور پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ سب بچوں کے شغل ہیں جناب۔ وقت گزاری کا ایک طریقہ اور کل کا چھوکرا یہ کیا کسی کا کچھ بگاڑ لے گا۔ اس کے منہ سے تو ابھی دودھ کی بو آ رہی ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہر حال آج کی محفل بہت دلچسپ رہی اور آپ سے گفتگو بھی۔"

زلفی اجازت لے کر اٹھ گیا تو پروفیسر امین کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھلنے لگی۔ اور جانے کیوں دیر تک وہ مسکراتے رہے۔

☆☆☆

جانے کیا بات تھی اس دن ثمن بہت خاموش، اداس بلکہ کسی قدر برہم نظر آ رہی تھی۔ جبران کو دیکھ کر بھی نہ اس کے چہرے پر گلابیاں چمکیں اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں جگنو جھلملائے۔ جبران نے اس کے اترے چہرے کو بغور دیکھا۔

"کیا بات ہے ثمن! کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"جھگڑا ہو گیا ہے میرا نمو سے۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "چھوٹی بہن ہے میری مگر خود کو بقراط سمجھنے لگی ہے۔"

"اچھا...... اتنی جھگڑالو تو تم لگتی نہیں۔ ویسے۔"

وہ خاموشی سے فائل گھٹنوں پر رکھے پھول کی ایک ایک پتی کو نوچتی رہی۔

"اس پھول کا کیا قصور ہے بھئی۔ مت ظلم ڈھاؤ غریب پر۔" جبران نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"سنو تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں آتی ہوں۔ نہیں بلکہ اپنے نام نہاد منگیتر کا انتظار کر رہی تھی۔ جو اعلیٰ تعلیم کے بہانے کہیں امریکہ میں سیٹل ہو گیا تھا اور جب بھی اسے شادی کے لیے پاکستان بلایا جاتا تھا، وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اگلے سال پر ٹال جاتا تھا۔ سو مجھے اپنے وقت کا بہترین مصرف یہی نظر آیا کہ تعلیم جاری رکھوں۔" ثمن کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

پل بھر کے لیے جبران ساکت سا ہو گیا۔ اس کی نظروں میں زمین و آسمان گھوم گئے ثمن...... اس کا منگیتر...... مگر پہلے تو اس نے کبھی بتایا نہیں...... اس کا ذہن جیسے ہواؤں میں قلابازیاں کھا رہا تھا، تو میں نے کب اپنے جذبوں کو اس پر عیاں کیا، نہ کوئی خوبصورت پیمان، نہ کوئی حسین خواب، پھر وہ کس امید میں؟ ثمن پر کسی وعدے کا کوئی بوجھ نہیں۔ سارے خواب میں نے تنہا ہی دیکھے اور سارے پیمان میں نے اپنے آپ سے ہی کیے پھر بھلا ثمن کا کیا

قصور۔

جبران کے دل میں عجیب سی مایوسیاں گھر کر رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے تھا جیسے میرے پاؤں کے نیچے موم ہے جو کسی بھی لمحے پگھل جائے گی۔" وہ جبران کے احساسات سے بے خبر، بغیر اس کی طرف دیکھے دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔ "اور میں تاریک خلاؤں میں جھولتی رہ جاؤں گی۔ بے دست و پا، بے یارو مددگار۔ وہ یونہی سال پر سال گزارتا چلا جائے گا اور میری عمر کے سنہرے سال میرے ہاتھوں سے پھسل جائیں گے پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا بھلا؟ عدم تحفظ کا احساس، لوگوں کی تمسخرانہ باتیں اور زہر میں بجھی ہوئی ہمدردیاں۔" اس کے لہجے کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیوں میں ایسے شخص کی منتظر رہتی' جسے میں نے دیکھا تک نہ تھا۔ جس کے مزاج تک سے میں نا آشنا تھی۔ آخر کس لیے میں انتظار کی صلیب پر لٹکتی رہتی۔ ایک موہوم امید میں۔ چنانچہ میں نے کسی کو بتائے بغیر پہلی بار اسے خط لکھا اور غالباً آخری بار بھی۔"

ثمن نے ایک گہری سانس لی۔

"میں نے اسے لکھا۔"

"دیکھو، مجھے لٹکاؤ مت۔ میں نے تمہارا تو کچھ نہیں بگاڑا پھر یہ سزا کیسی۔ اگر بوجھ سہارنے کا حوصلہ نہیں تو رسی کاٹ دو۔ اور مجھے ان دیکھے بندھنوں سے آزاد کر دو۔"

"پھر؟" جبران سانس روکے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شاید میری جرأت اسے بھی حوصلہ عطا کر گئی۔" ثمن کی آواز مزید مدھم پڑ گئی۔

"اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ شادی کر چکا ہے اور اس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔ اور اس نے گھر والوں کو بھی خط لکھ دیا۔"

جبران نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔

کچھ دیر تک خاموشی ان کے درمیان نرم رو ندی کی طرح بہتی رہی، دل کے انجانے تاروں کو چھیڑتی کچھ کہتی، گنگناتی بولتی خاموشی۔

"اور اب نمو رشتہ لے کر آئی ہے اپنے جیٹھ کا جو رنڈوا ہے اور چار بچوں کا باپ بھی۔ اور اس پر اصرار کہ اس سے بہتر رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔" ثمن کے لہجے میں غصہ آگ کی طرح سلگ رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ نمو شادی شدہ ہو کر اپنے آپ کو بڑی افلاطون سمجھنے لگی ہے۔ میری بزرگ میں نے کہہ دیا ہے کہ تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی یوں بھی گزاری جا سکتی ہے اور شاید زیادہ بہتر۔"

اس کے لہجے میں غم و غصے کے علاوہ جھنجھلاہٹ بھی تھی۔ شاید اپنی ناقدری یا غیر یقینی مستقبل کے احساس سے۔

"ارے...... ارے نہیں بھئی کوئی ایسی ویسی بات نہ سوچ لینا۔ ورنہ میں غریب تو مارا جاؤں گا بے موت۔"

جبران نے شگفتگی سے کہا۔

"ایں۔" سمن ششدر سی اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔" جبران کے لہجے میں نئے موسموں کی نوید تھی۔ "کیا تمہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں؟ تجاہل عارفانہ سے کام نہ لینا۔ جو گلاب میرے دل کو مہکا رہا ہے اس کی خوشبو یقیناً تم تک بھی پہنچی ہو گی۔"

سمن کی نگاہیں جھک گئیں۔

"میں اسے اپنی خوش فہمی سمجھتی رہی اور ایک ناقابل تعبیر خواب۔ کوئی خوش آیند سپنا اور سپنا تو سپنا ہی ہوتا ہے آخر۔" سمن نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

"اُفوہ سمن تم نے یہ کیسی سوچیں پال رکھی ہیں؟" جبران نے حیران سا ہو کر اسے دیکھا۔

"اور یہ تم خودترسی میں کیوں مبتلا ہو رہی ہو۔ آخر کیا کمی ہے تم میں۔ ارے تم تو دلوں کو تسخیر کر سکتی ہو اور سلطنتوں کو...... پھر بھلا میں بے چارہ کس شمار قطار میں ہوں۔ میرا بے چارہ معصوم دل تو کب کا ان سیاہ زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے اور تم ہو کہ کوئی احساس نہیں۔"

"تم۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

"ایک روشن مستقبل تمہارے سامنے ہے اور میں ایک رجیکٹیڈ لڑکی۔ پلیز، مجھے ایسے خواب نہ دکھاؤ جن کی تعبیر کوئی نہیں ہوتی۔" وہ شاید مایوسی کے انتہائی سرے پر کھڑی تھی۔

"میں خود تمہارے خواب کی تعبیر بنوں گا سمن۔ نرم جذبات نے جبران کی آنکھوں میں اجالے سے بھر دیے۔" تم میرا یقین تو کرو..... اس بے یقینی کی کیفیت سے نکلو۔ آخر تمہیں ذرا

کیا ہے؟"

"نہ میں خوبصورت ہوں اور نہ بہت زیادہ ذہین۔ اور نہ میرے پاس دولت کی بیساکھی ہے۔ پھر میں کس برتے پر کوئی خواب دیکھوں۔" سمن کے انداز میں بے بسی تھی۔

"دولت وہ ترازو نہیں جس پر انسانوں کو تولا جائے۔"

جبران نے نرمی سے کہا۔ "کچھ جذبے بہت قیمتی، بہت انمول ہوتے ہیں اور یہ تم سے کس نے کہا کہ تم خوبصورت نہیں۔ ذرا میری آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھو تو سہی۔ ہے اس پوری دنیا میں کوئی تمہارے برابر۔ تم چاہو تو اس پوری کائنات کو اپنی بانہوں میں لے لو اور میرے دل کی کائنات تو ہے ہی تمہارے قبضے میں۔ اچھا میری آنکھوں میں جھانک کر ذرا سچ بتاؤ۔ کیا تمہیں پوری دنیا اپنی دسترس میں نہیں لگتی۔"

جبران کی آنکھوں کی نرم نرم سی کیفیت عجیب پگھلا دینے والی تھی۔

سمن کے رخسار گلابی ہونے لگے مگر وہ ابھی تک خود رحمی کے حصار میں تھی۔

"اور جب تم کسی مقام پر پہنچو گے تو کسی اونچے خاندان کی بہت دولت مند، بہت حسین لڑکی سے شادی کر لو گے اور تمہیں خیال تک نہ آئے گا کہ تم نے کبھی کسی سے کوئی وعدہ بھی کیا تھا۔ نہیں مجھے اپنے وعدوں کے حصار میں مت جکڑو۔ ایک اور خوبصورت فریب، ایک اور ادھورا خواب۔"

"تمہیں کس قسم کی یقین دہانی چاہیے سمن۔" جبران سنجیدہ ہو گیا۔ "کیا تمہیں سچ کی پہچان نہیں؟ اچھا تو میں آج ہی امی جان کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔ پھر نہ کہنا کہ تعلیم ادھوری رہ گئی۔"

اسے سچ مچ ملال ہو رہا تھا کہ سمن اسے پہچان نہ سکی۔

تو اس کے جذبے اتنے ہی بے اثر تھے۔ سمن نے سر اٹھایا تو اس کے لبوں پر دبی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں طمانیت کے سارے رنگ۔

"واقعی تم سچ کہتے ہو۔ میں خود رحمی میں مبتلا ہو رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی یقین دہانی کی ضرورت نہیں۔ میرا یقین تو تم ہو۔"

خوشی کے گہرے احساس سے جبران نے ایک طمانیت بھرا سانس لیا۔

"سمن، میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ بس یوں سمجھو کہ تمہارے بنا میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادھورا ہوں، نامکمل...... اور تم میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو۔"

جبران کی آنکھوں میں دیے سے جل رہے تھے اور اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے۔" سمن کے رخساروں پر رنگ سا دوڑ گیا۔" جذبے اظہار کے محتاج نہیں ہوتے۔ پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تم اپنے آپ کو چھپا لوگے۔ ارے تم تو پورے کے پورے عیاں ہو میرے سامنے۔ اپنے سارے جذبوں اور سوچوں سمیت۔" سمن نے جبران کی صاف شفاف بے ریا آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

اور جبران اپنے آپ میں گم' جانے کیا کیا سوچ سوچ کر مسکراتا رہا۔

✦

اس دن جبران کالج سے لوٹا تو گھر میں رونق دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔ پھر اس کی نظر عثمان بھائی اور زوبی بھابی پر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

"ارے زوبی بھابی آپ...... جی خوش کر دیا آپ نے اچانک آ کر۔ ہم سب آپ کے لیے بے پناہ اداس تھے۔"

"اچھا واقعی۔" عثمان بھائی نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔" اداس تو ہم بھی بہت تھے ویسے مجھے انتظار تھا کہ شاید کبھی تم چکر لگاؤ۔"

"کیا اسے تو میرے گھر تک آنے کی فرصت نہیں۔" کمرے سے باہر آتی ہوئی فریحہ نے ناراضگی سے کہا۔

"ارے بجیا آپی آپ۔ آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں ہمارے ہاں۔"

"جی ہاں ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔" جواد بھائی کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر سے اخبار کے پیچھے سے برآمد ہوتے ہوئے بولے۔

"پھر تو واقعی جشن منانا چاہیے جواد بھائی۔ سچ کتنی خوشی ہو رہی ہے آپ سب کو یہاں دیکھ کر۔"

"رہنے دو۔ یاد ہے، کتنے دنوں بعد صورت دکھا رہے ہو۔" بجیا بہت خفا تھیں۔

"وہ دراصل پڑھائی میں مصروف تھا نا۔ اچھا ناراض نہ ہوں اب روز روز آیا کروں گا۔ سچ پکا وعدہ۔ کیوں جواد بھائی آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں نا؟"

"نہ نہ، اعتراض کیسا ضرور آؤ، بار بار آؤ۔" انہوں نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔" بھئی ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔"

"واہ جواد بھائی، جی خوش کر دیا آپ نے تو۔" جبران بے ساختہ ہنسا۔" بہرحال، نوازش کرم، شکریہ، مہربانی۔"

"حضرت کھانا تیار ہے اور نادیہ آپی میز سجائے آپ سب کی منتظر ہیں۔" عالیہ نے چہکتے ہوئے اطلاع دی۔

"ارے ہاں۔" جواد بھائی سیدھے ہو بیٹھے۔" تبھی میں سوچ رہا تھا کہ یہ پیٹ میں اچھل پھاند سی کیا ہو رہی ہے۔"

"جواد بھائی۔ آپ ڈاکٹر تو کہیں سے لگتے نہیں۔" عالیہ ہنسی۔" ویسے آپس کی بات ہے، آپ کہیں جانوروں کے ڈاکٹر تو نہیں رہے۔"

"ہاں، یاد نہیں۔ پچھلے سال تمہارا علاج کیا تھا۔" جواد کا لہجہ رازدارانہ تھا۔

عثمان بھائی بے ساختگی سے ہنسے تو عالیہ جھینپ گئی۔

"رہنے دیں جواد بھائی، آپ بھی بس، چلیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

کھانے کی میز پر ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہی۔ پھر عالیہ چائے بنا لائی۔ اور سب کو سرو کرنے لگی۔

"عثمان بیٹے۔" امی جان نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے عثمان کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے بلایا ہے۔"

"جی امی جان۔ فرمائیے۔" عثمان نے سعادت مندی سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ نادیہ کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ لڑکا کیپٹن ہے اور اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے اور تمہارے ابو کو تو لڑکا اچھا لگا ہے۔ لوگ بھی اچھے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں بھائی اور بیٹا جواد لڑکے سے اور اس کے گھر والوں سے مل لو۔ اور پھر اپنی رائے دو۔"

"امی جان آپ اور ابو جان بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔" عثمان بھائی نے مؤدب ہو کر کہا۔

"پھر بھی بیٹا تم لوگ زیادہ بے تکلفی سے ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے ہو اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیادہ بہتر جانچ سکتے ہو۔ آج شام میں نے ان سب کو چائے پر بلایا ہے۔ تم ان سے مل بھی لینا اور دیکھ بھی لینا۔ اور دیکھ بھی لینا پھر ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے امی جان۔ آپ بے فکر رہیں۔" عثمان نے اطمینان دلایا۔

دنوں بعد سب ملے تھے۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھیں۔ پھر امی جان نے ہی انہیں ٹوکا کہ بھائی، بھابی سفر کر کے آئے ہیں۔ انہیں تھوڑا آرام کرنے دو۔ پھر شام کو بھی مصروفیت ہوگی۔

پھر شام کو وہ لوگ آئے تو عالیہ پل پل کی خبریں نادیہ تک پہنچانے لگی۔

"اللہ نادیہ آپی۔ دولہا بھائی اتنے خوبصورت ہیں کہ بس دیکھے جاؤ۔"

"ابھی سے کیسے دولہا بھائی۔ جانے بات طے ہو نہ ہو۔" نادیہ نے بلش ہو کر کہا۔

"بات بھی طے ہو جائے گی انشاء اللہ فکر نہ کریں۔"

"ہوں، مجھے کاہے کی فکر۔"

نادیہ جھینپ گئی۔ عالیہ پھر ڈرائنگ روم کی طرف لپکی۔

"باتیں بھی بڑی خوبصورت کرتے ہیں کیپٹن صاحب۔ کیا ویل ڈریسڈ آدمی ہیں' خوش مزاج اور شائستہ۔"

واپس آ کر اس نے بتایا۔

"اور ان کی امی جان کیا باغ و بہار شخصیت ہیں۔ بات بات پہ پھلجھڑیاں چھوڑ رہی ہیں۔ اللہ' نادیہ آپی آپ تو دن بھر ہنستی رہا کریں گی، بات بے بات۔"

وہ لپک جھپک کر اطلاعات فراہم کر رہی تھی۔

"پتا ہے آپی آپ کے ہونے والے سسر سابقہ کرنل ہیں۔ ریٹائرڈ کرنل جان محمد۔ گویا......

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

آپ تو سارا دن مارچ ہی کرتی رہیں گے۔ باپ بیٹے کے آرڈر پر لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ۔"

وہ پھر جانے لگی تو نادیہ نے اسے پکڑ لیا۔

"یہ جا کہاں رہی ہو بنو۔ ذرا ٹرالی میں چیزیں تو لگاؤ' میں جب تک چائے دم دے

لوں۔"

"آف نادیہ آپی آپ نے اتنی سی دیر میں اتنا سارا انتظام کر لیا۔ بڑا خیال ہے سسرال والوں کا۔"

"میں نے تو صرف شامی کباب، پکوڑے اور فرنچ رولز ہی بنائے ہیں۔ یہ سارا بازار تو جبران اٹھا لایا۔" نادیہ نے بتایا۔

"چلو اچھا ہوا، تمہاری ساس صاحبہ کھانے پینے کی خاصی شوقین لگتی ہیں۔ سرخ و سفید گول مٹول سی سارا دن تمہیں کچن میں ہی گھسائے رکھیں گی۔ بہو رانی ذرا شامی کباب تو تل دو۔ دل چاہ رہا ہے کھانے کو۔ چندا تمہارے ہاتھ کے فرنچ رولز بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ ذرا بنا لو جلدی سے' ان کی عادتیں خراب نہ کر دینا، مزے مزے کی چیزیں کھلا کر۔" وہ جلدی جلدی ٹرالی میں چیزیں لگاتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

"تمہیں بھی تو کھلاتی ہوں مزے مزے کی چیزیں۔ انہیں کھلا دیں تو......"

"اچھا ابھی سے اتنی طرف داری، خبردار جو کچھ پکا کر کھلایا تو۔" اس نے ٹرالی دھکیلتے ہوئے گھورا۔ نادیہ ہنس پڑی۔

"پگلی ہے بالکل یہ عالیہ بھی۔" نادیہ نے پیار سے جاتی ہوئی عالیہ کو دیکھا۔

کچن بند کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ آج شاید اس کی زندگی کا فیصلہ ہو جائے۔ جانے کیا باتیں ہو رہی ہوں گی اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ یہ عالیہ پھر نہیں آئی پتا نہیں عثمان بھائی اور جواد بھائی کی کیا رائے ہے۔ اللہ جانے کیسے لوگ ہیں۔ عالیہ تو بڑی تعریف کر رہی ہے۔ ویسے خواہش مند کافی لگتے ہیں، کتنے چکر لگا چکے ہیں۔"

عالیہ دوڑی دوڑی آئی۔

"آپی وہ جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ آپ بھی ذرا ایک نظر دیکھ لیں اپنے کیپٹن کو۔ اللہ کیا مخمور آنکھیں ہیں کہ پوری کائنات ڈوب جائے ان آنکھوں میں......

سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا پھر پٹ بند کر کے اس میں ذرا سی جھری رکھی۔ آنکھ جھری سے لگا کر باہر جھانکا۔ پھر جیسے مطمئن سی ہو کر پلٹی۔

"آپی ادھر آئیں۔" وہ اس کھینچتی ہوئی کھڑکی تک لائی۔ نادیہ نہ نہ کرتی رہ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اچھا، مجھے پتا ہے اوپر سے نہ نہ کر رہی ہیں۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے دیکھ لیجئے گا چپکے سے۔" وہ دروازے بند کر کے چلی گئی۔ نادیہ پل بھر دھک دھک کرتے دل کو سنبھالے کھڑی رہی۔

ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے ہاں مگر کوئی ادھر نہ آ جائے۔ اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی سے آنکھ لگا دی۔ عثمان بھائی، جواد بھائی، امی جان، ابو جان سب انہیں رخصت کر رہے تھے۔ عالیہ اور فریحہ ایک کامنی سی لڑکی سے باتیں کر رہی تھیں، غالباً بہن تھی کیپٹن ندیم کی۔ ندیم سب کے ساتھ چلتا شاید دانستہ پیچھے رہ گیا۔ اس نے ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی پھر اس کی نظر اس کھڑکی پر جم گئی جہاں جھری سے آنکھ لگائے نادیہ کھڑی تھی۔ وہ دلآویزی سے مسکرایا۔ سر کو ذرا سا خم کر کے گویا سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ لمحہ بھر کی بات تھی شاید مگر لمحہ بھر ہی میں گویا دنیا بدل گئی۔ نادیہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ انہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں...... اور وہ مدھ بھری آنکھیں' فروزاں فروزاں، روشن چراغوں جیسی، پل بھر میں اسیر کر لینے والی جادوگر آنکھیں، کوئی بچ سکتا تھا بھلا ان کے سحر سے۔ نادیہ کی تو پوری کائنات ہی ڈول گئی تھی ان آنکھوں میں، دیر تک وہ سحر زدہ اپنے دھک دھک کرتے دل کو سنبھالے ہلکان ہوتی رہی۔

رات آخری فیصلے کے لیے میٹنگ ہوئی۔ امی جان نے فریحا اور جواد کو بھی روک لیا تھا۔ کیپٹن ندیم نے تو پل بھر میں سب کے دل جیت لیے تھے۔ ہر کوئی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا، لڑکا بھی اچھا تھا اور اس کی فیملی بھی' سو باہم مشورے سے انہیں ہاں کہہ دی گئی۔ منگنی پر اگرچہ زیادہ لوگوں کو نہیں بلایا گیا تھا مگر عالیہ نے بطور خاص سمن کو بلوایا۔ اسے بڑی بڑی آنکھوں والی سادہ سی سمن اچھی لگی۔

اس نے نادیہ آپی سے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"نادیہ آپی، یہ جو میری نئی دوست ہے نا سمن۔ اسے ذرا غور سے دیکھ لیجئے گا۔ جبران بھائی کے لیے کیسی رہے گی۔"

"جبران کے لیے؟" نادیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مگر اس قسم کے فیصلے تو بزرگ ہی کریں تو بہتر رہتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے آپی مگر سمن جبران بھائی کو بھی پسند ہے۔ یوں بھی امی جان اور ابو

جان ان سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" نادیہ آپی نے ہنستی ہوئی سمن کو دیکھا۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔ اگرچہ جبران کے مقابل کی نہیں۔ مگر جبران کو پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ زندگی تو اسی نے گزارنی ہے۔" نادیہ نے سوچا۔

پنک شلوار سوٹ میں ملبوس نادیہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ جب اسے لوگوں کے درمیان لا کر بٹھایا گیا تو بے ساختہ بیگم جان محمد نے ماشاء اللہ کہتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

لوگ لڑکے کی طرف سے آئے ہوئے قیمتی جوڑوں اور زیورات کی تعریف کر رہے تھے۔ ہر کوئی نادیہ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ جب انگوٹھی پہنانے کا وقت آیا تو کرنل جان محمد نے نادیہ کے ابو عمران الحسن واسطی کو مخاطب کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔

"یار واسطی اب ہمارا تمہارا زمانہ تو نہیں رہا۔ اب لڑکا اپنے ہاتھوں سے لڑکی کو انگوٹھی پہنانا چاہتا ہے اگر آپ کو اعتراض ہو تو......"

انہوں نے اتنی شائستگی اور اس انداز سے کہا کہ ابو جان انکار نہ کر سکے۔ چنانچہ تالیوں کی گونج میں کیپٹن ندیم نے نادیہ کو انگوٹھی پہنائی اور پھر ابو جان نے کیپٹن ندیم کو پہنائی اور مبارک باد کے شور میں یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

عثمان بھائی اور زوبی بھابی چلی گئیں تو ذرا فراغت نصیب ہوئی۔ جبران پروفیسر امین کے گھر بڑے دنوں کے بعد گیا انہوں نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔

"سر نادیہ آپی کی منگنی تھی۔ عثمان بھائی چند دنوں کے لیے آئے تھے اس لیے بڑے ہنگامی حالات میں یہ منگنی ہوئی۔ بہت مصروفیت رہی۔"

"اچھا مبارک ہو کیا عزیزوں میں منگنی ہوئی ہے۔" انہوں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھا۔

"نہیں سر، عزیزوں میں نہیں۔ کرنل جان محمد شاید آپ جانتے ہوں۔ پولو کے خاصے مشہور کھلاڑی ہیں' ان کے بیٹے کیپٹن ندیم سے۔"

"اچھا وہ بزنس چارمنگ بھی، بہت اچھا لڑکا ہے۔ اور کرنل جان محمد میرے خاصے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ بہترین انسان ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جی ہاں، اچھے لوگ ہیں۔"

"اور سناؤ بھئی اپنے متعلق کب کوئی خوشخبری سنا رہے ہو؟" سر امین کے لہجے میں شرارت بھری شوخی تھی۔

"اپنے متعلق۔" جبران جھینپ گیا۔ "سر ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں تعلیم مکمل ہونے پر دیکھا جائے گا۔"

"ایسا نہ ہو میرے عزیز تعلیم ہی مکمل کرتے رہو اور ڈور ہاتھوں سے پھسل جائے۔ تب تمہیں وقت کے زیاں کا احساس ہو مگر بے فائدہ۔"

مدتوں بعد وہ لفظوں کو چبا کر بول رہے تھے۔

"کیوں سر میری عمر ابھی اتنی زیادہ تو نہیں ہوئی کہ وقت کے زیاں کا احساس ہو۔"

جبران نے الجھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں آخر؟ سچی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کی بات سمجھ ہی نہیں سکا۔"

"یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات۔"

پروفیسر امین نے قہقہہ لگایا۔ "اور رہا وقت کا زیاں تو وہ ابھی تمہاری مٹھی میں ہے مگر ہے بڑا بے مروت، کبھی کبھی نکل بھی جاتا ہے ہاتھوں سے۔"

"سر آپ کی دعا چاہیے بس۔" جبران نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

"ہاں تو ہم دعا بھی کریں گیا ور دوا بھی۔ پر کبھی کبھی دعائیں بھی بے اثر ہوتی ہیں اور دوائیں بھی بے تاثیر۔ وہ تمہارے میر نے نہیں کہا۔"

"الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔"

سر امین عجیب ترنگ میں تھے۔

جبران نے غور سے دیکھا۔ سر امین کے ہنستے لبوں اور کھل کھلاتی آنکھوں کو دیکھا۔

"سر لگتا ہے آج آپ بہت خوش ہیں اسی لیے شاید کچھ۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں کیوں۔" سر امین نے قہقہہ لگایا۔ "یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟"

جبران نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"یہ سر امین کس طرح گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں جو پاس ادب مانع نہ ہوتا تو یقیناً وہ

یہی کہتا۔

"نہیں سر شاید آج میرا ہی ذہن حاضر نہیں۔ جو آپ کی ہر ہر بات الجھی الجھی سی لگ رہی ہے۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"میاں الجھی کیا اور سلجھی کیا۔ بلکہ اب تمہارے تو سارے الجھاوے سلجھ رہے ہیں شاید۔ ویسے آج خوش تو میں ہوں اس لیے کہ آپا بیگم خوش ہیں۔ میں نے ان کی بات مان لی ہے آخر۔"

"سوری سر میں پھر نہیں سمجھا۔"

"بھئی شادی کر رہا ہوں میں۔ آپا بیگم اور بچیاں پیچھے پڑ گئی تھیں میں نے بھی سوچا۔ چلو ان کی خوشی پوری کر دوں۔"

"رئیلی سر۔" جبران نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اسی لیے آپ دوسروں سے خوش خبری سننا چاہ رہے تھے۔"

"ہاں بھئی ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔" وہ ہنسے پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولے۔

"میرے عزیز بات یہ ہے کہ ایک اچھے اور مخلص ساتھی کی کمی تو زندگی میں کبھی کبھی محسوس ہوتی ہی ہے۔ پھر آپا بیگم بھی ٹھیک کہتی ہیں۔ بچیوں کی شادی کے بعد تو بالکل تنہا رہ جائیں گی اور پھر جب زندگی کا ایک بڑا مقصد پورا ہو رہا ہو تو۔" وہ روانی میں کچھ کہتے کہتے سنبھل گئے۔

"میرا مطلب ہے، بچیوں کے رشتے اچھے گھرانوں سے آ رہے ہیں جلد ہی یہ فرض بھی ادا ہو جائے گا۔ اور معین بھی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے قدم بہ قدم۔ سو سب کام ہوتے جا رہیں گے مرحلہ وار مرحلہ۔" انہوں نے طمانیت بھری گہری سانس لی۔

"سر آپ کو آنے والی خوشیاں مبارک ہوں۔"

"تھینک یو ویسے میں سمجھتا ہوں کہ ان خوشیوں پر میرا حق بھی ہے اور اب تو زندگی کی ایک بڑی خواہش بھی۔"

سر امین کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہو رہے تھے ان کے لہجے میں کھنک تھی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک جیسے اچانک ہی کہیں سے کوئی قیمتی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو یا کہیں گہرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمندروں میں سفر کرتے کرتے کوئی خوشیوں کی سرزمین کی خبر دے۔ یا خزاں میں اچانک بہاروں کی نوید مل جائے۔

اگر سرامین خوش ہو رہے ہیں تو یہ ایک فطری بات ہے آخر ان کی برسوں کی مسافت ختم ہوئی اور وہ سرخرو ہوئے۔ اور اب اگر بہاریں ان کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں تو دروازے نہ کھولنا تو حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خوشیوں کو برقرار رکھے۔

جبران نے صدق دل سے دعا کی اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''جاؤ میاں آج تمہیں روکوں گا نہیں۔ مجھے بھی کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں مگر آتے رہا کرو۔''

''جی سر ضرور حاضر ہوں گا۔''

جبران چلا آیا مگر بڑی دیر تک اسے سرامین کا بدلا بدلا رویہ حیران کرتا رہا۔

✹✦✹

جبران سمن کو تلاش کرتا ہوا لائبریری کی طرف آیا تو سمن اسے کونے کی میز پر نوٹس بناتی ہوئی مل گئی۔

''ہیلو......کیا ہو رہا ہے، اس نے میز کو انگلی سے بجاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کہاں غائب تھے اتنے دنوں سے......؟'' سمن نے فائل بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی......فلو، بخار وغیرہ، مگر تم کچھ اپ سیٹ سی لگ رہی ہو، خیریت تو ہے؟''

''آں ہاں......باہر چلتے ہیں......''

''چائے یا کوک کے متعلق کیا خیال ہے......؟''

''رہنے دو......'' لان کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

جبران نے اس کے خشک ہونٹوں اور ستے ستے چہرے کو دیکھا۔ ''مگر کوک میں تو کوئی حرج نہیں، میں لے آتا ہوں؟'' وہ اس کا جواب سنے بغیر دو کوک لے آیا اور اس کے ہاتھ میں کوک دیتے ہوئے وہیں بیٹھ گیا۔

''ہاں اب بتاؤ......کیا مسئلہ ہے؟''

''کوئی خاص بات تو نہیں......شاید میں ویسے ہی پریشان ہو جاتی ہوں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''پھر بھی کچھ تو ہے، تمہیں پریشان ہونے کا کوئی شوق تو نہیں ہے نا۔''

''تمہیں وہ لڑکا یاد ہے......جو اس دن ایڈمٹ ہوا تھا سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا......وہ جو نشہ نہ ملنے پر تڑپ رہا تھا۔ اور جس کی سوبر سی امی زار و قطار رو رہی تھیں۔

''ہاں......وہ جو کسی اچھے خاندان کا لگتا تھا اور ڈاکٹرز جس پر خصوصی توجہ دے رہے تھے......کیا ہوا اسے؟''

''وہ سر غفار خاں کا پوتا ہے۔'' سمن نے بتایا۔

''سر غفار خان......'' جبران نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''تمہارا مطلب مشہور سیاسی لیڈر غفار خاں سے ہے۔''

''ہاں......وہی......اور جبران کس قدر افسوس کی بات ہے، اس معصوم بچے کو محض اس لیے ایڈکٹ بنا دیا گیا کہ وہ لوگ بعض سیاسی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں''

''کون لوگ اور تمہیں کیسے پتا......''

''ڈاکٹر شیرازی بتا رہے تھے۔ اور گو یہ سیکرٹ ہے مگر اتفاق سے سر غفار خان کا فون میرے سامنے ہی آیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی کو پتا چلے کہ علی زیب ان کا پوتا ہے اور وہاں ایڈمٹ ہے۔ انہیں دھمکی ملی ہے کہ وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں ورنہ علی زیب کیس کو اچھالا جائے گا اور بدنام تو وہ ہوں گے ہی علی زیب بھی جان سے جائے گا''

''مطلب یہ کہ وہ علی زیب کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور اس کے علاج کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔''

''بالکل اور حیرت کی بات یہ ہے کہ شدید نگرانی کے باوجود اسے نشہ پہنچ رہا ہے، سمن نے تھکی تھکی نگاہیں اٹھائیں۔

''ڈاکٹر شیرازی پریشان ہیں۔۔ اور میں......میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس بچے کو کیسے موت کے پنجوں سے چھین لوں' کیسے اس کی ویران آنکھوں میں زندگی کی چمک بھر دوں اور کیونکر اسے ان عفریتوں سے بچا لوں' جو چپکے چپکے اسے زہر مہیا کر رہے ہیں۔''

''بی ریلیکس سمن......اگر تم حوصلہ ہار دو گی تو پھر تو کچھ نہیں ہو گا۔'' جبران نے نرمی سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھایا۔

یہ بچہ اور اس جیسے کئی اور بچوں کو اگر ہم نے بچانا ہے تو اس کے لیے حوصلہ درکار ہے ہمیں منشیات فروشوں کے خلاف جنگ کرنی ہے پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ......"

"کیا ان کے اپنے بچے نہیں ہوتے جبران...... جو وہ معصوم بچوں کو بھی نہیں بخشتے، سمن بے ساختہ رو پڑی۔

"یہ گھناؤنا کاروبار کرتے ہوئے کیا ان کا دل ذرا نہیں کانپتا......"

"جن کے دل سیاہ پڑ چکے ہوں' ان سے تم کیا توقع رکھتی ہو۔شاید ان کے متعلق ہی قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ

"ان کے دلوں پر مہر ہے اور ان کے کانوں پر......اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

"وہ لڑکا علی زیب اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

سمن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نویدی یاد آجاتا ہے، اسے تو میں نہ بچا سکی، مگر سر غفار خاں یہ کیوں علی زیب کو داؤ پر لگا رہے ہیں کیوں نہیں الیکشن سے دستبردار ہو جاتے کیا انہیں اپنا سیاسی کیریئر علی زیب کی جان سے زیادہ عزیز ہے۔"

"شاید نہیں...... مگر بعض لوگ اصولوں کی خاطر......"

"کیسے اصول......" سمن کے لہجے میں تلخی تھی۔

"علی زیب کی قربانی دے کر اگر انہوں نے کچھ حاصل کیا تو کیا فائدہ ......کیا وہ اپنے بہو بیٹے سے نظریں ملا سکیں گے نہیں جبران نہیں...... انہیں کبھی سچی خوشی نہیں ملے گی۔وہ اپنی بہو اور بیٹے کی نظروں میں مجرم ہی رہیں گے ہمیشہ......"

"لیکن علی زیب کو نشہ کون پہنچاتا ہے؟"

"پتا نہیں......شاید کوئی ایک نہیں...... مختلف اوقات میں مختلف لوگ حالانکہ اس کی امی ابو ہمہ وقت وہاں ہوتے ہیں۔دروازے پر بھی گارڈ ہے' جو کسی غیر متعلق شخص کو اندر نہیں جانے دیتا......پھر بھی......"

"میرے خیال میں اگر اندر جانے والے لوگوں کا ریکارڈ رکھا جائے کہ کس وقت کون

گیا اور پھر بار بار چیک کیا جائے۔

جب علی زیب کو نشہ ملتا ہے تو اس دوران کون کون کمرے میں جاتا ہے تو شاید پھر اس کالی بھیڑ کی نشاندہی ہو سکے۔"

جبران نے کچھ سوچ کر کہا۔

"چلو ڈاکٹر شیرازی سے بات کرتے ہیں۔اور اگر ضرورت ہوئی تو علی زیب کی نگرانی کے لیے ہم اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر شیرازی نے ان کی بات دھیان سے سنی۔

"بات تو تمہاری معقول ہے۔یوں تو اس کے اپنوں میں سے کوئی نہ کوئی ہمہ وقت اس کے پاس ہوتا ہے اور کسی غیر متعلق شخص کو بھی اندر نہیں جانے دیا جاتا' دوائیں اور انجکشن وغیرہ بھی میں خود چیک کرتا ہوں مگر یہ نام نوٹ کرنے والا آئیڈیا اچھا ہے۔اینی وے تم بھی فارغ وقت میں چکر لگا لیا کرو۔"

"جی......میں تو ویسے بھی آتا ہی رہتا ہوں۔"

"میں نے سب کو الرٹ کر دیا ہے کہ اپنی آنکھیں اور کان کھلی رکھیں مگر پھر بھی مجھے بہت فکر ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ معصوم بچہ ان سیاسی ہتھکنڈوں کی نذر ہو جائے۔"

"فکر نہ کریں......اللہ بہتری کرے گا"

"ہاں......خدا سے ہی امید ہے......اچھا چلو ذرا علی زیب کو دیکھ لیں۔"

ڈاکٹر شیرازی کے ساتھ ہی سمن اور جبران بھی کھڑے ہو گئے

✹ ✦ ✹

جبران بڑے انہماک سے کتاب پر جھکا کچھ پڑھ رہا تھا۔عالیہ دو تین بار دبے پاؤں آئی اور اسے مصروف دیکھ کر واپس چلی گئی جبران اتنا محو تھا کہ اسے کچھ پتا ہی نہ چلا کافی دیر بعد جبران نے کتاب سے سر اٹھایا اور تھکے تھکے سے انداز میں کتاب ایک طرف رکھ دی۔

"چلو ٹیسٹ کی تیاری تو ہو گئی......اب کیوں نہ ایک کپ چائے ہو جائے۔اس نے سوچا......اسی وقت عالیہ نے چپکے سے اندر جھانکا۔

"ارے عالی...... کیا بات ہے اندر آجاؤ......" جبران نے اسے دیکھ کر آواز دی۔

"شکر ہے جبران بھائی ......آپ فارغ تو نظر آئے' صبح سے کتاب سے چپکے ہوئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ کتنے چکر لگا چکی ہوں۔" عالیہ نے اطمینان بھری سانس لی۔

"کیوں...... کیا کوئی کام تھا مجھ سے...... تو ڈیئر سسٹر تکلف کیسا...... کہہ دیا ہوتا۔" جبران نے خوشدلی سے کہا۔

"وہ جبران بھائی...... آپ اتنے منہمک تھے پڑھنے میں کہ مجھے ڈسٹرب کرنا اچھا نہ لگا۔"

"ہاں تیاری کر رہا تھا ٹیسٹ کی، خیر کہو کیا بات ہے۔"

"جبران بھائی...... میری فرینڈ ہے نا اسمار اس کی برتھ ڈے ہے اور اس نے کہا تھا صبح ہی آ جانا مگر آپ مصروف تھے اور مجھے چھوڑنے والا کوئی نہ تھا۔"

"تو صبح ہی کہہ دیا ہوتا، ٹیسٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اب تیار ہو جاؤ جلدی سے" نہیں تو تمہاری فرینڈ تمہاری خوب کھنچائی کرے گی۔"

"تھینک یو جبران بھائی...... میں ابھی آئی دو منٹ میں۔"

عالیہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اور ہاں ذرا آپی سے کہنا۔ اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔"

"آپی ویسے ہی چائے لا رہی ہیں، لیجیے یہ آ بھی گئیں۔"

نادیہ نے چائے کا کپ جبران کو دیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میرے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے چپکے چپکے؟"

"سازش...... اور وہ بھی اپنی پیاری آپی کے خلاف۔

نہیں جناب، ایسا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ بس ذرا چائے کی طلب تھی...... اور وہ حاضر...... پیاری آپی، یہ تو بتائیں، آخر آپ کو میرے دل کا حال کیسے معلوم ہو جاتا ہے......"

"جنات ہیں میرے قبضے میں......" نادیہ نے رازداری سے بتایا۔

"اچھا...... اور جو آپ تشریف لے گئیں پیا دیس تو پھر کون میری فرمائش پوری کرے گا۔" جبران نے شرارت سے کہا۔

نادیہ بلش ہو گئی اور اس کی پلکیں بے اختیار جھک گئیں۔

"پھر کوئی اور آ جائے گی فرمائش پوری کرنے والی۔"

اس نے چپکے سے کہا اور جبران سے نظریں ملائے بغیر باہر چلی گئی۔ جبران مسکراتے

ہوئے اسے باہر جاتے دیکھتا رہا۔

"کوئی اور...... یعنی......"

اسے سمن کا خیال آ گیا...... جانے کیا بات تھی، سمن ہفتہ بھر سے کالج نہیں آ رہی تھی۔ جانے اس کی طبیعت خراب تھی یا کوئی اور مسئلہ تھا۔ اس کی فرینڈز کو بھی کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیوں غیر حاضر ہے...... شاید بیمار ہو۔ مگر رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ کیسے معلوم کیا جائے کہ اس نے تو کبھی اس سے فون نمبر بھی نہ مانگا تھا اور کیا پتا ان کے گھر میں فون ہے بھی یا نہیں......

وہ چائے کے سپ لیتا سوچتا رہا۔

پھر عالیہ نے ہی اسے چونکایا۔ وہ تیار ہو کر آ گئی تھی۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے عالیہ......" جبران نے ساتھ چلتے چلتے پوچھا۔

"اے ون...... اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"گڈ...... اچھا کب تک فارغ ہو جاؤ گی۔ وقت بتا دو لینے آ جاؤں گا۔"

"اول تو اسمار ہی چھوڑ جائے گی اور جو کوئی پرابلم ہوا تو میں آپ کو فون کر دوں گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" جبران نے رکشہ روکتے ہوئے کہا۔

تبھی گاڑی کے بریک چرچرائے اور کسی نے جبران کو پکارا جبران نے مڑ کر دیکھا پروفیسر امین اپنی سلور گرے نسان میں اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

"یہ پروفیسر امین ہیں......" جبران نے آہستہ سے عالیہ کو بتایا۔

"السلام علیکم سر......" جبران نے کھڑکی کے شیشے کے پاس آ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام...... ارے بھئی کیا خطا ہو گئی ہم سے، جو ہمیں فراموش کر دیا، کبھی نظر ہی نہیں آتے۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آج کل ٹیسٹ ہو رہے ہیں نا تو اسی لیے...... آج حاضر ہونے ہی والا تھا۔"

"اچھا خیر...... کیا کہیں جا رہے ہو......" انہوں نے جبران کے پیچھے کھڑی عالیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی سر...... یہ میری سسٹر ہے عالیہ...... اسے اس کی فرینڈ کے ہاں چھوڑنا تھا۔"

عالیہ نے انہیں سلام کیا۔ پروفیسر امین نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بغور عالیہ کو دیکھا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس کی شکل وصورت کافی جبران سے ملتی تھی۔خاص طور پر اس کی خوبصورت ذہین آنکھیں۔

''خوب......تمہاری سسٹر بھی تمہاری ہی طرح ذہین نظر آتی ہے۔

''جی سر......وہ تو ہے؟ جبران فخریہ مسکرایا۔

''چلو تمہیں ڈراپ کردوں۔انہوں نے پیشکش کی۔

''نہیں سر رکشہ میں نے روکا ہوا ہے۔آپ نہ بلاتے تو......بہر حال بہت شکریہ۔

''ایز یو وِش......انہوں نے کندھے اچکائے......ویسے میاں......بھائی کہا ہے تمہیں۔اور بھائی خوشیاں شیئر کرتے ہیں۔ایسا نہ ہو کہ بارات تیار ہو اور باراتی غائب''

ان کے ہونٹ طنز سے بل کھا گئے۔''اور سچ تو یہ ہے بارات سجے گی نہیں تمہارے بغیر......انہوں نے ایک زہریلا کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

اور لمحہ بھر کے لیے جبران کو محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں میں کوبرا پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا ہو جیسے پہلے کبھی کوئی طنزیہ بات کہتے کہتے عجیب سا کینہ ان کی آنکھوں سے جھانکنے لگتا تھا......مگر اب تو......جبران اپنی جگہ ٹھٹک سا گیا۔

اگلے ہی لمحے پروفیسر امین اپنی گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔کیا پروفیسر امین کا ہمیشہ سے یہی انداز ہے بات کرنے کا۔

عالیہ نے پوچھا۔

نہیں......مگر کبھی کبھی......خیر آؤ......''

وہ الجھا الجھا سا عالیہ کے ساتھ رکشا میں بیٹھ گیا۔

''کیا اسٹائل ہے''عالیہ نے کہا۔لگتا ہے جیسے وہ مخاطب کو بہت حقیر، بہت گھٹیا، بہت بے چاری سی چیز سمجھتے ہوں۔اپنے سے بہت کمتر اور بے کار......جیسے کوئی بہت اونچائی پر کھڑا ہو کر مٹی کے ذرے کو یا کسی معمولی سے تنکے کو دیکھے''

''نہیں......ایسی بات نہیں......سر امین از گریٹ مین......این آئیڈیل پرسن......بس پتا نہیں کیوں کبھی کبھی اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے ان کے انداز میں رعونت آ جاتی ہے۔اور ان کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے۔اور لگتا ہے جیسے وہ تمسخر اڑا رہے ہوں۔......یا اپنے اندر چھپی کوئی آگ اگل رہے ہوں۔مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا......شاید ان کا انداز یہی ہے۔''

جبران نے سر امین کا بھرپور دفاع کیا۔

''کچھ بھی ہو......مجھے کچھ سمجھ نہیں آئے یہ سر امین۔''عالیہ کو پتا نہیں کیوں وہ
میں اچھے نہیں لگے تھے۔

''گلبرگ تو آ گیا جی......اب کدھر جانا ہے۔رکشہ ڈرائیور نے انہیں متوجہ کیا۔

عالیہ اسے گائیڈ کرنے لگی۔پھر اسماء کے گھر کے سامنے اترتے ہوئے اس نے
خدا حافظ کہا اور گیٹ میں داخل ہو گئی۔جبران بے دھیانی میں اسے دیکھتا رہا۔آج مد
جانے کیوں سر امین کا رویہ اسے ڈسٹرب کر گیا تھا۔

کیوں کرتے ہیں سر امین ایسا......جیسے کوئی صدیوں کی دشمنی ہو......ان کی آنکھ
وہ کیفیت اور تنفر بھرا لہجہ۔

عالیہ کو تو وہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا۔مگر خود اندر سے مضطرب ہو گیا تھا۔

آپ نے نہیں اترنا......؟''تھوڑی دیر خاموش رہ کر ڈرائیور نے پوچھا۔

''ہیں......''جبران چونک کر سیدھا ہو گیا۔جہاں سے اٹھایا تھا وہیں ڈراپ کر د
نے ایک گہری سانس لی۔

''نہیں سب میرا وہم ہے شاید......سر امین کا رویہ تو مدت سے بے حد
ہے۔بالکل بھائیوں جیسا۔اور وہ دشمنوں والے انداز تو اب کافی دنوں سے نہیں ر
خوشیوں کو ایک دم اپنے سامنے پا کر بے قابو ہو گئے ہیں۔ورنہ تو کوئی بات نہیں جبران
سوچ کر مطمئن ہو گیا۔

ثمن آج بھی نہیں آئی تھی۔جانے کیا بات تھی۔

جبران کچھ متفکر سا علی زیب کے پاس چلا آیا۔اس خوبصورت ذہین لڑکے
حالت میں دیکھ کر اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔وہ اسے اپنی باتوں سے حوصلہ اور جذباتی
فراہم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔علی زیب بہت بے چین تھا۔کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا۔کبھی
سا چاروں طرف دیکھتا۔اس کی امی جوس کا گلاس لیے پاس کھڑی تھیں مگر وہ دھیان نہیں
رہا تھا۔

''بیٹا تھوڑا سا پی لو''اس کی امی اصرار کر رہی تھیں، مگر وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

ہیلو بریو بوائے......''جبران نے علی زیب کی امی کو سلام کرتے ہوئے زیب کا ہا
لیا۔''آج تو کافی بہتر نظر آ رہے ہو......ہے نا......خوب اسی طرح بہادری سے مقابلہ ک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھو کتنی جلدی ٹھیک ہو جاتے ہو تم......''

''نہیں ہوتا مجھ سے مقابلہ۔'' اس نے جبران کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بڑی اذیت میں نہیں برداشت کر سکتا۔'' وہ ہولے ہولے کانپنے لگا۔

علی زیب تمہیں حوصلے سے کام لینا ہے اپنے لیے۔ اپنی امی اور ابو کے لیے اپنے بہن بھائیوں کے لیے۔'' جبران نے نرمی سے اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا...... دیکھو...... ذرا سی ہمت کرو گے تو ہمیشہ کے لیے اس اذیت سے چھٹکارا پا لو گے۔ تھوڑا برداشت سے کام لو۔ حوصلہ کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے...... میں چھوڑ دوں گا...... بالکل چھوڑ دوں گا...... مگر ایک بار مجھے تھوڑی سی لا دو...... بس ایک بار......''

اپنے بازوؤں کو دباتے ہوئے اس نے لجاجت سے کہا۔

جبران نے پریشانی سے علی زیب کی امی کو دیکھا' جو چپکے چپکے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''میرا جسم ٹوٹ رہا ہے...... پلیز...... تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا......''

اس کی آنکھوں میں عجیب بے بسی تھی اور اس کی بے قراری لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔

''اچھا تو پھر مجھے زہر لا دو...... میرا گلا گھونٹ دو۔

مجھے مار ڈالو......'' اس نے اپنے سنہرے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے اور چلا چلا کر رونے لگا۔

''علی...... علی مت ایسا کرو......''

علی زیب کی امی آنسو بہاتے ہوئے اس کے بال مٹھیوں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگیں۔

''ہاں میں نے سب کو دکھ دیا ہے۔ آپ کو' ابو کو۔ مجھے مر جانا چاہیے۔ میں کیوں زندہ ہوں۔'' اس نے تیزی سے جھک کر پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اسے اپنے سینے میں گھونپنا چاہا مگر جبران کے مضبوط ہاتھوں نے چھری اس کے ہاتھوں سے چھین لی۔ نشے کے مسلسل استعمال نے اس کے اعصاب خاصے کمزور کر ڈالے تھے۔ اور اس کے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ اس لیے وہ چھری پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا۔

علی زیب کی امی خوف زدہ سی ہونٹوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔

وہ گھٹنے موڑ کر بیڈ کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

''سنو...... ایک پڑیا...... صرف ایک پڑیا...... میری نسیں بل کھا رہی ہیں...... کوئی میرا پورا جسم مروڑ رہا ہے۔ پٹخنیاں دے رہا ہے مجھے...... پلیز...... صرف ایک بار''

اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے جبران کو دیکھا اور ہولے ہولے سسکنے لگا۔

اچھا ٹھیک ہے......'' جبران نے علی زیب کی امی کو بیل بجانے کا اشارہ کیا۔

''مگر میں کہاں سے لاؤں...... مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں۔''

وہ اسے بہلانے لگا۔

''آپ......'' علی زیب کی آنکھیں چمکنے لگیں......'' وہ منظور پان والا ہے نا...... نثار ولا، ہمارے گھر کے پاس ماڈرن ویڈیو سینٹر کے بالکل سامنے......''

وہ بغلوں میں ہاتھ دیے کانپ رہا تھا، اور اب تو اس کی آواز بھی کانپنے لگی تھی۔

''بس امی کے پاس جائیں...... پلیز جلدی...... اس نے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

علی زیب کی امی شاید جبران کی بات نہیں سمجھی تھیں۔

جبران نے خود اٹھ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بیل بجائی...... تبھی دوائیوں کی ٹرے لیے نرس اندر داخل ہوئی۔

''کیا حال ہے پیشنٹ کا......؟ اس نے روایتی انداز میں پوچھا۔

نرس کی آواز سن کر علی زیب نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

''سسٹر'' اس کی آواز میں بیتابی تھی۔

نرس نے مڑ کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''یہ دیکھیں جی۔ ڈاکٹر شیرازی کے سائن کے ساتھ تمام دوائیں اور انجکشن۔'' نرس نے ٹرے علی زیب کی امی مسز نثار کے سامنے رکھ دی۔ اور ان کے سامنے ہی انجکشن تیار کرنے لگی۔

اس اثنا میں دو تین بار جبران کی طرف دیکھا' پھر ٹرے اٹھائے علی زیب کی طرف آئی اور اسے انجکشن لگایا۔

''سسٹر......'' علی زیب کے لہجے میں جانے کیا تھا۔

کوئی انجانی سی دہکتی ہوئی طلب...... نامعلوم سی بے قراری یا استفسار...... جبران کچھ نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھ سکا۔ وہ بغور نرس کو دیکھنے لگا۔ اور اگر اتنے دھیان سے اسے نہ دیکھ رہا ہوتا تو شاید اسے پتا بھی نہ چلتا...... نرس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے انتہائی مہارت سے کوئی چیز تکیے کے نیچے کھسکائی تھی۔ جبران نے بے اختیار انتہائی تیزی سے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالا اور اسے پڑیا سمیت اپنی طرف کھینچ لیا۔ جو وہ تکیے کے نیچے رکھ رہی تھی۔ پڑیا میں سفید سا سفوف بھرا تھا۔

''سسٹر۔ آپ ...... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایسا کر سکتی ہیں۔ ایک اتنے مقدس پیشے سے وابستہ ہو کر ایسی حرکت۔ آپ تو زندگیوں سے کھیل رہی ہیں۔ آپ کو اپنے آپ پر شرم آنی چاہیے۔

نرس حواس باختہ سی چپ کھڑی تھی۔

تبھی دروازہ کھلا اور ڈاکٹر شیرازی تیزی سے اندر آئے مگر پھر ٹھٹک کر رک گئے۔

'یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔''

انہوں نے حیرت سے جبران کو دیکھا' جو سسٹر کی کلائی تھامے کھڑا تھا۔

''سر جب زندگی بانٹنے والے ہاتھ ہی موت تقسیم کرنے لگیں تو بچاؤ کیونکر ہو۔ دشمن تو ہمارے اندر ہی تھا۔ اور ہم اسے باہر ڈھونڈ رہے تھے۔'' سسٹر کا ہاتھ پکڑے پکڑے جبران نے کہا۔

نرس جو بدحواس کھڑی تھی، یک دم چونکی، جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دوڑ کر ڈاکٹر شیرازی کی طرف آئی ...... ''ڈاکٹر صاحب، یہ لڑکا اسے ہیروئن دے رہا تھا۔ یہ دیکھیں میں نے ابھی ابھی یہ پڑیا اس کے ہاتھ سے چھینی ہے۔ اور چالاکی تو دیکھیں ذرا اس کی' الٹا مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

''الزام......'' جبران اسے اس صفائی سے جھوٹ بولتے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

''ایک تو آپ اس قدر گھٹیا حرکت کی مرتکب ہوئیں اور پھر اس پر اتنی ڈھٹائی۔''

''ڈاکٹر صاحب...... اسے منع کریں۔ اسے کوئی حق نہیں پہنچتا الٹی سیدھی باتیں سنانے کا......'' نرس کا انداز واویلا کرنے والا تھا۔

ڈاکٹر شیرازی جو متذبذب سے کھڑے تھے۔ بے اختیار آگے بڑھے...... ''یہ کیا چکر ہے...... اور اس پڑیا میں کیا ہے...... دکھاؤ مجھے......'' انہوں نے پڑیا نرس کے ہاتھ سے لی اور اسے کھول کر سفید سفوف کو گھورا۔ پھر ایک چٹکی لے کر اسے انگلی سے رگڑا اور سونگھا۔

''ہوں تو یہ بات ہے۔ اتنی نگرانی کے باوجود اسے خوراک مل رہی ہے۔ مگر کیسے......؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے جبران کو دیکھا۔

سر...... یہ نرس اسے تکیے کے نیچے کھسکا رہی تھی کہ اتفاق سے میں نے دیکھ لیا۔ اور ابھی اسے پکڑا ہی تھا کہ آپ آ گئے۔''

جبران نے بتایا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب، یہ جھوٹ بول رہا ہے؟ نرس چلائی۔'' پڑیا یہ خود لایا تھا اور اسے دے رہا تھا۔''

''اوہ......'' ڈاکٹر شیرازی نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ پھر وہ بیگم نثار کی طرف مڑے۔

''آپ بتائیں بیگم صاحبہ، اصل بات کیا ہے......؟''

''پتا نہیں۔ میرا کچھ دھیان نہیں تھا...... ہاں مگر یہ لڑکا جبران...... یہ کہہ تو رہا تھا علی سے کہ اسے لا دے گا......؟

''اچھا......'' ڈاکٹر شیرازی نے غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھا۔ انہیں واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ جبران جیسا سلجھا ہوا ڈیسنٹ لڑکا ایسا کر سکتا ہے۔

''دیکھا ڈاکٹر صاحب...... کتنا مکار اور ہوشیار لڑکا ہے۔ جو بیگم صاحبہ اس کی باتیں نہ سن لیتیں تو یہ تو مجھے پھنسانے ہی لگا تھا...... نرس نے گہری اطمینان بھری سانس لی۔

''مگر وہ تو میں علی زیب کو بہلانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

آپ یقین کریں ڈاکٹر صاحب...... یہ پڑیا نرس لائی تھی۔''

مگر جبران کو خود ہی اپنی تاویل بودی لگ رہی تھی۔

جھوٹی اور بے بنیاد شاید اسی لیے اس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

اسی وقت علی زیب نے جو چپکے سے اٹھ کر ڈاکٹر شیرازی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا، پڑیا پر جھپٹا مارا مگر ڈاکٹر شیرازی نے پڑیا والا ہاتھ پیچھے کر کے اسے ایک ہاتھ سے دھکیلا۔

✱✦✱

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"پیچھے ہٹو۔"

"سر......ایک بار......قسم سے میں چھوڑ دوں گا۔بس ایک بار تھوڑی سی......" وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"نرس......اسے بیڈ پر لٹا دو......زبردستی......"

"نہیں......نہیں لیٹوں گا میں بیڈ پر۔" وہ بپھر گیا......

"میرے پاپا......وہ سمجھ لیں گے تم سب سے......لاؤ......مجھے یہ پڑیا دے دو......ورنہ......" وہ نرس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

جبران اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا۔

"علی حوصلہ کرو، تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمت نہیں ہارو گے......بی بریو......، جبران نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

"نہیں......ڈاکٹر شیرازی کا لہجہ سخت اور اجنبی تھا۔

"چھوڑ دو اسے ......اور دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا۔اور سسٹر فیروزہ گارڈ کو ہدایت کر دو کہ کسی بھی غیر متعلقہ فرد کو خواہ وہ جبران ہی کیوں نہ ہو اندر نہ آنے دیا جائے اور وارڈ بوائے کو بلاؤ فوراً......"

"یس سر۔" نرس دروازے کی طرف لپکی۔

جبران ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔

"ٹھیک ہے سر......لیکن اگر آپ علی زیب کی زندگی چاہتے ہیں تو اس نرس کو بھی یہاں آنے سے روک دیں۔

"مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ......" ڈاکٹر شیرازی کا لہجہ بدستور خشک

تھا۔" اور تم جا سکتے ہو یہی رعایت کافی ہے؟"

جبران مایوسی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"اگر میں پڑیا لایا ہوتا تو کبھی بیل نہ بجاتا۔اس پر بھی غور کیجئے گا۔" اس نے دروازے پر رک کر پل بھر کے لیے ڈاکٹر شیرازی کو دیکھا اور انتہائی دل شکستگی کے عالم میں باہر نکل گیا۔

تو یہ سب کچھ یوں ہونا تھا......اور اگر ڈاکٹر شیرازی مہربان نہ ہوتے تو اخبار کی ایک سنسنی خیز سرخی۔انجمن انسداد منشیات کے ایک سرگرم رکن ہیروئن دیتے ہوئے گرفتار۔

قول و فعل کا تضاد......چہ......اور موقع واردات پر موجود اصل مجرم منظر سے بالکل غائب......آؤٹ آف فوکس......اور بے چارہ علی زیب۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں۔

کی مکمل تفسیر......پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ہاتھ قطرہ قطرہ زہر اس کی رگوں میں اتار رہے ہیں......اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا......

جبران کو لگا جیسے اس زمین اور آسمان کے بیچ کوئی بھی کام کرنے کا نہ رہا ہو......جب لوگ یوں اخلاص پر شبہ کریں اور قاتل اور مسیحا ہاتھوں میں فرق نہ کر سکیں تو پھر کون ہے جو معاشرے کو سدھارنے کا دعویٰ کرے۔پرائے داغ اپنے چہرے پر سجانے کا قرینہ کوئی کوئی جانتا ہے۔دوسروں کے دامن کے داغ دھوتے دھوتے اگر چھینٹے اپنے دامن پر پڑنے لگیں تو دل پر کیا گزرتی ہے۔یہ جبران اچھی طرح جان گیا۔

تو پھر اس سارے گورکھ دھندے کے بیچ کیا کیا جا سکتا ہے۔

اسے پان والے کھوکھے کا خیال آیا۔جو ماڈرن ویڈیو سینٹر کے سامنے تھا۔غیر ارادی طور پر اس نے رکشہ روکا اور نثار دلا کی طرف چل پڑا۔کھوکھے پر دو چار آدمی کھڑے تھے' جو پان چھالیہ وغیرہ لے رہے تھے۔وہ پان والے کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔

"جی باؤ جی......" پان والا آخری آدمی کو پان تھماتا ہوا اس سے مخاطب ہوا......" کیا چاہیے......؟"

"آں ہاں......" جبران نے لمحہ بھر توقف کیا......پھر آگے جھک کر سرگوشی میں بولا۔

"تم وہی ہو نا......جو جنت کی سیر کراتے ہو......"

پان والا چونک پڑا......" آپ کون ہیں جی......اور کس جنت کی بات کرتے ہیں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں...... مجھے زیب نے بھیجا ہے......علی زیب نے......" جبران نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"تو یوں کہو نا جی......" پان والے کے لہجے میں اطمینان اتر آیا۔اور اس کا ہاتھ گدی کے نیچے رینگ گیا۔

جب اس نے بند مٹھی جبران کی طرف بڑھائی تو جبران نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ جس آگ سے تم کھیل رہے ہو،اس میں تمہارا گھر بھی جل سکتا ہے؟"

"جی......" پان والے کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔

"آپ کون......؟"

"ایک معمولی آدمی......مگر درد مند دل رکھنے والا......مجھے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ دوسروں کے بچوں کو زہر بانٹتے ہوئے کیا تمہیں اپنے بچوں کا خیال نہیں آتا۔کیا تمہارے دل میں ذرا بھر بھی انسانیت باقی نہیں رہی......کیا تمہارا دل رحم سے بالکل ماورا ہے......کاش، میں تمہارے ضمیر کو جگا سکتا......مگر تم تو کٹھ پتلی ہو......جس کا ڈور دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔جبران کی گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

"اور تمہیں حرکت دینے والے ہاتھ تو پردے کے پیچھے ہیں......اور میں بے وقوف شخص......تم سے یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں......بالکل بے فائدہ......اور بے اجر......ایک جھٹکے سے اس نے پان والے کے ہاتھ چھوڑ دیے

مجھے ضرورت کیا تھی بھلا یہاں آنے کی۔

اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا اور پھر تیزی سے قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔

پتا نہیں سمن کہاں غائب تھی۔اور ایک افواہ جو پورے کالج میں گردش کر رہی تھی۔کہ جبران جیسا ہونہار اسٹوڈنٹ علی زیب کو ہیروئن دیتے پکڑا گیا......

"مائی فٹ......" جبران نے غصے سے زمین کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔" مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں، جبکہ میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

مگر طلبہ کی عجیب عجیب نظریں......کچھ کہتی، کچھ ٹٹولتی ہوئی......

"کیا واقعی......؟"

اور آپس میں سرگوشیاں۔

"اوہ اچھا......یقین نہیں آتا کہ جبران......مگر کچھ تو ہے۔

"اور یہ سمن......اس کو بھی اسی وقت غائب ہونا تھا۔

اس کے ذہن پر جھنجلاہٹ طاری تھی۔

"کوئی تو ہو جس کی نظروں میں یقین ہو کہ ہاں یہ شخص ایسا نہیں کر سکتا۔شک وشبے سے عاری۔اعتماد سے پُر نگاہیں ایاز اسے کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔

"یہ کیا چکر ہے۔"

"جو بھی سمجھ لو۔"

وہ جیسے سارے جہاں سے خفا تھا۔

"یہ اتنی اکڑ کس لیے......اور جب تک تم بتاؤ گے نہیں، کسی کو اصل بات کا پتا کیسے چلے گا۔" ایاز نے ڈانٹا۔

"میں کوئی وضاحت نہیں کرنا چاہتا......" جبران کے لہجے میں سرکشی تھی۔" جس کی جو مرضی ہے سمجھے۔"

تبھی سر حسن کے حضور اس کی پیشی ہوئی۔

"دیکھو جبران، مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتے۔نہ تم اس قسم کے لڑکے ہو۔مگر یہ غلط فہمی ہوئی کیسے۔میں جاننا چاہتا ہوں......"

جبران نے انہیں تمام واقعہ بلا کم وکاست سنا دیا۔

"تو یہ بات ہے......جب ڈاکٹر شیرازی نے مجھے بتایا تو تب بھی مجھے یقین تھا کہ بات یوں نہیں......خیر اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں۔تم حوصلہ مت ہارنا۔اور راستے کے ان روڑوں سے گھبرانا مت......"

ان کی ہمت افزا الفاظ سے جبران کو بڑی تقویت ہوئی۔

"مجھے سر امین سے ملنا ہے سر۔مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہے، جبران نے پوچھا۔

"امین......وہ تو آج نہیں آیا......سہرا باندھنے کی تیاری کر رہا ہے بوڑھا گھوڑا۔" سر حسن ہنسے۔وہ سر امین کے بے تکلف دوست تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبران کو اس وقت سرامین کے مشورے کی ضرورت تھی۔ عثمان بھائی دور تھے اور پروفیسر امین اسے بھائی سمجھتے تھے اور بھائیوں جیسا سلوک بھی کرتے تھے۔ پھر اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں کوئی سرامین تک غلط انداز میں یہ بات نہ پہنچا دے اور وہ یقین نہ کر بیٹھیں...... وہ ان کے روبرو خود سارا واقعہ بیان کرنا چاہتا تھا...... یہی سوچ کر بغیر کوئی پیریڈ اٹینڈ کیے وہ سرامین کے گھر پہنچ گیا۔

وہ اپنے سامنے ڈھیر سارے ویڈنگ کارڈز پھیلائے بیٹھے تھے۔ اور لسٹ میں لکھے ہوئے نام ان پر لکھ رہے تھے۔

"آؤ میاں بڑے موقع پر آئے ......" انہوں نے لکھتے لکھتے سر اٹھایا اور دراز کھول کر لفافوں کا بنڈل نکال کر اس کی طرف پھینکا۔ ساتھ ہی مارکر اور لسٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"میں تو بھائی تھک گیا لکھ لکھ کر...... کارڈز پر تو تقریباً لکھا جا چکا ہے۔ لفافوں پر تم لکھ دو۔"

"یس سر......" جبران نے مستعدی سے کہا۔ اور لسٹ پر درج شدہ نام لفافوں پر لکھنے لگا۔

"کہا بھی آپا بیگم سے کہ اس عمر میں تو یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے...... سادگی سے نکاح ہو جائے بس...... مگر ان کی ضد ہے کہ بارات میں چاہے دو آدمی لے جاؤ...... ولیمہ شاندار ہو...... آخر عزیزوں کو بھی منہ دکھانا ہے۔ وہ جھنجلائے۔

"اور یہ تو میں نے بتایا نہیں غالباً کہ اس پیر کو بارات ہے یعنی ٹھیک تین دن بعد۔"

"اور سر آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کی شادی ہو کس سے رہی ہے۔" جبران کے لہجے میں قدرے شوخی تھی۔ مطلب عزیزوں میں کہ......"

"ہاہاہا......" سرامین کھل کر ہنسے۔

"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے...... ارے بھئی اچھی طرح جانتے ہو تم اسے...... اپنے ہی کالج میں پڑھتی ہے...... سمن نیازی...... ارے بھئی وہی جو منشیات کے موضوع پر بڑی بڑی تقریریں کرتی ہے۔ تمہاری اس انجمن انسداد منشیات کی اہم رکن......"

"جبران کا کاغذ پر چلتا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ پل بھر کے لیے جیسے دل کی دھڑکن ہی رک گئی ہو...... یا جیسے چھت کی ساری کڑیاں اور شہتیر سر پر آ گرے ہوں...... پتا نہیں کیا ہوا

تھا۔ مگر کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا...... ساری دنیا ہی اتھل پتھل ہو گئی تھی شاید...... پتا نہیں زمین کانپ رہی تھی یا آسمان...... اس کے وجود کے اندر کہیں گہرائی میں لرزہ طاری تھا...... جیسے کوئی عفریت اسے اکھاڑ پچھاڑ رہا ہو۔

"سمن......؟"

اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگی...... کھوکھلی پھٹی پھٹی سی۔ پھر وہ سر جھکا کر لکھنے لگا...... مشینی انداز میں...... جیسے وہ صدیوں سے لکھ رہا ہو...... یوں ہی قلم تھامے...... اور لسٹ ہے کہ لمبی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ شیطان کی آنت کی طرح' کبھی ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔

اور جب اس نے لسٹ کا آخری نام لکھ کر مارکر رکھا تو اس نے دیکھا ذوالفقار احمد زلفی جانے کب سے آئے بیٹھے تھے اور پروفیسر امین جانے کس بات پر محظوظ ہو کر مسکرائے جا رہے تھے...... ایک فاتح مسکراہٹ......"

"تو کچھ بھی نہیں بدلا......"

اس نے متعجب ہو کر سوچا...... مگر اس کے اندر کہیں گہرا درد بل کھا رہا تھا۔ اور اسے اپنا آپ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔

"اب کیا میں جا سکتا ہوں سر......؟ اس نے باچھیں پھاڑیں۔

"ہاں یوں ٹھیک ہے...... مسکرانا کچھ مشکل نہیں...... اس نے مطمئن ہو کر سوچا......"

مگر یہ چٹکیاں لیتا درد...... افوہ...... کیا سر کو معلوم نہیں تھا کہ میں...... اگر انہیں معلوم ہوتا تو...... نہیں...... اب انہیں کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے...... وہ اپنے آپ سے الجھا باہر نکل آیا۔

"مگر سمن...... وہ کیسے...... کیا اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا...... اور کس قدر قابل احترام رشتہ ہے میرا سرامین سے نہیں، مجھے اب سمن کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے...... سرامین مجھے بھائیوں کی طرف عزیز ہیں۔ اور قابل احترام...... مگر سمن......"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جو کافی اونچا تھا اور اس کی دسترس سے دور...... اور سمن تم نے ایسا کیوں کیا۔

وہ کراہ اٹھا۔

"کیا بات ہے دوست...... کچھ الجھے الجھے سے ہو۔" کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ چونک کر مڑا۔ زلفی صاحب آپ......" وہ زلفی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔

"ہاں بھائی میں...... کچھ کھو گیا ہے کیا...... یہ رک کر ادھر ادھر کیا ڈھونڈ رہے ہو......؟"

ہاں کھو تو گیا ہے شاید...... میرا اپنا آپ...... اس نے لاچاری سے سوچا۔

"نہیں...... کچھ نہیں......"

اس نے گہری دھند میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ابھرنے کی کوشش کی۔

"میں شاید...... یہ درد سر......" اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

تاریکی اس کے اردگرد گہری ہوتی جا رہی تھی...... اور چاروں طرف جاتے ہوئے سارے راستے اجنبی تھے۔

"ارے بھئی یہ سارے راستے جو چاروں طرف جا رہے ہیں، کیا ان میں سے کوئی ایک بھی راستہ وہاں تک نہیں جاتا، جہاں وہ سیم تن آنکھوں کے دیپ جلائے منتظر ہے مگر کیا خبر اس نے خود ہی سارے دیپ بجھا دیے ہوں کہ وہ اس تک نہ پہنچ سکے۔ اور ان بجھتے ہوئے سارے چراغوں کا دھواں جیسے اس کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔

اور یہ بن مانس جیسا آدمی جو اس نوخیز لڑکی کے ساتھ اس شاندار گاڑی میں سے اترا ہے۔ اس کا باپ ہے یا شوہر اگر وہ جا کر اس سے پوچھ لے کہ بھائی صاحب اس لڑکی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے تو شاید وہ بیچ بازار میں اسے پیٹ ڈالے۔ مفت کا تماشا...... یا پھر شاید کہے۔۔ جو رشتہ بھی ہے تمہیں کیا۔

آئے بڑے خدائی فوجدار...... اور جو سمن ساتھ ہوتی تو......

وہ لاتعلق سی باتیں سوچتے سوچتے پھر سمن کے متعلق سوچنے لگا۔

تو سمن تم بھی آخر دوسری لڑکیوں کی طرح نکلیں۔ بے وفا اور سفاک...... خواب دکھا کر آنکھوں سے خواب نوچنے والی۔

مگر نہیں، میں کسی سمن کو نہیں جانتا...... اس نے سرکشی سے سوچا۔

مجھے کیا معلوم یہ سمن کون ہے۔ کوئی تصوراتی خاکہ۔ یا ماورائی مخلوق۔ ہاں مگر کچھ شناسا سی۔ اپنی اپنی۔

اس کے اندر ویرانی بڑھ رہی تھی۔ اور وہ زور زور سے قہقہے لگانا چاہتا تھا۔

"ہاں میں اب بھی کھل کر ہنس سکتا ہوں، اس سب کے باوجود......"

اس نے ہنسنا چاہا مگر آواز اس کے گلے ہی میں پھنس گئی۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ اب کبھی نہ ہنس سکے گا۔ زندگی بھر نہیں۔

اور اسی لمحے اسے اپنے گرد کسی کے بازوؤں کی گرفت محسوس ہوئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ذوالفقار زلفی کی آواز اس کے قریب سے آئی۔ "چلو اس سامنے والے کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں"

تو یہ زلفی ابھی تک میرے ساتھ ہے...... اسے خیال آیا۔ جانے وہ کب سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"تم تھکے ہوئے بھی ہو اور پریشان بھی...... کافی کا ایک کپ تمہیں بحال کر دے گا۔"

ایک دم سے اسے محسوس ہوا جیسے واقعی وہ بہت تھکا ہوا ہو...... چلتے چلتے نڈھال ہو چکا ہو۔ اور اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہوں۔

زلفی اسے سہارا دیے کیفے میں لے آیا۔

زندگی ایک دم ہی کتنی اجنبی لگنے لگی ہے...... اس نے میز کی شفاف سطح کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

مگر کیا زندگی صرف سمن تک محدود ہے؟" اس نے سر اٹھا کر شیشے کے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔

کتنی لڑکیاں باہر فٹ پاتھ پر جا رہی تھیں ایک، دو، تین، چار...... اور...... ارے دنیا تو لڑکیوں سے بھری پڑی ہے...... مگر اس جیسی کوئی ایک بھی نہیں......

وہ پھر گم ہونے لگا،

کہاں ہو گی وہ اس وقت...... اور کیا سوچ رہی ہو گی بھلا...... ان خواب راستوں کو جو دھندلکوں میں گم ہو گئے۔

یا نئی خوشیوں کے خیال میں مگن......

وہ بے خیالی میں کافی کے کپ سے اٹھتی بھاپ کی لکیروں کو اپنی انگلیوں سے پکڑنے اور مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا رہا' تو زندگی شاید اب کافی کے ایک گھونٹ جیسی تلخ اور کڑوی ہے...... نہیں کونین کی ٹکیہ...... اور پتا نہیں کیسی...... مگر بے ذائقہ اور بے معنی...... اور میرے ساتھ کچھ انوکھا نہیں ہوا...... مگر سر امین اور سمن اور میں...... کہیں کوئی گڑبڑ ضرور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔۔۔۔نہیں پر کچھ انہونی۔۔۔۔کوئی ضروری تھا کہ من سرا مین سے ہی۔۔۔۔اگر ہمارے ستارے نہیں ملتے تھے تو پھر سرامین ہی کیوں۔۔۔۔کوئی اور کیوں نہیں۔۔۔۔۔،،

کوئی بات تھی' جو اس کی گرفت میں نہیں آرہی تھی۔

خیالات اڑے اڑے سے تھے، آوارہ بادلوں کی طرح۔۔۔۔بار بار سمٹتے ہوئے اور منتشر ہوتے ہوئے۔۔۔۔اور پورا وجود سیاہ کثیف دھوئیں میں ملفوف۔۔

"مجھے اس سے پوچھنا تو چاہیے آخر۔۔۔۔" جبران نے اپنے آپ سے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔مگر ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔۔۔

ابھی تم گھر جاؤ۔۔۔۔" زلفی کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

اوہ۔۔۔" اس نے چونک کر زلفی کو دیکھا۔اور پھر اپنے آپ کو۔۔۔۔اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا جو پتا نہیں کب زلفی نے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا اور جو سلگ سلگ کر اپنے اختتام کو تھا۔اور اس کے سامنے رکھا کافی کا کپ خالی تھا۔۔۔۔

اس نے سگریٹ کا ایک آخری گہرا کش لیا۔سرے پر چنگاری سی چمکی اور بجھی۔۔۔۔جیسے کوئی جل کر بجھ رہا ہو۔۔۔۔کیسا عجیب سا ذائقہ تھا سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں پھینکا اور کھڑا ہو گیا۔

زلفی نے رکشہ روکا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

میں اب ٹھیک ہوں۔"

وہ واقعی اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

بہت شکریہ۔۔۔۔"

کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے" زلفی نے نرمی سے اس کے شانے تھپکے۔

"یہ ظالم سر درد۔۔۔۔اس نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا۔"

اس نے وضاحت پیش کی۔

"ہاں کوئی کوئی درد بڑا ظالم ہوتا ہے، زلفی کی تائید درد۔۔۔۔ہاں درد تو تھا کہیں۔۔۔۔مگر کیسی عجیب سی کیفیت ہے۔نہ غم فردا نہ خیال امروز۔۔۔۔ایک بے نیازی کا سا عالم۔۔۔۔گویا غالب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔

گھر کے پاس اس نے رکشہ روکا اور خاموشی سے نیچے اترا پھر ملیں گے۔۔۔۔" زلفی نے ہاتھ لہرایا۔

"انشاء اللہ۔۔۔۔"

اسے لگا' جیسے وہ بادلوں میں تیرتا ہوا جا رہا ہو۔۔۔۔ہواؤں کے سنگ لہراتا، جھومتا، پتا نہیں اس کے پاؤں ہواؤں میں پڑ رہے تھے یا اس کا ذہن ہی بے اختیار ہو رہا تھا۔

عالیہ نے اسے چپکے سے اپنے کمرے میں جاتا دیکھا تو پکارا۔

"جبران بھائی۔۔۔۔"

اس نے مڑ کر عالیہ کو دیکھا۔ "کیا ہے؟"

عالیہ اس کے تمتمائے ہوئے چہرے اور آنکھوں کی کھوئی کھوئی سی کیفیت پر چونک پڑی۔

"جبران بھائی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔۔؟

"ہاں ٹھیک تو ہوں۔کیوں؟"

"پتا نہیں کیوں۔آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔" عالیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں"

"تو کھانا لاؤں آپ کے لیے؟"

"نہیں۔۔۔۔مجھے بھوک نہیں۔" وہ بڑی تیزی سے کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

عالیہ تھوڑی دیر چپ کھڑی رہی۔

نہیں، یہ میرا وہم نہیں۔۔۔۔جبران بھائی کچھ پریشان ضرور ہیں۔۔۔۔کھانا بھی تو نہیں کھایا انہوں نے۔۔۔۔،

وہ متفکر سی دودھ کا گلاس لے کر جبران کے کمرے میں گئی تو وہ بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔۔۔۔اس نے ایک دو بار آہستہ سے پکارا مگر جب کوئی جواب نہ ملا تو یہ سوچ کر کہ شاید جبران بھائی آج تھک بہت گئے ہیں، واپس لوٹ آئی۔

جبران صبح اٹھا تو اس کی طبیعت گری گری سی تھی اور منہ کا ذائقہ کسیلا ہو رہا تھا۔وہ تھوڑی دیر ساکت پڑا چھت کو دیکھتا رہا۔اس کا سر بے حد بوجھل بوجھل اور ذہن تھکا تھکا سا تھا۔جیسے رات بھر کوئی بھیانک سپنا دیکھتا رہا ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرامین......سمن......اور زلفی......

اسے خیال آیا......''کیا خبر اس نے رات کوئی خواب میں دیکھا ہو......مگر نہیں۔ وہ خواب نہیں تھا......اگر زلفی نہ ملتا تو......شاید......مگر سمن نے ایسا کیوں کیا......کیا اس کی آنکھوں میں جلتے چراغ محض فریب تھے۔یا وہ مجبور ہو گئی......مگر اسے مجھ سے کچھ تو کہنا چاہیے تھا۔کوئی معذرت......کوئی تاویل۔کچھ تو۔مگر اس نے تو کچھ بھی بتانا گوارا نہ کیا......اور یوں منظر عام سے غائب ہو گئی' گویا کبھی کہیں تھی ہی نہیں۔

جبران نے ایک گہری سانس لی اور لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے رسٹ واچ اٹھائی۔ساڑھے نو ہو رہے تھے۔

''ارے......پہلا پریڈ تو مس ہو گیا۔''

جبران جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلا، پتا نہیں کیسی نیند تھی کہ صبح صادق جاگنے والا جبران دن چڑھے جاگا تھا۔

''کیا بات ہے جبران بیٹے۔آج کالج کیوں نہ گئے؟''

امی جان متفکر سی بیٹھی تھیں۔''عالیہ نے بتایا ہے کہ رات تم نے کھانا بھی نہیں کھایا طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''بس جا رہا ہوں امی جان......سر درد کی وجہ سے طبیعت خراب تھی' اس لیے دیر سے آنکھ کھلی۔''

''طبیعت زیادہ خراب ہے تو مت جاؤ آج......''

''نہیں......آج پروفیسر فاروقی نے کچھ اہم ٹاپک کرانے ہیں۔ویسے میں اب ٹھیک ہوں۔فکر نہ کریں۔''

''تو پہلے ناشتہ کر لو۔رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا۔''

جبران کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر امی جان کے خیال سے چائے کے کپ کے ساتھ ایک پیس لے کر اٹھ گیا۔

کالج میں سرامین اور سمن نیازی کی شادی کی خبر گشت کر رہی تھی۔جبران کو دیکھ کر دوستوں نے ہیلو ہائے کی۔کچھ پوچھنا بھی چاہا...... مگر جبران کے چہرے پر چھائی گمبھیر خاموشی کو دیکھ کر چپ رہ گئے۔پروفیسر فاروقی کسی وجہ سے کالج نہیں آئے تھے' جبران سب سے

کتراتا ہوا پیپل کے اس درخت کے پاس جا بیٹھا' جہاں اکثر فری پریڈز میں سمن اس کی منتظر ہوتی تھی۔کتنی بہت ساری یادیں وابستہ تھیں اس جگہ سے۔

ایک بار سمن نے بال پوائنٹ سے درخت کے تنے پر اپنے اور جبران کے ناموں کے پہلے حروف لکھے تھے۔تب جبران نے ہنستے ہوئے شرارت سے پوچھا تھا۔

ارے تم بھی نوعمر جذباتی لڑکیوں کی طرح محبت میں چاند ستاروں کو گواہ بنانے اور درختوں پر نام لکھنے پر یقین رکھتی ہو......؟''

سمن نے جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں......ہم لڑکیاں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جاتی ہیں......''

''اچھا......میرا تو خیال تھا کہ محبت میں صرف دل کی گواہی کافی ہوتی ہے۔کیا تمہارا دل تمہیں کچھ نہیں بتاتا۔

جو تصدیق کی ضرورت پڑ گئی۔''

''دل تو پاگل ہے......دل کی باتوں کا کیا اعتبار سمن بھی شریر ہونے لگی۔

اچھا تو پھر میری آنکھوں میں دیکھو، تمہیں تمہارا اعتبار مل جائے گا۔''

جبران کی آنکھوں میں ایسا والہانہ پن تھا کہ سمن کی نگاہیں جھک گئیں اور اس کے رخساروں پر گلال دوڑنے لگا۔

بلش ہوتی سمن گویا اب بھی جبران کے سامنے تھی۔

تو تمہیں اس لیے تصدیق کی ضرورت تھی کہ تم خود یقین سے خالی تھیں۔

جبران نے قلم تراش سے S-J کے حروف کھود ڈالے۔پھر یونہی ٹہنی کاٹ کر تراشنے لگا۔فراز چپکے سے اس کے قریب آ بیٹھا۔

''کیا یہ خبر درست ہے؟''اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''پتا نہیں......''وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ٹہنی تراشتا رہا۔

''اس عمر میں یہ سرامین کو کیا سوجھی......؟''

''پوچھ لو جا کر......''

''یار سمن ایسی لگتی تو نہیں تھی۔''

''کون کیسا ہے۔یہ وقت پڑنے پر ہی معلوم ہوتا ہے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبران نے بے پروائی سے کہا۔

"ویسے سمن نے کیا کیا......؟"

"تمہیں معلوم نہیں؟ فراز نے حیرانی سے کہا۔

"سرامین اور سمن کی شادی کا......؟"

"تو پھر......"

"ہمارا تو خیال تھا کہ تم اور سمن ایک دوسرے سے......"

وہ ہچکچایا۔

"غلط خیال تھا تمہارا......" جبران کا لہجہ ترش ہو گیا۔

پل بھر فراز اسکے چہرے کو دیکھتا رہا۔ الجھے الجھے سے جبران کے چہرے پر سختی مگر حد درجہ ملال تھا۔

"سمن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا" اس نے افسردگی سے کہا۔

"شٹ اَپ، مجھے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں......" جبران نے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کو توڑ کر پھینک دیا اور کھڑا ہو گیا۔

اچانک اسے یاد آیا۔ ایک بار سمن کو اپنے کسی عزیز کی شادی میں حیدر آباد جانا پڑا تھا۔ جبران پریشان تھا کہ وہ بغیر بتائے کہاں غائب ہو گئی۔ کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو......یا کوئی اور سنگین مسئلہ نہ ہو۔ سمن کی واپسی پر اس نے گلہ کیا تو سمن نے معذرت کی کہ اسے اچانک جانا پڑا تھا۔ حالانکہ پہلے کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس لیے اسے نہ بتا سکی۔

اس پر جبران نے کہا تھا۔

"ایسا نہ ہو سمن، کسی دن تم یوں ہی اچانک غائب ہو جاؤ بغیر کوئی پتا، نشان دیے اور میں تمہیں ساری دنیا میں ڈھونڈتا پھروں......سمن سمن پکارتا......جنگل و بیابان میں......قیس کی طرح......' پھر وہ سنجیدہ ہو گیا......

"ویسے سمن رابطے کا کوئی ذریعہ تو ہونا چاہیے۔ اگر تمہیں کوئی اچانک اس طرح کی مجبوری پڑ جائے تو مجھے اطمینان تو ہو جائے کہ تم بخیریت ہو......"

اچھا......" سمن نے کچھ سوچ کر اس کے ہاتھ سے فائل لے لی اور اس پر ایک فون نمبر لکھا۔

"ہمارے ہاں فون نہیں ہے۔ یہ نمبر میری ایک دوست عظمیٰ کا ہے۔ اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل ساتھ ہے۔

تم اس سے بات کر کے میرے متعلق پوچھ سکتے ہو......مگر صرف ایمرجنسی میں......"

مگر نہ سمن پھر کبھی بغیر بتائے غائب ہوئی اور نہ جبران کو اس نمبر کی ضرورت پڑی۔

جبران نے فائل کھولی۔ سمن کا لکھا ہوا نمبر فائل میں موجود تھا......

مجھے اس سے بات تو کرنی چاہیے......' وہ تیزی سے باہر لپکا......میں اس سے پوچھوں تو سہی کہ آخر کیوں......یہ دھند تو چھٹے جو میرے چاروں طرف پھیلی ہے......اور یہ جالے سے جو آنکھوں کے سامنے تنے ہیں......کچھ تو مجھے ان کے پیچھے نظر آئے......کوئی بات تو میری سمجھ میں آئے......کہ یہ سب کیا ہوا،

اس نے نمبر ملائے اور منتظر کھڑا رہا۔ دوسری بیل پر کسی نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو......" آواز کسی لڑکی کی تھی۔

"ہیلو......کیا آپ عظمیٰ ہیں......؟" جبران کا لہجہ محتاط تھا۔

"جی ہاں......مگر آپ کون ہیں؟"

مجھے سمن سے بات کرنی ہے، کیا آپ اسے بلا دیں گی، پلیز......"

"سمن......وہ تو یہیں ہے مگر آپ......"

"پلیز سمن کو فون دیں۔" جبران نے بے تابی سے کہا۔

"ہیلو......" ریسیور پر سمن کی آواز ابھری۔

"سمن......یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" جبران نے بے قراری سے پوچھا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی......پھر سمن کی یخ، بے مہری آواز آئی......

"بس......ایک چیپٹر تھا جو کلوز ہو گیا۔"

"بس......تمہارے نزدیک یہ صرف اتنی سی بات ہے۔ جبران کو زبردست شاک پہنچا۔" تو تم مجھے اتنا عرصہ فریب دیتی رہیں......محبت کے نام پر......؟"

جبران دیکھو، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں......میری بات دھیان سے سنو......" آگ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ تمہیں اسٹیبلش ہونے کے لیے وقت درکار ہے۔ اور میں یہ رسک نہیں لے سکتی......" وہ کتنی اجنبی اور بے حس ہو رہی تھی۔

"تو تم محبت میں بھی ترازو ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں؟"

جبران نے دکھ سے کہا، سود و زیاں کا حساب کرنے سے پہلے یہ تو سوچا ہوتا کہ چاہے مجھے کتنا بھی وقت لگتا۔ تھا تو میں سرتاپا تمہارا......اور چاہے تمہارے دل میں کچھ بھی تھا......میں تو اپنے جذبوں میں سچا تھا......"

"ہم اچھے دوست رہے ہیں جبران اور ہمیں اچھے دوستوں کی طرح ہی جدا ہو جانا چاہیے۔" سمن کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"دوستی......مائی فٹ"......جبران کو غصہ آ گیا......

"مگر ہاں، تم میری محکوم نہیں......اور اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو......سوری......میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔"

"برا مت ماننا جبران......ویسے بھی میرے والدین......منشیات کے کاروبار میں ملوث کسی شخص کو قبول نہ کرتے......"

"سمن......تم بھی......"

مارے دکھ کے جبران سے مزید نہ بولا گیا تو اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

باہر آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مگر جبران کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھا رہے تھے اور اسے راستہ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

تو سمن بھی یہ سمجھتی ہے کہ میں نے علی زیب کو......گویا اپنے جذبوں کی سچائی کے باوجود میں اس پر اتنا اعتبار بھی قائم نہ کر سکا تھا۔ کس قدر قابل رحم بات ہے اور ایک سفاک حقیقت......اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ سمندر میں چھلانگ لگا دے۔ یا چلتی ریل کے نیچے سر دے دے......یا پھر اس چھوٹی سی دنیا کو ہی اپنی مٹھی میں دبا کر کرچی کرچی کر دے۔

مگر اس نے کچھ بھی نہ کیا......بس واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

نہیں......میری دنیا صرف سمن تک محدود نہیں......"

اس نے خود کو یاد دلایا۔

میرا ایک پیارا سا گھر ہے' جس میں میری پیاری سی امی ہیں۔ ابو ہیں اور بہن بھائی ہیں......اور ان سب کے کچھ خواب ہیں......اگر میری آنکھوں کے خواب اجڑ گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے پیاروں کی آنکھوں کے خواب نوچ ڈالوں......نہیں مجھے

جینا ہے، ان سب کے لیے......بہر صورت......"

مگر اس کے اندر سے جینے کی امنگ ختم ہو رہی تھی۔

گھر سے کچھ دور زلفی اس کا منتظر تھا۔

"میں ابھی تمہارے گھر سے آ رہا ہوں......رات تمہاری حالت ایسی تھی کہ میں پریشان ہو گیا۔ اور اب اسی فکر میں تمہاری خیریت معلوم کرنے دوڑ آیا۔"

"شکریہ، میں اب ٹھیک ہوں......"

جبران زلفی کے حد درجہ خلوص پر حیران ہو رہا تھا۔

"چلیں گھر چلتے ہیں......ایک کپ چائے ہو جائے تو کیا حرج ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں حرج تو کوئی نہیں مگر گھر نہیں۔ یہیں چائے پی لیتے ہیں، اس نے ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"چلیے، یہیں سہی۔"

جبران نے چائے اور کچھ اسنیکس کا آرڈر دیا۔

زلفی سگریٹ سلگانے لگا۔

"سگریٹ لو گے؟"

وہ عادی تو نہیں تھا مگر سرامین کی صحبت میں کبھی کبھی پی لیتا تھا۔ اور اس وقت تو سگریٹ دیکھتے ہی اس کے اندر ایسی بے قراری سی طلب جاگی' جیسے کسی پیاسے کو اچانک پانی نظر آ جائے۔ غیر ارادی طور پر اس نے سگریٹ تھام لیا۔ زلفی نے لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔ جبران نے سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لیے۔ عجیب سی آسودگی اس کے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ اینٹھن اور کھنچاؤ سا' جو صبح سے ساری رگوں کو کھینچ رہا تھا، کم ہونے لگا۔ اس نے ایک اور گہرا کش لیا۔ یہ کیسا سگریٹ ہے۔ اس نے بغور سگریٹ کو دیکھا۔ بظاہر تو اس میں کوئی خاص بات نہ تھی......پھر اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا......

"نہیں......" اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے لگا جیسے اس نے کوبرے کے پھن پر ہاتھ ڈال دیا ہو......گھبرا کر اس نے سگریٹ پھینکا اور اسے پاؤں تلے مسل دیا۔

"کیا ہوا......؟" زلفی نے اسے چونک کر دیکھا۔

اس نے بغیر کچھ کہے زلفی کے ہاتھ سے سلگتا ہوا سگریٹ لے لیا۔ اور ایک گہرا کش

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیا...... پھیکا اور بے مزہ......نہیں۔

یہ وہ سگریٹ نہیں تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے ہاتھ میں تھا۔ حالانکہ نام وہی تھا۔

''ذوالفقار احمد ذلفی صاحب......آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟'' اس نے سگریٹ پھینک کر زلفی کی آنکھوں میں جھانکا۔

''دشمنی......ارے بھئی ہم تو دوستی کے خواہاں ہیں......دشمنی کیسی......؟'' زلفی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

''تو پھر یہ سگریٹ ...... مجھے خوامخواہ ہی وہم ہو گیا تھا شاید ......پلیز ایک سگریٹ اور دیجیے۔''

زلفی کی پریشان آنکھوں میں اطمینان اتر آیا۔ اس نے گولڈ لیف کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ منتخب کر کے اس کی طرف بڑھایا۔

جبران نے سگریٹ سلگا کر ہلکا سا کش لیا۔ اور پھر سگریٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''لیجیے......جب دوستی کی ہے تو شیئر بھی کیجیے۔''

''نہیں میں اور لے لیتا ہوں تم پیو......'' زلفی نے جیب ٹٹولی۔

نہیں اور نہیں یہی میرا وہم صرف اسی طرح دور ہو گا......''

زلفی کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا......اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ لیا مگر اسے پھینک کر سر بازوؤں میں چھپا لیا۔

ویٹر چائے اور اسنیکس لے آیا تھا اور میز پر رکھ رہا تھا۔

جبران کے اندر ایک گہرا سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اس کا دل دھک دھک کرتا زلفی کے پھینکے ہوئے سگریٹ کو اٹھانے کے لیے مچل رہا تھا مگر وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا ......نہیں...... یہ ٹھیک نہیں......میری امی اور ابو نے اتنی محبت اور مشکلوں سے مجھے اس لیے نہیں پالا کہ میں اپنے آپ کو تباہ کر لوں...... مجھے ان برائیوں کے خلاف لڑنا ہے۔ مگر ایک کش لگانے میں حرج ہی کیا ہے۔ کیسی سکون آور سی کیفیت تھی کیف ہی کیف سکون ہی سکون۔ دنیا سے بے نیاز کر دینے والی کیفیت ......اس نے منشیات کے عادی بہت سے مریض دیکھے تھے......اور اسے معلوم تھا کہ اگر ایک بار اس نے سگریٹ اٹھا لیا تو پھر یہ آخری بار نہیں ہو گا...... ابھی تو صرف ابتدا تھی وہ اپنے آپ کو کنٹرول کر سکتا تھا......اپنی طلب کو مار سکتا

تھا۔ اپنی قوت ارادی کے بل پر اپنی خواہش کو ختم کر سکتا تھا لیکن اگر وہ عادی ہو گیا......تو نہ یہ قوت ارادی رہے گی نہ وہ خود......نے چراغے نہ گلے......وہ تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا......مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فوراً ہی پتا چل گیا......اگر دیر ہو جاتی تو پھر ہاتھ ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

وہ پریشان سا کھڑا تھا۔

''کاش زلفی صاحب...... مجھے معلوم ہو جاتا کہ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ سگریٹ پاؤں تلے کچلتا باہر نکل آیا۔

اس کا دل سخت گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچا، وہ امی کی گود میں سر رکھ کر اتنا روئے کہ دل کا سارا غبار اور سارا غم آنسوؤں میں بہہ جائے......مگر سب کو پریشان کرنے کا فائدہ...... پتا نہیں، اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا تھا کہ زمین آسمان مخالف ہو رہے تھے۔

یہ دنیا کتنی بری ہے......اس نے سوچا۔

یہاں لوگ زہر کو شہد میں ملا کر دیتے ہیں۔ اور چہرے پر ماسک چڑھا لیتے ہیں......کاش ہر ایک کے پاس ماسک کے پیچھے دیکھنے والی آنکھیں ہوتیں......اگر عثمان بھائی یہاں ہوتے تو......مگر وہ سرامین کی بھی تو عثمان بھائی کی طرح ہی عزت کرتا تھا......اور ان سے ہر معاملے میں بلا جھجک مشورے لے لیا کرتا تھا مگر اب ......ایک وہ تھی جو کچے گھڑے پر تیر گئی......اور ایک یہ جو ڈوبنے کے ڈر سے بیچ منجدھار میں چھوڑ گئی۔

اس کا دل گہری مایوسیوں میں گھرنے لگا۔

کیا ہوتا جو یہ لڑکی اس کا مقدر ہوتی......اس نے کب پوری کائنات مانگ لی تھی بس صرف اس کا ساتھ ہی تو......اور اب یہ نیا چکر......اس کی آنکھوں میں ویرانیاں تیرنے لگیں......

مگر ابھی کچھ بگڑا نہیں......پھر بھی مجھے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لینا چاہیے......مگر وہ سرامین......وہ کہتے تھے، دنیا کا ہر ذائقہ چکھنا چاہیے......تو کیا زہر کا بھی۔؟

اور پھر بلا جواز جینے کا فائدہ...... یہ خوامخواہ کی تگ و دو کس لیے......؟''

پے در پے واقعات نے اسے اندر سے کمزور کر دیا تھا۔

مگر وہ پھر بھی دفاع کر رہا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے......ان سب کے لیے جو میرے اپنے ہیں زندگی اتنی غیر اہم نہیں کہ اسے یوں قربان کر دیا جائے اور جو جان دینی ہی ہے تو کسی بڑے مقصد کے لیے کیوں نہیں۔ذاتی غم کی خاطر کیوں؟ مجھے ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا چاہیے۔

اس کا رخ ڈاکٹر رحمٰن کے کلینک کی طرف ہو گیا۔مگر ابھی وہ چند قدم ہی چلا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار سیاہ پجیرو اس کے قریب رکی۔دروازہ کھلا اور تین آدمیوں نے اسے باہر نکل کر پکڑ لیا......

"کون ہو تم......؟"

جبران نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔مگر بے سود وہ اسے دھکیلتے ہوئے گاڑی تک لائے......اندر پھینکا......اور اگلے ہی لمحے گاڑی ہوا ہو گئی۔جبران سنبھلا تو وہ دو آدمیوں کے درمیان پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کے اردگرد بیٹھے دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں ماؤزر تھے۔

"کون ہو تم......اور مجھے اس طرح کہاں لیے جا رہے ہو؟"

جبران نے سنبھل کر پوچھا۔

"چپ کر اوئے......" دائیں طرف بیٹھے لمبی مونچھوں والے شخص نے اسے گھُرکا۔

بائیں جانب بیٹھا شخص ہاتھ میں فوٹو گراف لیے جبران کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا نام جبران واسطی ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، مگر میں تمہیں نہیں پہچانتا......" اس نے الجھ کر کہا۔

"ابے پہچان تو ہم تمہیں خوب کروائیں گے......"

مونچھوں والے نے پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر مارا تو اس کے حواس جواب دے گئے......ہوش آیا تو رات گہری ہو چکی تھی اور وہ کسی گلی میں پڑا تھا۔اس کا سر ابھی تک دکھ رہا تھا۔ڈگمگاتے قدموں سے وہ گلی سے نکلا تو اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ گھر سے زیادہ دور نہیں۔وہ جو کوئی بھی تھے اسے گھر کے قریب ہی پھینک گئے تھے۔

مگر کیوں......اس کے دُکھتے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

گھر میں سب پریشان تھے۔

"تم اس طرح بغیر بتائے کہاں چلے گئے تھے جبران......؟"

امی جان نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ......وہ امی جان ایک دوست زبردستی اپنے گھر لے گیا تھا۔باتوں باتوں میں وقت کا پتا نہ چلا......"

پہلی بار جھوٹ بولتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"تمہیں بتا کے تو جانا چاہیے تھا......" ابو جان نے خفگی سے کہا۔

اور یہ تم مٹی مٹی کیوں ہو رہے ہو......؟" امی جان نے متفکر ہو کر پوچھا۔"سچ بتاؤ جبران......تم کہاں تھے اب تک؟"

جبران نے سر پر ہاتھ پھیرا تو چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی اور اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔

"امی......جبران بھائی زخمی ہیں......" عالیہ خوفزدہ ہو کر چیخی۔

"اللہ خیر......" امی جان نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"میں ٹھیک ہوں، امی جان......پریشان مت ہوں، دراصل جب میں گھر آ رہا تھا تو ایک اسکوٹر سوار مجھے ٹکر مار کر بھاگ گیا۔میرا سر شاید کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اسی لیے بے ہوش ہو گیا میں آپ کی پریشانی کے خیال سے آپ کو بتانا نہیں چاہ رہا تھا اس لیے......"

"تو اتنی دیر تک آپ وہیں سڑک پر بے ہوش پڑے رہے......؟" عالیہ نے پریشانی سے پوچھا۔"اور کسی نے دیکھا تک نہیں......"

"دیکھا بھی ہو تو کون اپنی جان مصیبت میں ڈالتا ہے۔"

"تم اتنی دیر بے ہوش پڑے رہے وہاں......اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو......" امی جان ہول کر رونے لگیں۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا امی جان......معمولی چوٹ ہے۔اس نے امی جان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

امی جان نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"اللہ تمہیں سلامت رکھے بیٹا جگ جگ جیو۔کبھی گرم ہوا نہ لگے۔نادیہ منہ کیا دیکھ رہی ہو جلدی سے گرم پانی اور روئی لاؤ۔اور عالیہ تم گرم دودھ لاؤ بھائی کے لیے شہد بھی ڈال دینا۔"

نادیہ گرم پانی اور روئی لائی تو امی جان نے اپنے ہاتھوں سے اس کا زخم صاف کیا۔اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوا لگائی جبران کا دل کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر امی جان کے خیال سے اس نے دودھ پی لیا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ دیر تک دن کے واقعے پر غور کرتا رہا۔اس کا سارا بدن دکھ رہا تھا اور جسم میں اینٹھن سی تھی۔شاید یہ ان سگریٹ کی وجہ سے تھا پین کلر ٹیبلیٹ لے کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

اس کے ذہن میں بہت سے خیالات ......گڈمڈ ہو رہے تھے۔

پتا نہیں ذوالفقار احمد ذلفی نے ایسا کیوں کیا۔مجھے بہر صورت ڈاکٹر سے ملنا چاہیے تھا۔خیر کل سہی۔اس نے سوچا۔

مگر اگلے دن بھی ڈاکٹر کے پاس نہ جا سکا۔نکلا تو وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ہی تھا مگر کسی نے اس کے منہ پر کلوروفارم رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا۔اتنا تو اسے یاد تھا کہ وہ بس میں بیٹھا تھا اور اس کے قریب کھڑے شخص کے ہاتھ سے رومال چھوٹ کر اس پر گرا تھا۔جو بھیگا بھیگا سا تھا اور اس میں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔پھر اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔"

جب اسے ہوش آیا تو کنڈیکٹر اسے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔

"بھائی کیا افیون کھا کر سوئے تھے۔آخری سٹاپ آ گیا ہے تمہیں جانا کہاں ہے......؟"

"میں......پتا نہیں ......مجھے یہیں اتار دو......"اس کا سر چکرا رہا تھا اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آ جاتے ہیں......"کنڈیکٹر بڑبڑایا۔اور اسے سہارا دے کر نیچے اتار دیا۔

بڑی دیر بعد اسے یاد آیا کہ وہ تو ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے نکلا تھا اور غالباً وہ رومال جو اس کے منہ پر گرا تھا کلوروفارم میں بھیگا ہوا تھا۔

"مگر کیوں میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟"اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

رات بستر پر لیٹتے ہوئے وہ بہت بے چین تھا۔بازوؤں کو ہولے ہولے دباتے ہوئے اس نے دیکھا......اس کی سفید قمیض کی آستین پر چھوٹا سا خون کا دھبا تھا۔بے خیالی میں اس نے دھبے کو مسلا تو اسے بازو میں خفیف سی چبھن محسوس ہوئی۔جیسے ہلکے سے سوئی چبھے......بے

اختیار وہ اٹھ بیٹھا......اس نے قمیض کی آستین الٹی تو دیکھا کہ اس کے بازو پر انجکشن کا نشان تھا......خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔

"یہ لوگ کون ہیں......جو بھری بس میں اتنی دیدہ دلیری سے بے ہوش کرتے اور انجکشن لگاتے ہیں......؟"

اگر بے احتیاطی کی وجہ سے خون نہ نکلتا تو اسے کبھی پتا نہ چلتا۔اس نے دیکھا کہ قمیض کی آستین پر بھی انجکشن گھونپنے کا نشان تھا......گھبرا کر وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بغور خود کو دیکھا......اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ رہے تھے اور ہاتھوں پر لرزہ طاری تھا۔

تو کیا وہ ایڈکٹ ہو رہا ہے؟اسے ایڈکٹ کیا جا رہا ہے......"

اس نے وحشت زدہ ہو کر سوچا۔اور بے اختیار چیخ اٹھا۔

نہیں......ایسا نہیں ہو سکتا۔ایسا نہیں ہو گا۔میری کسی سے کیا دشمنی یقیناً یہ میرا وہم ہے۔وہ خود کو تسلی دینے لگا۔

شاید یہ نشان کسی پن چبھنے کا ہے۔یا بے دھیانی میں کوئی نوکدار چیز چبھی ہو اور مجھے پتا نہ چلا ہو مگر وہ کون لوگ ہیں جو مجھے اس طرح خوف زدہ کر رہے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے۔شاید وہ کسی غلط فہمی میں میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں شاید انہیں مجھ پر کسی اور کا شبہ ہے......اور اگر یہ انجکشن ہی ہے تو اس کی تصدیق کیسے ہو،بغیر کسی ڈاکٹر کے پاس جائے......پتا نہیں میں کیوں اس قدر زود حس ہو رہا ہوں......بے کار اوہام کا شکار اور نادیدہ دشمنوں سے خوف زدہ......"

اس کی نظر سرامین کے دعوتی کارڈ پر پڑی۔

اسے یاد آیا......جب وہ شام کو الجھا الجھا سا گھر پہنچا تھا تو عالیہ نے سرامین کی شادی کا کارڈ اسے تھما دیا تھا۔سنہرے حروف میں لکھا ہوا......خوشیوں کی نوید دیتا۔مگر اس کی آنکھوں کے سامنے حروف سیاہ پڑ رہے تھے۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ سرامین شادی کر رہے ہیں......؟"

عالیہ نے پوچھا۔

مگر جبران خاموش سنہرے حروف کو گھورتا رہا......یہاں اس جگہ پر سرامین کے نام کے بجائے اس کا نام بھی ہو سکتا تھا ہاں مگر ایسا نہیں ہوا۔ایک ایسا خواب اس نے دیکھا تھا' جس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی تعبیر اس کے مقدر میں نہ تھی۔

اس نے کارڈ اٹھایا اور اسے کھول کر پڑھا۔

پروفیسر امین ملک کی شادی نذیر احمد نیازی کی بیٹی سمن نیازی سے......

''اوہ سمن تم نے ایسا کیوں کیا۔کیوں میری آنکھوں کے سارے خواب نوچ ڈالے......میں بے حوصلہ نہیں ہوں......مگر ایسے شخص کو مقابل دیکھنا' جس کا دل سے احترام کیا جائے کتنی ظالمانہ سی بات ہے......اور تم اس قدر بدگمان کہ مجھے صفائی کا موقع تک نہ دیا......''

''ایک چیپٹر کلوز ہو گیا اور بس......''

''اتنی سفاکی......اور ایسا بے رحم لہجہ......اور سر امین ستم تو یہ ہے کہ میں ان سے نفرت بھی نہیں کر سکتا۔

وہ کارڈ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

صبح وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلا مگر اس کا کالج جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔یوں ہی بلاوجہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔

سر امین نے صبح فون کر کے اسے بڑے اصرار سے بلایا تھا۔مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھتا۔دیر تک وہ پارک میں بیٹھا رہا۔

پارک بھی اس کے دل کی طرح ویران تھا۔وہ سمن کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر بار بار دھیان ادھر چلا جاتا۔پتا نہیں، وہ دلہن بن کر کیسی لگ رہی ہو گی۔اور کیا اسے پل بھر کے لیے بھی میرا خیال نہ آیا ہو گا......مگر وہ نہ بے وقوف ہے نہ جذباتی......،اس نے تلخی سے سوچا۔

اسے یادوں سے پیچھا چھڑانا بھی آتا ہے۔اور نئی سرزمینوں پر قدم جمانا بھی......وہ اپنے پیچھے سارے دروازے بند کر کے نئی دنیا میں داخل ہوئی ہے......اور مجھے بھی اب اس کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے......اب وہ سر امین کی زندگی کی ساتھی ہے......اور ان کے ناتے میرے لیے قابل احترام......مجھے بہر حال اسے بھولنا ہے۔

اس کے اندر ویرانی اور سناٹا بڑھتا جا رہا تھا پھر اچانک گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا۔

کیا کروں میں......کس سے کہوں کہ میرے ساتھ کیا بیتی۔

کاش کوئی ہوتا......میرے دکھتے ہوئے دل پر کوئی مہربان ہاتھ میرے سر کا بوجھ

سہارنے کے لیے کوئی کندھا......میری خشک آنکھوں کو سیراب کرنے والا آنسو......یا پھر وہی......میرا قاتل میرا دلدار......''

جس گھڑی رات چلے

جس گھڑی ماتمی......سنسان رات چلے۔

تم میرے پاس رہو۔

میرے قاتل، میرے دلدار میرے پاس رہو۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا......پتا نہیں کتنے عذاب تھے' جو ایک ساتھ ہی اس پر نازل ہو گئے تھے......لحہ بہ لحہ لگنے والے دھچکے۔اور اس کا تنہا وجود......اس کا سر سنسنا رہا تھا اور پورے جسم میں دکھن تھی......سامنے ڈاکٹر شیرازی کا کلینک تھا......اس نے صرف پل بھر سوچا......اور اگلے ہی لمحے وہ ان کے سامنے تھا۔

''تم پھر آ گئے؟''ڈاکٹر شیرازی کی پیشانی پہ شکنیں پڑ گئیں۔

''میں کسی کی خاطر نہیں۔اپنے لیے آیا ہوں۔''اس نے رک رک کر کہا''بطور پیشنٹ

''پیشنٹ......؟''ڈاکٹر شیرازی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جی ہاں مجھے یہ شک ہے کہ مجھے نشہ دیا جا رہا ہے اور اب مجھے آپ سے اس کی تصدیق یا تردید چاہیے۔''

''تمہیں کون نشہ دے رہا ہے''

''بعض اوقات کسی بے گناہ پر بھی فرد جرم لگائی جاتی ہے۔شاید وہ بھی کچھ ایسے ہی لوگ ہیں؟اس نے تلخی سے کہا'حکم صادر کرنے والے؟

ڈاکٹر شیرازی نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا پھر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔''اچھا ٹھیک ہے بیٹھو؟

انہوں نے اس کی آنکھوں کے پپوٹے ہٹا کر دیکھا......دو چار سوال کیے اور مکمل چیک اپ کے بعد اس کے خدشوں کی تصدیق کر دی۔

'ابھی دیر نہیں ہوئی تم اس سے چھٹکارا پا سکتے ہو۔چاہو تو اسی کلینک میں؟ڈاکٹر شیرازی نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس کلینک میں؟" جبران نے زہر خند سے کہا......

"جہاں سسٹر فیروزہ جیسے مسیحا ہوں۔ بہت شکریہ۔"

وہ باہر نکلا تو ڈاکٹر شیرازی کے کلینک کے عین سامنے سڑک پر سیاہ 'پجیرو' نظر آئی' جس کے ساتھ ٹیک لگائے لمبی مونچھوں والا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا پل بھر کے لیے جبران ٹھٹکا پھر سیدھا اس کی طرف بڑھا۔ مونچھوں والا ذرا سا چونکا پھر لاپروا نظر آنے لگا جبران اس کے قریب جا کر رکا۔

"سنو...... تم جو کوئی بھی ہو...... آج بتا ہی دو کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں کر رہے ہو۔" جبران نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"واہ بھئی، بڑا زعم ہے، بادشاہو......" مونچھوں والا تمسخر سے ہنسا۔

جبران کے خون میں ایک ابال سا اٹھا اور اس نے مونچھوں والے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ تمہیں آج بتانا ہی پڑے گا تم کس کے کہنے پر...... مونچھوں والا مسکرایا۔ اس نے جبران کا ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹایا اور بڑے دوستانہ انداز میں اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو میرے دوست...... بتا دیں گے آہستہ آہستہ اتنی جلدی کا ہے کی.........."

جبران نے اس کے بازو گلے سے نکالنا چاہے مگر اس کی بظاہر دوستانہ گرفت بڑی مضبوط تھی۔ پھر جانے کہاں سے دو آدمی اس کے دائیں بائیں آ گئے۔

"چلو۔" دائیں طرف کھڑے آدمی نے اسے ماؤزر سے ٹہوکا دیا جو اس نے بدن کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ مونچھوں والا اسے بازوؤں میں لیے گاڑی کی طرف بڑھا اور اسے اندر دھکیلا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی میں وہ دو آدمیوں کے درمیان بیٹھا تھا اور گاڑی رفتار پکڑ رہی تھی۔ جبران نے بے بسی سے باہر سڑک پر دیکھا۔ اتنے لوگ آ جا رہے تھے مگر کسی کو بھی اندازہ نہ ہوا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی واردات ہو چکی ہے۔

بھری پری سڑک پر اسے اتنے غیر محسوس طریقے سے اغواء کیا گیا تھا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ جبران نے بے بسی سے سیٹ کی پشت پر سر ڈال دیا۔

گاڑی میں ایک اعصاب شکن خاموشی تھی۔ دیر بعد جبران نے سر اٹھایا۔

"تم مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ آخر مجھے اپنا قصور تو معلوم ہو......"

پھر کوئی ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جم گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔

پھر کوئی کپڑا سا اس کے چہرے پر گرا...... پھر وہی کلوروفارم کی بو...... وہی سرنج کی چبھن...... اور سوتی جاگتی سی کیفیت میں ان کی باتوں میں بھنبھناہٹ...... اور پھر گہری تاریکی اور ہوش آنے پر اپنے آپ کو کسی ویران گلی میں پانا۔

"نہیں...... یہ سب ناقابل برداشت ہے۔"

اپنے کمرے میں کوئی بیسواں چکر لگاتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

میں اپنا آپ یوں تباہ ہوتا افورڈ نہیں کر سکتا۔ تو پھر کیا چارہ کار ہو؟ وہ برابر چکر لگا رہا تھا......

میں کیسے اپنے آپ کو بچاؤں...... ان دیکھے ہاتھوں سے' جو چھپ کر وار کرتے ہیں...... آخر وہ کون ہیں جو بلا وجہ مگر کیوں......؟"

کوئی بات تھی جو اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی وہ سوچ میں ڈوب گیا' جب وہ ہوش میں آ رہا تھا...... یا شاید ذہن پر دم بہ دم چھاتی غنودگی کو جھٹک دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا...... تو اس کے کانوں میں چند ادھورے سے الفاظ پڑے تھے جنہیں اس کا ذہن مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے سکا تھا۔

وہ اپنی کنپٹیاں رگڑنے لگا۔

اس وقت جب تاریکی گہری ہو رہی تھی۔ یا چھٹ رہی تھی۔ مونچھوں والے نے کوئی نام لیا تھا باقی بات تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی...... مگر وہ نام...... کوئی جانا پہچانا...... آشنا سا...... اسے یاد آ گیا۔

منظورا پان والا...... غالباً اس کے بارے میں انہوں نے کوئی بات کہی تھی۔

تو یہ بات ہے، اس نے گہری سانس لی۔ تو یہ سارا جھگڑا اس لیے شروع ہوا کہ...... مگر اب کیا ہو......؟"

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں...... پچھتاوا اس کے اندر اترنے لگا۔

میں نے خود اپنی شامت کو آواز دی ہے۔ اور اب مجھے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں مل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا......"

دیر تک وہ سر ڈالے پڑا رہا۔

لیکن اگر سب لوگ یونہی سوچنے لگیں تو آگے کون بڑھے گا......کون اس آگ کو بجھائے گا۔"

بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

نہیں......میں اس ڈر سے خاموش نہیں بیٹھ سکتا کہ میرے ہاتھ بھی جل جائیں گے۔ مجھے اس آگ کو بجھانے کی کوشش تو کرنا ہی تھی اور میں نے کچھ غلط نہیں کیا...... چاہے اس کی کوشش میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

مگر......مگر اس طرح سسک سسک کر مرنا......"

وہ پھر مضطرب سا ہو گیا۔

اور وہ اذیت ......جس کے احساس سے ہی اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ اس نے سر بازوؤں میں گرا لیا اور کتنی ہی دیر یوں ہی ساکت پڑا رہا۔

اور اگر میں یہاں سے چلا جاؤں......بہت چپکے سے......بنا کسی کو بتائے تو پھر شاید میں ان کی گرفت سے بچ سکوں......"

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ہاں......جب انہیں پتا ہی نہیں ہو گا کہ میں کہاں ہوں تو وہ مجھے کہاں ڈھونڈیں گے ......مگر کہاں......؟"

اس نے صرف پل بھر غور کیا......پھر جلدی جلدی بیگ میں کپڑے رکھے اور اگلے ہی لمحے وہ عالیہ کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا تھا۔

"عالیہ......عالی......دروازہ کھولو......"

"جبران بھائی آپ......"

"عالی......تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟"

جبران نے کمرے میں آتے ہی پوچھا۔

"پیسے......" عالیہ نے حیران ہو کر وال کلاک کی طرف دیکھا ایک بج رہا تھا۔ "مگر اس وقت......رات کے اس پہر کیا ضرورت پڑ گئی پیسوں کی......؟"

"کچھ پوچھو نہیں......" جبران کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

"بس یوں سمجھو......یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

جبران کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

عالیہ نے اپنی ساری بچت جو دو ہزار روپے تھی، اس کے سامنے رکھ دی۔

"شکریہ......میں کوشش کروں گا کہ جلدی لوٹا دوں۔"

"ان تکلفات کو چھوڑیں جبران بھائی......" عالیہ نے متفکر ہو کر کہا۔ "آپ کا رویہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ آپ آخر کیا کرنے جا رہے ہیں؟"

"میں اپنا آپ بچانے کی سعی کر رہا ہوں۔" وہ رکا

"امی جان اور ابو جان کو تسلی دینا اور کہنا کہ میں جلد لوٹوں گا۔"

"مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟" وہ پریشان ہو گئی۔

"پتا نہیں ......کچھ کہہ نہیں سکتا......جبران خود بھی الجھ رہا تھا......" ہاں مگر جہاں بھی ہوا، فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

"کیا آپ کسی چکر میں پھنس گئے ہیں اور آپ کو اپنی جان کا خطرہ ہے؟" عالیہ کا رنگ اڑنے لگا۔

"یوں ہی سمجھ لو......بلکہ اس سے بھی زیادہ......ابھی خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ......مگر میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ تم بھی دعا کرنا......اللہ بیلی......"

"جبران بھائی......عالیہ نے روک کر کہا......" کہیں آپ سمن کی وجہ سے تو......"

"سمن......" جبران چونک پڑا۔

"جبران بھائی......کیا آپ کو معلوم نہیں کہ......" عالیہ چپ سی ہو گئی۔ "پروفیسر امین بار بار فون کرتے اور آپ کا پوچھتے رہے ہیں......؟" اس نے آہستہ سے بات بدل دی۔

"تم سمن کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔" جبران کی نظریں عالیہ پر تھیں۔

"جی......" عالیہ نے بغور بھائی کو دیکھا۔

"وہیں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ جس سمن نیازی سے پروفیسر امین کی شادی ہو رہی ہے، یہ وہی سمن ہے جو......"

"فار گیٹ اٹ......" جبران نے بے صبری سے ہاتھ ہلایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بعض بے وقوف غلطی سے پرائے خواب آنکھوں میں بسا لیتے ہیں۔اور پرائے تو پرائے ہوتے ہیں۔" اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔"اور پروفیسر امین میرے لیے بہت محترم ہیں۔

"بہت قابل عزت۔"

"تو پھر آپ جا کہاں رہے ہیں......؟"

"بے وقوف میں خودکشی کرنے نہیں جارہا۔" جبران جھنجھلا گیا۔"میں تو زندگی کی تلاش میں جارہا ہوں......جو کچھ قاتل ہاتھوں کی پناہ میں ہے۔باقی سوال جواب واپسی پر......بائے۔"

وہ ہاتھ ہلاتا رات کے اندھیرے میں کہیں گم ہوگیا۔اور عالیہ انجانے اندیشوں میں گھری اس کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔

جبران گھر سے تو بلا سوچے سمجھے نکلا تھا مگر اسٹیشن پہنچنے تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔عثمان بھائی کی پوسٹنگ کراچی ہوگئی تھی اور کچھ ہی دن پہلے وہ وہاں شفٹ ہوئے تھے۔اس کے خیال میں صرف وہی اسے بھنور سے نکالنے میں مدد کر سکتے تھے کراچی جانے والی ٹرین تیار کھڑی تھی۔

ٹکٹ ملنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔کراچی پہنچ کر اس نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا۔اور وہاں سے عثمان بھائی کو فون کیا۔

"عثمان بھائی، میں یہاں کمرہ نمبر سات میں ہوں۔" اس نے ہوٹل کا نام بتاتے ہوئے کہا۔"آپ پلیز مجھ سے فوراً مل لیں۔"

"مگر تم نے یہ کیا کیا جبران......کچھ خبر ہے، گھر میں سب کتنے پریشان ہیں۔" عثمان بھائی خاصے برہم تھے۔"اور یہاں آہی گئے تھے تو سیدھے میرے پاس کیوں نہ آئے یہ ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا تک ہے۔"

"کچھ پوچھیں نہیں عثمان بھائی......وہ اپنے اندر بل کھاتے درد کو برداشت کرتے ہوئے کراہ اٹھا۔" پلیز جلدی آئیں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" اس کی آواز میں کسی انجانی سی اذیت کو محسوس کر کے وہ نرم پڑ گئے۔

"جبران تم ٹھیک تو ہو نا......؟"

"نہیں عثمان بھائی......میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔"

جبران کا ضبط جواب دینے لگا۔"آپ فوراً آجائیں پلیز۔"

"مجھے تم سے اس غیر ذمے داری کی توقع نہیں تھی۔خیر میں آرہا ہوں......"

وہ متفکر سے جبران کے پاس پہنچے تو اس کی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے۔وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے آنکھیں بند کیے بیڈ پر بیٹھا تھا اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ گر رہے تھے۔

"کیا بات ہے جبران کیا ہوا ہے تمہیں۔؟" وہ بے قراری سے اس پر جھکے۔

"جبران نے آنکھیں کھول کر ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"عثمان بھائی......" وہ بے دردی سے ہونٹ کچلنے لگا......۔

"آپ مجھے کسی ایسے اسپتال یا کلینک میں لے چلیں جہاں منشیات کے مریضوں کا علاج ہوتا ہو......"

"کیا.........؟"

عثمان کو جیسے شاک سا لگا اور وہ ایک بے قراری کیفیت میں سیدھے ہوگئے۔

"تو کیا تم..........؟"

عثمان کی نظروں میں دھند سی چھانے لگی۔یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

"جبران میرے بھائی یہ تم نے کیا کیا......" ان کا دل کراہ اٹھا مگر دلی کرب کو چھپاتے ہوئے انہوں نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹے اور اسے تسلی دی۔

"گھبراؤ مت جبران......سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ان کے مہربان بازوؤں میں آتے ہی جبران جیسے سارا ضبط کھو بیٹھا۔عثمان کی پلکیں بھیگ گئیں مگر انہوں نے حوصلے سے کام لیا۔

"چلو اٹھو......" انہوں نے بنا کچھ کہے جبران کا ہاتھ تھام لیا۔

ہم اسی وقت بخاری نرسنگ ہوم چل رہے ہیں۔جنید بخاری میرے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔وہ ہر طرح ہماری مدد کریں گے۔"

جبران کے جسم میں نسیں بل کھا رہی تھیں اور ایک جانی پہچانی آسودگی کی طلب میں دل کسی بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ضبط کی انتہائی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جبران کو فوری طور پر ایڈمٹ کر لیا گیا۔ضروری چیک اپ کے بعد ڈاکٹر جنید نے بتایا کہ بات ابھی بگڑی نہیں...... چونکہ بالکل ابتدائی اسٹیج ہے‘ اس لیے چند ہفتوں کا ٹریٹ منٹ کافی ہو گا۔

عثمان نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جبران کی طرف دیکھا۔”میں نے ڈاکٹر جنید سے تمہارے پاس رہنے کی اجازت لے لی ہے۔مگر مجھے ایک بار گھر جانا پڑے گا۔تم گھبراؤ گے تو نہیں۔“

”نہیں بھائی...... آپ جائیں...... زوبی بھابی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ جبران نے شرمندگی سے کہا۔

”ہاں زوبی کے پاس بھی کسی کو چھوڑنا پڑے گا اور ابو جان کو میں نے بائے ایئر پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔انہیں فون کر دوں کہ تم یہاں میرے پاس بخیریت ہو......سو ہم نہیں آ رہے۔“

”لیکن انہیں منع کر دیجئے گا کہ وہ یہاں میرے موجود ہونے کا کسی کو نہ بتائیں۔“ جبران گھبرا گیا۔

”اچھا“ عثمان نے اسے بغور دیکھا مگر کچھ پوچھا نہیں۔

ڈاکٹر جنید کی کوششوں اور خدا کی مہربانی سے بالآخر جبران اس خوفناک عفریت کے پنجے سے باہر نکل آیا جو اپنا منہ کھولے اسے نگلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔عثمان اور زوبی کی پر خلوص کوششیں اور محبتیں بھی اس سلسلے میں خاصی معاون رہیں جس دن جبران کو ڈسچارج کیا گیا‘ عثمان اور زوبی کی خوشیاں دیدنی تھیں۔عثمان کا خیال تھا کہ اب وہ وہیں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرے مگر جبران نے انکار کر دیا۔

”عثمان بھائی...... میں یوں ڈر ڈر کر زندگی بسر نہیں کر سکتا پھر جو کچھ میرے ساتھ ہوا‘ بے خبری میں ہوا۔اب میں محتاط رہوں گا۔“

”مگر وہ لوگ...... ایسے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں......“

وہ خود پر بیتی ہر واردات عثمان کو بتا چکا تھا اسی لیے وہ متفکر تھے۔

”عثمان بھائی...... بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے اور کسی کی آئی مجھے نہیں آئے گی۔یہ میرا ایمان ہے۔“

”...تو ٹھیک ہے مگر“

عثمان یکا یک چپ سے ہو گئے۔پھر خود بھی ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

”چلو...... میں اور زوبی بھی اسی بہانے سب سے مل لیں گے۔“

اپنے شہر کی مہربان فضاؤں میں داخل ہوتے ہی اسے کچھ بھولی بسری خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں نے گھیر لیا۔

عثمان بھائی پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے۔کوئی مانوس سی خوشبو اس کے اردگرد چکراتی رہی۔کسی جانی پہچانی ہنسی کی کھنک اس کے کاسہ دل میں گرتی رہی۔کوئی اپنا اپنا شناسا سا چہرہ جیسے چاندنی کے ہالے میں لپٹا اس کی آنکھوں میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔اور وہ سب کچھ بھلانے کی کوشش میں ہلکان ہوتا رہا۔

”بس ایک چیپٹر تھا جو کلوز ہو گیا۔“

دل کی رگوں کو کاٹتا۔دو دھاری خنجر تھا شاید جس کی کاٹ بہت گہری تھی...... جان لیوا تھی۔اور وہ ایک محترم شخصیت‘ جس کا احترام اسے سر نہ اٹھانے دیتا تھا۔

نہیں...... میں اسے نہیں جانتا...... کسی کو بھی...... نہیں۔

اس نے بڑی بے دردی سے اسے ذہن سے جھٹکا۔

اور وہ سنہرے بالوں والا لڑکا علی زیب......“

اس نے سوچنا چاہا۔

خدا جانے کیا حال ہو گا...... اور سسٹر فیروزہ۔“

کسی گہرے درد نے اس کے دل کو پھر بھینچ لیا۔

کیا بگاڑا تھا میں نے اس کا......“

یوں بھی میرے والدین منشیات کے کاروبار میں ملوث کسی شخص کو......

وہ فضا میں لکھی نادیدہ تحریر پڑھتا اور اپنے دل میں دکھ رقم کرتا رہا۔

وہ جو میری تھی...... اور میری نہیں تھی......“

جبران نے ایک بار پھر اس ظالم خیال سے پیچھا چھڑانے کی بے نام سی کوشش کی جو اسے ایک نامعلوم سے کرب میں مبتلا کر دیتا تھا۔سرامین کے حوالے سے اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ تھا......“

اور یہ گناہ بار بار اس سے سرزد ہو رہا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور وہ ایک شخص جو پھولوں کلیوں اور ستاروں کی باتیں کرتا تھا اور زخم بیچتا تھا۔"

وہ زلفی کے متعلق سوچنے لگا۔

وہ جس کے لب مہکتی، مچلتی زندگی کی نوید دیتے تھے۔ اور ہاتھ موت تقسیم کرتے تھے.........ایک اذیت ناک تڑپا دینے والی موت.........."

کتنے بہت سارے تیروں کا رخ اس کی جانب ہو گیا تھا۔ وہ کس کس سے بچتا اور کیونکر.........بہت سے جانے اور انجانے ہاتھ اسے گہری دلدل کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اور ستم یہ تھا کہ اسے اپنا جرم بھی نہیں معلوم تھا۔

اسے گم صم دیکھ کر عثمان بھائی بھی خاموش ہو گئے تھے۔

گھر میں سب اسے اتنے دنوں بعد دیکھ کر جذباتی ہو گئے۔

امی جان بار بار اس کے چہرے کو چھوتیں اور اس کے ہونے کا یقین کرتیں۔ عالیہ اور نادیہ کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور ابو جان کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں خون رنگ ہو رہی تھیں عثمان نے فون پر انہیں سمجھا دیا تھا کہ جبران سے کچھ نہ پوچھا جائے۔ اسے اس وقت آپ لوگوں کی محبت اور دل جوئی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

اسی لیے نہ کسی نے اس سے کچھ پوچھا.........نہ اس نے کچھ بتایا۔ امی جان نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"بچے تم نے ہمیں بہت تڑپایا۔"

***

جبران نے اُن کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور سر جھکا لیا۔ لفظ اُس کے اندر ہی کہیں گم ہو گئے تھے۔

عثمان ہنستے ہوئے ماں کے سامنے جھکے۔ "امی جان، ہمارا بھی کچھ حق ہے، آپ پر......"

"تم سب ہی میرے جگر کے ٹکڑے ہو۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک......" امی جان نے اُنھیں گلے سے لگا لیا۔

پھر زوبی بھی اُن سے آلپٹی۔

مدت بعد گھر کی سوگوار فضا میں ہنسی کی چہکاریں گونجی تھیں۔ سب کی آمد سے آنگن کیسا بھرا بھرا اور پُر رونق لگنے لگا تھا۔ عالیہ زوبی کے بازو سے لپٹی عثمان بھائی کی باتیں سُن رہی تھی، جو جانے کہاں کہاں کے قصّے سنا رہے تھے۔ وہ باتوں کے دوران گم صُم سے جبران کو بھی باتیں کرنے پر مجبور کر دیتے۔

"وہ گورا سا لڑکا...... یار جبران...... کیا نام تھا اُس کا۔ وہ جو نوٹس لینے کے لئے تمہارے پیچھے بھاگتا رہتا تھا...... اور ماتھے پر بالوں کا چاند سا بنائے رکھتا تھا۔"

"وہ ہاں...... طالب...... طالب غیاث......" جبران چونک پڑا۔

"ہاں وہی...... وہ مجھے ریسٹ ہاؤس میں ملا تھا۔ شکار کھیلنے آیا تھا دوستوں کے ساتھ...... رات بھوتوں کا قصہ چھڑ گیا۔ تو کہنے لگا اس وقت بھوتوں کی باتیں بیان نہ کرو۔ بس پھر کیا تھا۔ یار دوستوں نے اُسے اتنا ڈرایا کہ رات بھر سو نہ سکا، بے چارہ، ذرا سے کھٹکے سے اُچھل پڑتا کہ بھوت آ گئے۔

عثمان بھائی کے الفاظ پھر کہیں پس منظر میں ڈوبنے لگتے اور وہ جانے کہاں کھو جاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود۔ اور عثمان بھائی بغیر حوصلہ ہارے بار بار کوشش کیے جاتے۔

پھر باتوں کا یہ سلسلہ جانے کتنا طویل ہو جاتا، اگر امی جان اُنھیں یاد نہ دلاتیں کہ رات بہت بیت چکی ہے اور اُنھیں آرام بھی کرنا ہے۔

عثمان بھائی جانے سے پہلے کافی دیر تک جبران کو اکیلے میں سمجھاتے رہے۔ جب جبران دیر تک کچھ نہ بولا تو اُنھوں نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے کہا۔

''دیکھو جبران...... میری تو خواہش تھی کہ تم وہیں میرے پاس رہتے۔ ان حالات میں شاید مناسب بھی یہی ہوتا...... مگر میں تم سے فیصلہ کرنے کا حق چھیننا نہیں چاہتا۔''

''میں ابھی کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، عثمان بھائی......'' جبران نے بے بسی سے کہا۔ ''ابھی میرے ذہن میں بہت سے جالے ہیں۔ شاید میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو چکا ہوں...... بہت ساری باتیں ابھی میرے ذہن میں نہیں آتی ہیں...... بالکل بھی نہیں۔''

''یہ اس لئے ہے کہ کوئی تمہارے سامنے مقابلے پر نہیں۔ اور جب دشمن اندھیرے میں ہو تو بچاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔''

''پھر بھی میں ابھی امی جان اور ابو جان کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم ابھی یہیں رہو...... اور خوب اچھی طرح سوچ لو۔ اور جب کوئی فیصلہ کرلو تو مجھے آگاہ کر دینا...... اور اپنی حفاظت کرنا...... یاد رکھنا، تم ہمارا سب سے قیمتی اثاثہ ہو۔ اور ہاں جتنی جلدی ہو سکے کالج جوائن کر لینا۔ میں نے تمہارا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا تھا۔ اس لئے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

'دشواری سی دشواری۔'

وہ اپنے ریزہ ریزہ دل اور شکستہ روح کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی آئینہ ہاتھ سے چھوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے۔ اور انہی کرچیوں سے اُسے ایک نیا آئینہ بنانا تھا۔ جانے اپنے آپ کو مجتمع کرنے میں کتنا وقت لگتا۔ اور پھر بھی شاید دل کا آئینہ پہلے کی طرح شفاف نہ ہوتا۔ اور روح کے زخم پوری طرح مندمل نہ ہوتے۔

اتنے دنوں بعد اُسے کالج جانا کتنا عجیب لگا تھا۔ ہر چیز بدلی بدلی، نئی اور اجنبی لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہی زمین تھی، اور وہی آسمان۔ وہی کالج تھا، اور وہی دوست یار۔ سب کچھ وہی

تھا، مگر کہیں کوئی بہت بڑی کمی واقع ہو گئی تھی۔ ہر طرف عجیب سا خالی پن اور ویرانی تھی۔ سب کچھ پھیکا پھیکا لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنا آپ بھی۔ اُسے اپنے اندر کہیں گہرے خلاء کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اُس کا دل، دماغ، رُوح، سب خالی خالی سے ہو گئے ہوں۔

منیب پوچھ رہا تھا کہ اُسے کیا ہوا تھا' جو اتنی لمبی چھٹیاں لے ڈالیں۔

''بس یار...... کچھ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اسپتال میں ایڈمٹ رہا۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''میں نے کئی بار تمہارے گھر فون کیا۔ معلوم ہوا کہیں گئے ہوئے ہو۔ پھر پتا چلا بیمار ہو...... بڑی فکر رہی......'' ایاز نے کہا۔

''ہاں عثمان بھائی کے پاس گیا ہوا تھا۔ کراچی...... وہیں بیمار پڑ گیا۔ مگر اب اس ٹاپک کو چھوڑو۔'' جبران بے زار ہونے لگا۔

''پرنسپل صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ اس تبادلے کو روکنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔'' علی نے بتایا۔

''اور وہ تمہارے سر امین...... ایک ماہ کی چھٹی پر ہیں۔ غالباً سوات میں...... آخر مدت بعد شادی ہوئی ہے۔ ہنی مون پیریڈ بھی طویل ہونا چاہیے۔'' منیب ہنسا۔

''سر امین......'' جبران نے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھا۔ تو عثمان بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں جینا واقعی مشکل ہے...... کوئی نہ کوئی نوکیلا خنجر اُسے کاٹتا ہی رہے گا...... وہ کہاں کہاں اس ذکر سے بچے گا اور کیونکر...... اور زخم یونہی ہرے ہوتے رہے تو پتا نہیں، وہ اپنے آپ کو بحال بھی کر سکے گا یا نہیں...... تو پھر وہ عثمان بھائی کے پاس کیوں نہ چلا جائے۔ جہاں کوئی اُس کے زخموں کو کُریدنے والا نہ ہوگا۔

ایاز نے جبران کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا تو ایک ملامت بھری نظر منیب پر ڈالی۔ پتا نہیں بعض لوگوں کو تنکے چبھونے میں کیا لطف آتا ہے۔

''ارے ہاں جبران...... تمہیں علی زیب کا پتا چلا۔'' ایاز کو اچانک یاد آ گیا۔

''علی زیب......'' جبران نے بے دھیانی میں اُسے دیکھا۔

''ہاں وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والا لڑکا' جو ڈاکٹر شیرازی کے کلینک میں ایڈمٹ تھا۔ تم تو اکثر اُس کے پاس جایا کرتے تھے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں...... میں اُسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

اوس قطرہ قطرہ اُس کے اندر گرنے لگی۔

وہ جس کی وجہ سے ایک بے گناہ پر فردِ جرم عائد کی گئی...... ایک ایسا جرم جو کبھی بھی اُس سے سرزد نہیں ہوا، پھر بھی سب کو یقین تھا کہ ایسا ہوا۔

"تمہیں نہیں معلوم ...... حالانکہ اس واقعے کا تو اخباروں میں کافی چرچا رہا۔" علی کو حیرت ہوئی۔

"میں نے مدّت سے کوئی اخبار نہیں دیکھا۔"

وہ تو ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا...... حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی۔

"اُس نے خود کو گولی مار لی تھی۔"

"علی زیب نے......؟"

اچانک ذہنی جھٹکے نے جیسے اُسے سوئی ہوئی کیفیت سے جگا دیا۔ "مگر کیسے...... اُسے پستول کہاں سے ملا۔؟"

"سر غفار خاں اُس سے ملنے آئے تھے۔ اُن سے گلے ملتے ملتے علی زیب نے اُن کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچا اور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی۔"

"اوہ......" جبران کو سچ مچ افسوس ہوا۔

"اتنا پیارا اور ڈیسنٹ لڑکا کیسے جان سے گزر گیا۔ او بے چارے سر غفار خاں۔ اُنھیں کیا پتا تھا کہ وہ موت کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔" ایاز نے بات جاری رکھی۔

"اور وہ ایک نرس ہوتی تھی، سسٹر فیروزہ، زیب نے اسی کے بازوؤں میں جان دی تھی ...... بعد میں اس نے بھی خودکشی کر لی، خواب آور گولیاں پھانک کر......"

"سسٹر فیروزہ نے......؟" اُسے دھچکے پہ دھچکے لگ رہے تھے......

"کیوں...........؟"

وہ اپنے آپ کو علی زیب کی موت کا ذمّے دار سمجھتی تھی۔ سُنا ہے، اس نے مرنے سے پہلے ڈاکٹر شیرازی کو خط لکھا تھا، جس میں اُس نے اعتراف کیا تھا، کہ وہ اُسے نشہ پہنچاتی تھی۔ اخباروں میں بہت کچھ آتا رہا۔ سسٹر فیروزہ اور ڈاکٹر شیرازی کے کلینک کے خلاف...... بعد میں ڈاکٹر شیرازی کی کوششوں سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

جبران نے ایک گہری دُکھ بھری سانس لی۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا، کہ وہ جو موت تقسیم کرتی تھی...... اور اپنے کیے پر ذرا بھی نادم نہ تھی، اتنی جذباتی ہوگئی کہ خود کو ہی سزا دے بیٹھی۔

مگر انسانی ذہن کے گورکھ دھندے ایک سمجھ میں نہ آنے والی چیز ہیں۔ کیا خبر علی زیب کی المناک موت نے اُسے اپنی ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر دیا ہو۔ اور وہ اپنے لیے خود ہی سزا تجویز کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ وہ نئے موسموں کی نوید دیتا بہار کے اوّلین جھونکے جیسا لڑکا...... جو بن چاہے بھی دلوں پر دستک دیتا تھا...... پھر کون ایسا ظالم تھا' جو اُس کے لئے کواڑ بند رکھتا۔ وہ بلور کی سی چمکتی نیلی آنکھوں والا علی زیب اُسے کیا یاد آیا کہ اُسے اپنے ارد گرد کی ساری فضا پہلے سے بھی زیادہ اُداس اور بھیگی بھیگی محسوس ہونے لگی۔ اُسے لگا جیسے وہ مزید وہاں ٹھہرا تو اُس کا سارا وجود آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ وہ فوراً ہی معذرت کر کے وہاں سے اُٹھ گیا۔

بہت دن گزر گئے تھے، اپنے آپ سے لڑتے جھگڑتے اور خود کو جوڑتے توڑتے۔ مگر ٹوٹ پھوٹ ابھی جاری تھی۔ ابھی تک وہ شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہا تھا۔ دل کا آبگینہ بہت ہی نازک ہوگیا تھا۔ کہ شاید ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش میں بے حال ہوئے جا رہا تھا۔

اُس دن سر حسن نے بطورِ خاص اُسے بلوایا۔

"بھئی، اب تم خاصے ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔ پھر اپنے مشن سے اتنی غفلت کیوں......" وہ اُسے بغور دیکھ رہے تھے۔

"نہیں سر۔ اندر سے میں ابھی بہت بیمار ہوں۔ زخم زخم جسم' لخت لخت دل اور داغ داغ رُوح لئے۔ مگر سمندر کی گہرائی کا اندازہ کنارے پر سے کیسے کیا جاسکتا ہے۔"

اُس کی آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں مگر وہ خاموش سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھتا رہا۔

"دیکھو بہت ہو چکی۔ انجمنِ انسدادِ منشیات کو تم جیسے سرگرم ممبرز کی اشد ضرورت ہے......" وہ اُسے چپ دیکھ کر گویا ہوئے۔

"تم بھی نہیں تھے، اور ثمن کو بھی میرا دوست امین لے اڑا۔ دو اہم ممبرز کی عدم موجودگی میں انجمن کچھ سُست سی پڑ گئی ہے۔ ثمن کی واپسی تو ناممکن ہے۔ البتہ تم اب میدان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں آجاؤ فوراً۔"

دل کے زخم جیسے پھر سے کسی نے کُرید دیے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اُسے بھول جانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ مگر دل کا درد رہ رہ کر لو دے اُٹھتا تھا۔ اور بات بے بات ایک ٹیس سی لگتی تھی۔ اُس نے تو سمن کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ مگر وہ شاید اُسے بھولا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کے اندر ہی کہیں موجود تھی۔ اپنی تمام تر کج ادائیوں اور بے وفائیوں کے باوجود۔ اور وہ بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

بھولتا کون ہے۔
اپنے قاتل کے خدوخال کو۔
دُکھ اُٹھاتے دنوں اور مہ وسال کو۔
بھولتا کون ہے۔
عمر کی شاخ پر کھلنے والی اُس ایک اوّلین شام کو
بے سبب جو لگا ہے اُس الزام کو
پھر ترے نام کو۔
بھولتا کون ہے۔

"سر...... میں کچھ کرنا تو چاہتا ہوں۔ مگر اپنے آپ کو بہت بے بس پاتا ہوں۔" وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ بڑی حسرت سے۔ جیسے یہیں کہیں کوئی چھپا بیٹھا ہو۔

"تم بے بس نہیں ہو۔ مگر لگتا ہے، علی زیب والے واقعے نے تمہیں بددل کر دیا ہے۔ حالانکہ اب مسٹر فیروزہ کے اعتراف کے بعد تمہاری پوزیشن کلیئر ہوگئی ہے۔"

"یہ اعتراف کتنے زخموں کا اندمال کرے گا بھلا......" جبران کے ہونٹ طنز سے بل کھا گئے۔

"منشیات کے کاروبار میں ملوث ایک شخص......"

کسی کے کہے ہوئے الفاظ تازہ زخموں کی طرح تکلیف دینے لگے۔

"سر، اتنے بہت سے لوگ یہ کام کر رہے ہیں۔ ایک میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔" وہ اب بھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ اپنے حصّے کا کام کر رہے ہیں۔ مگر تمہارا بھی تو کچھ فرض بنتا ہے۔"

"میں اپنے حصّے کا کام ضرور کروں گا سر...... مگر اس طرح نہیں۔"

"میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ چُھپے ہوئے خنجروں کا مقابلہ چُھپے ہوئے ہاتھ ہی کر سکتے ہیں۔"

اب کے اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں چھائی کُہر دُور ہو چکی تھی۔

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو......؟" سر حسن نے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر...... ابھی خود مجھ پر کچھ واضح نہیں۔ البتہ ایک بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں موت کے سوداگروں سے ٹکراؤں گا ضرور...... چاہے میں خود ہی کیوں نہ فنا ہو جاؤں۔"

اُس کے چہرے پر عزم کا اُجالا اور لہجے میں ایسی پختگی تھی کہ پھر سر حسن نے کچھ نہ کہا۔ بس خاموش نظروں سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

جبران نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا تھا۔ اس سلسلے میں اُس نے کچھ ضروری اقدامات بھی کئے تھے، لیکن اس سے پہلے اُس نے یہ اطمینان کر لیا تھا، کہ وہ سیاہ پجیرو والے اُس کا پیچھا چھوڑ چکے ہیں۔ کئی بار وہ بطور خاص اُنھیں چیک کرنے کے لئے باہر نکلا اور بلا وجہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ مگر وہ اُسے کہیں نظر نہ آئے۔ جبران کا خیال تھا کہ جو سزا وہ اُسے دے چکے تھے، شاید اُسے ہی کافی سمجھتے تھے۔ شاید وہ اُن کے لئے اتنا اہم نہیں تھا، کہ وہ اُس پر مزید وقت ضائع کرتے۔ کئی دن کی سوچ بچار کے بعد اُس نے ڈپٹی کمشنر حامد علی رانا سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حامد علی رانا نے بڑے دھیان سے اُس کے آئیڈیاز سُنے۔ اُس نے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کی تھی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، اس سلسلے میں اُسے اُن کی گائیڈنس کی ضرورت تھی۔

"آپ کیا خواب بہت دیکھتے ہیں؟" اُنھوں نے اس روشن چمکتی آنکھوں والے لڑکے کو دلچسپی سے دیکھا۔

"نو سر...... اگر میں خواب دیکھتا تو یوں آپ کے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔" اُس کی خوبصورت ذہین آنکھوں میں ایک غم آلود سا تاثر تھا۔

"ہاں" ایک خواب دیکھا تھا، کبھی جو کب کا بچھڑ گیا...... اُس بچے کی طرح جس کی اُنگلی بھرے ہجوم میں چھوٹ جائے۔ اب میری آنکھیں خواب نہیں دیکھتیں۔ دُکھ چُنتی ہیں۔ اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موتی پروتی ہیں۔'' وہ کہیں کھوسا گیا۔

''تو پھر کیا یہ کوئی ذاتی انتقام ہے......؟'' وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھے۔

''ذاتی دُکھوں پر رونا کوئی بہادری نہیں سر۔ میں اپنی ذات سے بالاتر ہو کر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے نہیں...... دوسروں کے لئے۔ اُن سب کے لئے' جو قطرہ قطرہ جی رہے ہیں۔ اور قطرہ قطرہ مر رہے ہیں۔''

''کس حیثیت سے......اور کس قیمت پر؟''

''اپنی جان کی قیمت پر سر......اور حیثیت کا تعین تو آپ ہی کریں گے۔'' اُس کا لہجہ پُر اعتماد تھا۔

حامد علی لمحہ بھر اُسے دیکھتے رہے۔

''تم ایک اسٹوڈنٹ ہو فی الحال۔ اور تمہیں سب سے پہلے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے۔'' اُن کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میں اِس معاشرے کا بھی ایک فرد ہوں سر۔ اور میں اپنی آنکھیں بند نہیں رکھ سکتا۔ یقین کریں سر۔ میں نے سنہرے گلابوں کو سیاہ پڑتے اور مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرے شہر اور میرے ملک کی فضائیں دھواں دھواں اور زہریلی ہو رہی ہیں۔ اور خوشبوؤں کے پَر جھلس گئے ہیں۔ میں ان حالات میں بے حس نہیں رہ سکتا، سر......'' اُس کی آنکھوں کا غم آلود تاثر اور بڑھ گیا۔

''آپ خواب نہیں دیکھتے مگر باتیں شاعرانہ کرتے ہیں۔'' اُن کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

جانے کیوں وہ بات کو طول دے رہے تھے۔ حالانکہ پہلے اُنھوں نے یہی کہا تھا کہ اُن کے پاس وقت کم ہے اس لئے مختصر سے الفاظ میں مُدعا بیان کیا جائے۔

اگر آپ نے اس گلاب جیسے لڑکے علی زیب کو ٹوٹتے بکھرتے اور پتی پتی ہوتے دیکھا ہوتا تو آپ بھی شاعر ہو جاتے، اُس نے آزردگی سے اُن کی طرف دیکھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میرے پاس نہ طاقت ہے نہ اختیار۔'' اُس نے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہا۔'' میں پورے معاشرے کو سنوار نہیں سکتا۔ مگر اس کی تعمیر میں ایک اینٹ تو رکھ سکتا ہوں نا۔''

''کبھی کبھی آدمی اختیار رکھتے ہوئے بھی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ ویسے تم باتیں خوش آئند کرتے ہو۔ حوصلہ بڑھانے والی۔'' حامد علی مسکرائے۔

''مگر اس راہ میں حوصلہ مندوں کے پَر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ جاؤ اپنی دنیا میں واپس جاؤ...... اور اُس وقت کا انتظار کرو۔ جب تمہارے پاس اختیار بھی ہوگا اور طاقت بھی......''

''سوری سر...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اپنے شہر میں داخل ہونے والی ہر کھیپ کو روکنے کی کوشش کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔'' میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔''

''بیٹھو بیٹھو......'' اُنھوں نے بے صبری سے کہا۔'' تم میرے پاس ہی کیوں آئے۔ کہیں اور بھی تو جا سکتے تھے۔ کئی این جی اوز ہیں...... پھر پولیس کا محکمہ...... ایس پی۔ ڈی ایس پی۔''

''آپ اس کی وجہ جانتے ہیں سر...... گستاخی معاف، اس محکمے میں کالی بھیڑیں بہت ہیں۔ میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''یہی بات تمہارے بارے میں سوچی جا سکتی ہے۔'' وہ بغور اُسے دیکھ رہے تھے۔

''اس کا فیصلہ تو آپ کی فہم و فراست پر ہے۔ یا پھر آنے والے وقت پر جو خود ہی کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرا دیتا ہے۔''

''اوکے لڑکے۔ تم نے اپنی وکالت خوب کی۔'' حامد علی مسکرائے۔'' اب بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو......؟''

''میں منشیات کے خلاف پسِ پردہ رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ صرف آپ ہی سے رابطہ رہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔'' اس کے لئے تمہیں سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ یہاں کتنے گروہ کام کر رہے ہیں اور اُن سب کا طریقۂ کار کیا ہے۔ اور اس کاروبار کی باگ ڈور بظاہر کن ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔''

وہ اُسے دیر تک ضروری معلومات فراہم کرتے رہے۔ اُنھوں نے اُن طریقوں کی بھی وضاحت کی جو انسدادِ منشیات کے لئے اختیار کیے جا رہے تھے۔

''حقیقت میں اس کاروبار کے پیچھے کون ہے۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ البتہ کچھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے لوگوں کے نام ضرور لیے جاتے ہیں۔ وہ بھی بغیر ثبوت کے...... خیر فی الحال تو سب سے اہم مسئلہ منشیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا ہے۔" اُنہوں نے تھکے تھکے انداز میں اُسے دیکھا۔

"اور کچھ تشنگی رہ گئی ہو تو پوچھ سکتا ہوں؟"

"کیا میں اُن بڑے لوگوں کے نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نہیں۔ اُن کا انداز قطعی تھا۔" لیکن اگر تم اُن تک پہنچ جاؤ تو بغیر ثبوت کے مجھ سے بات نہ کرنا۔" اُنہوں نے تنبیہ کی۔

"میں سمجھتا ہوں سر۔ تو پھر مجھے اجازت ہے۔"

"میں ایک بار پھر کہوں کہ اوّلیت اپنی تعلیم کو دینا۔ ہمارے ملک کو پڑھے لکھے باشعور افراد کی بہت ضرورت ہے۔" اُن کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی۔

"مجھے معلوم ہے سر...... بہت شکریہ۔" وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"تم فون پر مجھ سے رابطہ رکھ سکتے ہو۔ وِش یو بیسٹ لک......"

جبران نے پھر ایک بار شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔

اُس کے جاتے ہی اُنہوں نے فائلیں اپنی طرف کھینچیں۔ کئی دنوں بعد وہ آفس آئے تھے۔ کام کا دباؤ بہت تھا۔ مگر اس روشن آنکھوں والے ذہین لڑکے کی ذات میں اُنھیں اپنا ہی کوئی کھویا ہوا عکس نظر آ گیا تھا، غالباً۔ ایسے نوجوانوں کو دیکھ کر انہیں زندگی کی اچھائیوں پر یقین ہونے لگتا تھا۔ اور انھیں یقین تھا کہ انہوں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس کے متعلق سوچتے وہ آفیشل ورک میں مصروف ہو گئے۔

جبران بہت مصروف ہو گیا تھا۔ حامد علی رانا نے جو ضروری معلومات بہم پہنچائی تھیں، اُس کی روشنی میں اُس نے اپنا طریق کار متعین کر لیا تھا۔ اُس نے اُن کے بتائے ہوئے گروہوں میں سے ایک گروہ "گولڈن برڈ" کا انتخاب کیا تھا۔ اور کچھ لوگوں کے پیچھے لگ چکا تھا۔ اُس نے ایک اندر کے آدمی سے دوستی بھی گانٹھ لی تھی۔ اسی دوران اُسے اتفاقیہ طور پر معلوم ہو گیا کہ گولڈن برڈ کے کچھ افراد ہیروئن کی کھیپ لے کر شہر میں داخل ہونے والے ہیں۔ اُس نے حامد علی رانا کو فوراً اطلاع دی۔ اگرچہ وہ اس اطلاع کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے ہچکچائے، مگر اُسے نظر انداز نہ کیا۔ اور فوری ایکشن کا آرڈر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک

ٹائلیں لانے والے ٹرک کے خفیہ خانوں سے بھاری مقدار میں ہیروئن برآمد کر لی گئی۔ اگلے دن اخبارات میں چھاپے کی تصویریں اور باقی تفصیلات تھیں۔ ٹرک ڈرائیور پکڑا گیا تھا۔ مگر اُس کے دو ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تفصیل پڑھ کر جبران نے ایک گہری سانس لی۔

"پتا نہیں یہ کیا بات ہے۔ کہ منشیات تو پکڑی جاتی ہیں، مگر اُسے لانے والے پولیس کے گھیرے کے باوجود فرار ہو جاتے ہیں۔

اس رات اُس نے یہی بات حامد علی رانا سے پوچھی۔

"تم جو بات کہنا چاہتے ہو، میں سمجھ رہا ہوں۔" اُنہوں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "ممکن ہے کمزوری ہماری ہو۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"سر جو پکڑے جاتے ہیں، وہ معمولی کارندے ہوتے ہیں، جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ جب تک جڑیں نہ کاٹ دی جائیں، شاخیں تو پھلتی پھولتی رہیں گی نا۔" اُس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"درست ہے مگر جب تک ہم جڑوں تک نہیں پہنچ پاتے، شاخوں کی کاٹ چھانٹ ضروری ہے۔ ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔ یوں بھی ڈوری ہلانے والے ہاتھ تو پردے کے پیچھے ہیں۔ اور معلوم نہیں، اُن کے ڈانڈے کتنی دور تک پہنچے ہیں۔ فی الحال ہمارا مقصد اُن کی سپلائی لائن کو توڑنا ہے۔ اینڈ یو ویل ڈن بوائے۔ محاذ پر ڈٹے رہو......"

"تھینک یو سر۔ میرا خیال ہے کہ ان صفوں میں گھس کر ہی ان کو توڑا جا سکتا ہے۔ مگر یہ فل ٹائم جاب ہے۔ اور میرے ایگزام قریب ہیں۔ البتہ میں امتحانات کے بعد ضرور کچھ سوچوں گا۔"

"نہیں......" حامد رانا کے لہجے میں سختی تھی۔ "میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ بہت خطرناک ہے۔"

"ابھی میں خود بھی یہ رسک نہیں لے رہا سر۔ مگر جان کی بازی لگائے بغیر تو بازی نہیں جیتی جا سکتی......"

"پھر کیا یہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا؟" اُن کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"معلوم نہیں سر... مگر شاید میں کوئی ایک روڑا راستے کا ہٹا دوں۔ یا کوئی ایک کانٹا چُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوں۔ یا کسی ایک فرد کے آنسو پونچھ سکوں......" وہ جذباتی ہونے لگا۔ "سر، میرا جی چاہتا ہے، کہ میں بارش کا وہ قطرہ بن جاؤں، جو خشک زمین میں جذب ہو کر دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے، اور پیاسے لبوں کو سیراب کر جاتا ہے۔"

"اور تم کہتے ہو کہ میں خواب نہیں دیکھتا۔" وہ ہولے سے ہنسے۔

"یس سر۔ مگر اب دیکھنے لگا ہوں۔ ایک خوبصورت اور صحت مند معاشرے کے......" وہ بھی ہنس پڑا۔

"چلو اچھا ہے۔ خوابوں کی اسیری کئی تکلیف دہ حقائق سے بچا لیتی ہے۔ تو خواب دیکھتے رہو۔ اور راہ کے خار چنتے رہو۔ گڈ لک۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ یہ خوبصورت باتیں کرنے والا جذباتی لڑکا انھیں اچھا لگنے لگا تھا۔ اور مدت بعد انھیں بات کرنے کا لطف آنے لگا تھا۔

✹✦✹

موسم بہت دلفریب ہو رہا تھا۔ طمانیت کے ایک گہرے احساس کے ساتھ اُس نے آسمان کو دیکھا، جہاں بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر کتابیں کھول لیں۔ وہ پوری یک سوئی کے ساتھ پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر کمرے میں بہت گھٹن تھی، اسی لیے برآمدے میں آ گیا۔

دنوں بعد اُس نے کتابیں اُٹھائی تھیں۔ دراصل اُس کی غیر نصابی سرگرمیاں ہی اتنی بہت ہو گئی تھیں کہ پڑھنے کے لئے وقت نہ مل رہا تھا۔ ایک تو وہ "گولڈن برڈ" کے سلسلے میں مصروف تھا۔ پھر وہ "پسِ آئینہ" کے عنوان سے اخبار میں بھی لکھنے لگا تھا۔ وہ داستان کے انداز میں معاشرے کے کسی نہ کسی ناسور کی نشاندہی کرتا تھا۔ اُس کے لکھے ہوئے کالموں نے ایک حلقے میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ اور لوگ ایک دوسرے سے داستان گو کے بارے میں پوچھنے لگے تھے۔ وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب بھی رہا تھا۔ اسی لیے وہ کچھ پڑھ بھی نہ سکا تھا۔ مگر اب ایگزام بالکل سر پر کھڑے تھے۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ بہت اچھے نہ سہی مگر کسی حد تک معقول مارکس تو آنے ہی چاہئیں۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ مگر وہ اردگرد سے بے نیاز نیومیریکل کرتا رہا۔ پھر دو پُرکشش آنکھیں تصور میں جھلملائیں۔ اور سب کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ وہ قلم فائل پر رکھے رکھے کھو سا گیا۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا...... گئی رُتوں کا ملال آنکھوں میں دُھند بن کر چھانے لگا۔ کبھی اُس کا خیال بادِ نسیم کی طرح دل کے زخموں کو سہلا دیا کرتا تھا، جیسے کوئی گلاب کی پتی ہولے سے چھو جائے۔ اب وہی خیال پُرانے زخموں کی طرح دہک اٹھتا تھا۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ اُس جیسی شیشہ صفت لڑکی پتھر ہو سکتی ہے...... وہ بظاہر جذبوں میں گندھی لڑکی اُس کے بے ریا جذبوں کا مذاق اُڑا سکتی ہے۔ تو پھر کیا سارا قصور اُسی کا تھا۔ جو وہ اُس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اندر چھپی خود غرض اور بے مہر لڑکی کو نہ پہچان سکا۔

اپنا ہی تھا قصور کہ طوفان میں گھر گئے
اِک موج تھی کہ جس کو کنارا سمجھ لیا

اور اگر کوتاہی اُس کی نظروں کی تھی تو پھر گلہ کس سے...... اگر وہ مجبور ہوتی یا کر دی جاتی، تو شاید اُسے شکوہ نہ ہوتا۔ کم از کم یہ تسلّی تو ہوتی کہ قصور اُس کا بھی نہیں۔ مگر اب تو رہ رہ کر دل میں کسک سی اُٹھتی تھی، کہ ترازو تو اُسی کے ہاتھوں میں تھی۔ سو اُس نے اپنی مرضی کا فیصلہ کیا...... بغیر کسی دباؤ اور مجبوری کے...... تو کیا وہ صرف کھیل رہی تھی...... وہ جو اُس کی اپنی تھی...... اور جو اُس کی اپنی نہیں تھی...... محض اُسے بے وقوف بنا رہی تھی...... اُسے تو اپنے لفظوں کا بھرم رکھنا بھی نہ آیا۔ اُسے کئی بار خیال آیا تھا، کہ جب پروفیسر امین واپس آئیں گے، تو وہ ان کا سامنا کیسے کر پائے گا۔ مگر جب وہ آئے تو وہ بے حسی کی ایسی کیفیت میں مبتلا تھا، کہ بس صرف اُنھیں دیکھ کر رہ گیا...... دل کے اندر دُور تک سناٹا طاری تھا۔ ایک گہرا جمود اور بے پناہ خاموشی...... نہ کوئی جان لیوا احساس تھا، نہ کوئی چُبھتا ہوا خیال......

پروفیسر امین نے گِلہ کیا۔

"میاں، کیسے بھائی ہو...... بارات میں بھی نہ آئے۔"

جبران معذرتیں پیش کرتا رہا مگر وہ خفا خفا سے اُس پر برستے رہے۔

"میاں ایسی بھی کیا مصروفیت...... ہماری محبتوں کو آزماتے ہو۔ ہمیں تو بھری بزم تمہارے بنا بے رونق لگی۔ اور آنکھیں تھیں کہ تمہیں ہی کھوجتی رہیں۔"

"حالانکہ میں اس قابل نہ تھا۔" اُس نے سر جھکا لیا۔ "جانتا ہوں، ساری کوتاہی میری ہے۔ جو چاہیں سزا دے لیں۔" اُس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔

"پتا نہیں کون کسے آزماتا رہا...... اور کس کی آنکھیں کسے ڈھونڈتی رہیں۔" اُس نے افسردگی سے سوچا۔

"اب ہم کیا سزا دیں گے میاں......" اُن کی پیشانی کے بل کُھل گئے۔ اور وہ جیسے اندر ہی اندر محظوظ ہو کر ہنسے۔ اور اگر سزا دار ہو بھی تو چلو معاف کیا۔ اچھا پھر کب آؤ گے، بھابی سے ملنے...... تمہیں اُس کے ہاتھ کی چائے پلائیں گے۔" اُنھوں نے تیز نکیلی سوئی اُس کے دل میں اُتار دی۔

اور شاید اُس کے دل کا کوئی ایک کونا پوری طرح بے حس نہ ہوا تھا، اور سوئی وہیں چُبھی تھی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔

اور جو معاف کرنے کا فن نہیں جانتے تھے یہ جان گئے کہ نوک کہاں تک پہنچی ہے۔ وہ بڑی بے رحمی سے دھیرے دھیرے اُسے اور گہرائی میں اُتارنے لگے۔

"چائے اور پھر اُس کے ہاتھوں کی، یاد کرو گے میرے عزیز۔" وہ لفظوں کو مُنہ ہی مُنہ میں چبا رہے تھے...... "وہ بھی دیکھ لے کہ یہ ہے ہمارا وہ بے مروّت بھائی جس کے ہم قصیدے پڑھتے ہیں...... اور جسے ہماری شادی کے دن بڑا ضروری کام آپڑا تھا۔"

جبران کی آنکھیں دُھواں ہونے لگیں اور کسی گہرے درد نے اپنے نکیلے پنجے اُس کے دل میں گاڑ دیے۔

"لگتا ہے، تمہیں ہماری شادی کی زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔" وہ ابھی بھی تیر کمان سنبھالے بیٹھے تھے۔

"نہیں سر۔ ایسا نہ کہیں...... خدا کرے، آپ کی خوشیاں دیرپا ہوں۔" اُس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"اور آپ کو کیا پتا میرے حصّے کی ساری خوشیاں بھی اب آپ کے دامن میں ہیں۔" اُس کے دل میں جیسے کسی نے چٹکی لی۔

وہ تو شاید ابھی اور بھی کچھ کچوکے لگاتے۔ اور بھی نمک چھڑکتے مگر جبران جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"میں جلدی حاضر ہوں گا سر۔ ایکسکیوزمی......"

وہ زخم زخم دل اور تار تار رُوح لیے وہاں سے بھاگ اُٹھا۔ مگر وہ ابھی تک اُن کے گھر نہیں جا سکا تھا۔ حوصلہ ہی نہیں پڑا تھا۔ وہ سر امین سے کترانے لگا تھا۔ اور عثمان بھائی کی تجویز اُسے بہت مناسب لگنے لگی تھی۔

کتنی ہی دیر یونہی قلم اُس کے ہاتھ میں ساکت رہا۔ اور وہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ بہت سی کہی اور ان کہی باتیں اور وہ خواب جو پورے ہوئے...... اور جو پورے نہ ہو سکے...... اور اُداسی گہر کی تہہ بہ تہہ اُس کے اندر گرتی رہی۔ پھر عالیہ نے اُسے آکر چونکا دیا۔

"جبران بھائی، موسم اتنا آفت ہو رہا ہے۔ میں نے پکوڑے اور پھلکیاں بنائی ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھائیں گے نا؟"

اُس کے ہاتھ میں چائے کا سامان دیکھ کر وہ زبردستی مسکرایا۔ "ضرور کیوں نہیں......" وہ کتابیں سمیٹنے لگا۔

"نادیہ آپی، آپ بھی یہیں آجائیں۔ اُس نے وہیں سے پکارا۔" مدت بعد جبران بھائی ہاتھ لگے ہیں۔ اکٹھے چائے پیتے ہیں......"

"اچھا۔"

برآمدے کے دوسرے سرے پر بیٹھی نادیہ اُون سلائیوں سے اُلجھ رہی تھی۔

"اور امی جان......؟"

وہ شعوری طور پر ذہنی اضمحلال کو جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"انہیں سردی لگ رہی تھی۔ میں نے چائے کمرے ہی میں پہنچا دی۔ نادیہ آپی آپ بھی آجائیں۔ قسم سے صبر نہیں ہو رہا۔" اس نے پھر نادیہ کو پکارا۔

جبران نے اُون سلائیاں سمیٹتی نادیہ کو دیکھا۔ وہ ملگجے سے لباس میں ملبوس بہت سنجیدہ اور قدرے دُبلی لگ رہی تھی۔

"یہ نادیہ آپی بیمار تو نہیں...... کچھ زرد زرد سی لگ رہی ہیں؟" اُسے تشویش ہوئی۔

"آپ کو نہیں پتا......" عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ اُمڈ آیا۔ "وہ بیمار نہیں مگر اُن کا دل زخمی ہے۔"

"دل......؟" وہ دھک سے رہ گیا۔ "مذاق میں بھی ایسا مت کہو۔ خدا نہ کرے کہ تمہارے نازک دلوں کو کبھی کوئی ٹھیس پہنچے۔" اُس کے لہجے میں بہنوں کا پیار اُمڈ آیا۔

"یہ مذاق نہیں۔ نادیہ آپی کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ کیپٹن ندیم کے گھر والوں نے منگنی کا سامان یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا تھا، کہ اُنھیں یہ منگنی منظور نہیں۔"

"بغیر کوئی جواز پیش کیے۔" جبران کو سخت صدمہ ہوا۔

"ہاں، بغیر کسی جواز کے...... بنا کچھ کہے۔"

"آپ لوگوں نے بھی کچھ نہ پوچھا......؟"

"پوچھنے کے لئے رہ ہی کیا گیا تھا۔ پھر شادی بیاہ کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں۔" اُس نے اُداسی سے کہا۔

"ابو جان کا خیال تھا کہ اُنھیں کسی نے بہکایا ہے مگر شاید وہ وضاحت نہیں چاہتے تھے۔ سو خاموشی سے اُن کی چیزیں اُنھیں واپس بھجوا دیں۔"

"یہ سب کب ہوا؟" جبران کی آنکھوں میں ملال کے رنگ گہرے ہونے لگے۔

"جب آپ کراچی عثمان بھائی کے پاس تھے۔" اُس نے بتایا۔

"تبھی......" اُس نے ایک دُکھ بھری سانس لی۔

تبھی...... وہ اتنا انجان رہا اور یہ قیامت گزر گئی۔ نادیہ آپی پر اثر تو ہونا ہی تھا۔ جب لڑکی کسی کے نام کی انگوٹھی پہن لیتی ہے، تو اس حوالے سے وہ شخص اُسے عزیز بھی ہو جاتا ہے اور بندھن ٹوٹتے ہیں تو دُکھ ہوتا ہے۔ اُس نے نادیہ کی زرد رنگت اور خاموش آنکھوں کو دیکھا جہاں گہرا سکوت طاری تھا۔ اور اُس کا دل درد سے بھر گیا...... "کیا ایک میرا دل سارے زخم کھانے کے لئے کافی نہ تھا؟ کیا سارے کانٹے ہمارے دلوں کے لئے ہی رہ گئے ہیں؟"

"جبران بھائی پکوڑے لیں۔" عالیہ نے پلیٹ بڑھائی۔

"مجھے صرف چائے دو۔" اُس کا جی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

"کچھ تو لیں...... یہ پھلکیاں ہی۔"

"نہیں پلیز۔ اس وقت میں کچھ نہیں کھا سکوں گا۔"

جبران کی آواز بھاری ہو گئی۔ یہ دُکھ اُسے کھائے جا رہا تھا، کہ وہ اپنے غموں میں گھرا بہن کے دُکھوں سے بے نیاز رہا۔

عالیہ نے اُس کی گلابی ہوتی آنکھوں کو دیکھا تو اُسے افسوس ہونے لگا۔ کتنے دنوں بعد تو وہ کچھ ریلکس نظر آیا تھا۔ اور اُس نے خوامخواہ ہی یہ ذکر چھیڑ کر اُسے ڈسٹرب کر دیا۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھ سکا۔ چائے پیتے ہی اُٹھ گیا۔

ایگزام سے فارغ ہو کر وہ پھر اپنی سابقہ سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔ اب اُس کے پاس وقت کی کمی نہ تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اُس شخص تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو اُن کے شہر میں اپنے گروہ کو کنٹرول کرتا تھا۔

سیٹھ کرامت کا شمار شہر کے معزز اور متمول لوگوں میں ہوتا تھا۔ شہر میں اُن کے کئی میڈیکل اسٹور تھے۔ ملک اور بیرونِ ملک ان کی جائیدادوں کا شمار نہ تھا۔ اُن کے چاروں بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اُن کے پاس بڑی ڈگریاں تھیں، اور اُن میں سے ہر ایک بہترین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بزنس کر رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں آرہا تھا، کہ سیٹھ کرامت جیسا معزز شخص اس کاروبار میں ملوث ہوسکتا ہے۔ اُس نے سیٹھ کرامت کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا، وہ ایک باوقار، سُلجھا ہوا اور شائستہ اطوار واخلاق کا مالک شخص تھا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مہربان سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے، دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتا یہ شخص ایک دُہری زندگی گزار رہا ہے۔

چھان بین کے دوران اسے معلوم ہوا کہ سیٹھ کرامت کی دواؤں والی فیکٹری میں ہیروئن تیار کی جاتی ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ فیکٹری کہاں ہے۔ اب وہ اسی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ یوں بھی حامد رانا نے کہا تھا، کہ بغیر ثبوت کے بات نہ کرنا، اور ثبوت اُس وقت تک نہیں مل سکتا تھا، جب تک فیکٹری میں کام کرنے والا کوئی اندر کا آدمی مخبری نہ کرتا، یا اُن کا اپنا آدمی فیکٹری کے اندر نہ پہنچ جاتا۔

جبران سوچ رہا تھا کہ وہ خود کیوں نہ وہاں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اُن کے درمیان رہ کر اُنھیں بہتر طور پر زک پہنچا سکتا تھا۔ مگر پہلے تو یہ معلوم کرنا ہی دشوار لگ رہا تھا، کہ فیکٹری کہاں ہے۔ اور پھر وہاں ملازمت حاصل کرنا بھی آسان نہ تھا۔ ظاہر ہے، وہ وہاں اپنے اعتماد کے آدمیوں کو ہی رکھتے ہوں گے، اور اعتماد پل دو پل میں حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

وہ اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا تھا، کہ کیا لائحہ عمل اختیار کرے، مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسی اثناء میں بی ایس سی کا رزلٹ آگیا۔ جبران نے ہائی فرسٹ ڈویژن لی تھی، مگر بورڈ میں کوئی پوزیشن نہ تھی۔ اُس نے جن حالات میں ایگزام دیا تھا، اُن میں یہ مارکس بھی غنیمت لگ رہے تھے۔ البتہ عالیہ بہت افسردہ تھی......

جبران نے اخبار کھولا، یوں ہی تجسس سا تھا کہ ٹاپ کرنے والا لڑکا کون ہے۔ اور اُس نے کتنے مارکس لیے ہیں۔ مگر جانی پہچانی اور کچھ مانوس سی شکل دیکھ کر وہ چونکا۔ نام دیکھا تو بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"تو یہ تم ہو دوست...... جو ایٹ دا ٹاپ آف لسٹ رہنا چاہتے تھے۔ اور مجھے چیلنج کر رہے تھے...... سر امین کے لاڈلے اور ذہین وفطین بھائی معین...... تمھیں اپنی جیت مبارک ہو۔"

اُس نے دل ہی دل میں پورے خلوص سے کہا۔ اُسے کسی قسم کی جیلسی فیل نہیں ہو رہی

تھی۔ بلکہ خوشی ہو رہی تھی۔ کہ وہ جسے اوّل آنے کا کریز تھا اور جو اس سلسلے میں سخت محنت کر رہا تھا، اُس کی محنتیں بارآور ہوئیں۔ اور یہ پروفیسر امین ملک کے لئے کتنا خوشی کا مقام تھا۔ "اُنھیں مبارک باد تو دینا چاہیے کہ اُن کے بھائی نے اتنا بڑا اعزاز حاصل کیا۔" اُس نے سوچا۔

جب سے سر امین کی شادی ہوئی تھی، وہ اُن کے گھر نہیں گیا تھا۔ بس دل ہی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں وہ سر امین سے کتراتا رہا۔ بعد میں اُنھوں نے بھی اُسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب معین ملک کی اتنی بڑی کامیابی کے بعد اُنھیں مبارک باد دینا ضروری لگ رہا تھا۔ آخر وہ اُس پر اتنا مہربان رہے تھے۔ کچھ سوچ کر اُس نے مٹھائی کا ڈبا لیا۔ اور ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر کے قریب پہنچا ہی تھا، کہ گیٹ کھلا اور ایک سفید نسان اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

چوکیدار نے اُسے دیکھ کر سلام کیا۔ "صاحب، سلام۔"

"آں...... ہاں...... وعلیکم السلام۔ کیسے ہو۔ دین محمد؟"

اُس کی عادت تھی کہ وہ جب بھی آتا تھا، چوکیدار کا حال چال ضرور پوچھتا تھا۔

"اور ہاں، یہ کیپٹن ندیم ہی تھا، نا جو ڈرائیو کر رہا تھا۔ کرنل جان محمد کا بیٹا۔" اُس نے تصدیق چاہی۔

"جی، یہ ندیم میاں ہیں جی۔ اُن کے ساتھ اُن کی بیگم تھیں، جی...... اپنے صاحب کی بھانجی چھوٹی بی بی......" وہ خود ہی تفصیل بتانے لگا۔

"پروفیسر امین کی بھانجی......" اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی صاحب جی......"

جبران کا ذہن اُلجھ سا گیا...... یہ کیسا عجیب اتفاق تھا، پہلے ثمن...... اور اب یہ کیپٹن ندیم۔ یہ ہر مقام پر مقابل سر امین ہی کیوں نظر آتے ہیں...... اور آخر جیت اُن ہی کا مقدر کیوں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اُس نے پردہ ہٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ٹھٹک کر رُک گیا...... ذوالفقار احمد زلفی کی آواز اُس نے صاف پہچان لی تھی۔

"بہت شاندار مارکس لیے ہیں صاحبزادے نے...... کمال کر دیا...... تمھیں تو جنون تھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ وہ ٹاپ کرے...... مبارک ہو۔ تمہارا خواب پورا ہوا......''

جبران گومگو کی کیفیت میں سوچتا رہ گیا۔ اندر جائے یا نہ جائے۔ اُس شخص کی وہ صورت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر پہلے ہی اُس نے خود کو مشکل سے آنے کے لئے تیار کیا تھا۔ دوبارہ آ بھی پائے گا یا نہیں۔

''کمال تو اُس نے کیا۔'' سر امین کے لہجے میں عجیب سی سرخوشی تھی۔ ''بہت محنت کی اُس نے اور بھی کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ پریکٹیکل کے نمبر اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ......''

''اُس لڑکے جبران کا کیا رہا جو معین کا مقابل تھا اور ایف ایس سی میں ٹاپ کر گیا تھا۔''

زلفی کی زبان پر اپنا نام سُن کر وہ چونکا۔

''وہ لڑکا......'' پروفیسر امین نے قہقہہ لگایا۔ ''ڈاؤن۔ بالکل زیرو...... وہ اور ہی غموں میں مبتلا رہا بے چارہ...... پڑھتا کیا خاک۔ مشکل سے فرسٹ ڈویژن لی ہے۔''

''اچھا......'' زلفی خباثت سے ہنسا۔ ''میں نے تو تمہاری خاطر اور ہی راہ پر لگانا چاہا تھا، مگر ذہین بہت تھا، پھسل گیا ہاتھ سے۔''

''ذہین تو خیر وہ تھا، مگر میں نے بھی بہت سے کنوؤں میں ڈول ڈال رکھے تھے......''

پروفیسر امین نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''چونکھی لڑ رہا تھا میں...... اور وہ میری ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''ہاں ہاں، تمہارا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا......'' زلفی نے بھی قہقہہ لگایا۔

جبران کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کہیں اندر بہت زور کا زلزلہ آ گیا تھا۔ اور چاروں طرف دیواریں گر رہی تھیں۔ اور وہ اونچا مینار شاید بنیادوں سے اُکھڑ رہا تھا، جس پر کوئی بڑی شان سے متمکن تھا...... پھر وہ بہت اونچائی پر ایستادہ بُت اُس کے قدموں میں گر کر پاش پاش ہو گیا۔

''نہیں......'' وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اُسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ایسا کیسے...... کیا انسان اتنا بھی گر سکتا ہے۔ اتنا نیچ ہو سکتا ہے۔''

اُس کے ذہن میں سناٹے اُتر رہے تھے۔ اور رُواں رُواں تپ رہا تھا۔

سر امین قہقہہ لگا رہے تھے۔ کھنکتا ہوا، فاتحانہ قہقہہ۔ اور زلفی کا خوشامدانہ قہقہہ۔ وہ یوں گیٹ کی طرف بھاگا، جیسے اُس کے چاروں طرف آگ کے الاؤ بھڑک اُٹھے ہوں۔ اور

تڑپتے بھڑکتے شعلے اُس کا تن من جلانے کو اُس کے پیچھے لپک رہے ہوں۔

چوکیدار نے اُسے حیرت سے دیکھا...... اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے، اور سر چکرا رہا تھا۔

''تم...... یہ...... رکھو......''

جبران نے عجلت سے مٹھائی کا ڈبا اُس کے ہاتھ میں دیا اور کچھ ادھورے سے الفاظ کہتا گیٹ پار کر گیا۔ اُس کا پورا وجود بگولوں کی زد میں تھا۔ اور ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے، جو اُسے تیز بہت تیز اُڑائے لئے جا رہے تھے۔ اور جھکڑ کے ان...... بگولوں کے درمیان گونجتے کچھ نکیلے، کٹیلے جملے جو دل کی رگوں کو اندر تک کاٹ رہے تھے۔

''میں چونکھی لڑ رہا تھا......''

احساسِ تفاخر سے بھرا مغرور لہجہ......

''کیا ہواؤں سے...... جبکہ کوئی مقابل تھا ہی نہیں...... میں تو اُن کی آنکھوں کا رنگ دیکھ کر راستہ بدل دیتا...... ایک بار وہ مجھے کہہ کر تو دیکھتے۔ میں تو اُن کی خوشی کی خاطر جان سے بھی گزر جاتا...... وہ تو اپنے مقام سے نہ گرتے...... میں راستے کا پتھر سہی...... وہ یوں ٹھوکر سے تو نہ ہٹاتے...... اُن کی عظمت کا بُت میرے سامنے پاش پاش تو نہ ہوتا......''

اُس کے سامنے اُڑے اُڑے سے خیالات آ رہے تھے۔

''ذہین تو خیر تھا ہی...... مگر میری ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا......''

سرخوشی بھرا کھنکتا ہوا قہقہہ...... جو اندر تک چیرتا چلا گیا تھا۔

''سر، میری ذہانت کو آپ نے چیلنج کیوں سمجھ لیا۔''

اُس کی روح تک کراہ اُٹھی۔

''میرا وجود تو آپ کے لئے باعثِ فخر ہونا چاہیے تھا۔ اور آپ تو بہت اونچے مقام پر تھے۔ میرا آپ کا کیا مقابلہ......''

''تم مجھے بہت عزیز ہو جبران...... بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح......'' وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

''تو کیا بھائی ایسے ہوتے ہیں...... سیڑھی کھینچنے والے اور میں نے تو سچ مچ آپ کو عثمان بھائی کی طرح چاہا...... بلکہ اُن سے کہیں زیادہ آپ کو احترام دیا...... پھر بھی...... پھر بھی آپ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئینہ غبار آلود رہا۔ آپ کی کدورت نہ گئی...... ایسا کیا جرم سرزد ہو گیا تھا مجھ سے...... جس کی سزا اتنی طویل تھی...... جس کے لئے آپ کو کتنی منصوبہ بندی کرنا پڑی۔''

اب اُسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ اور وہ ایک ایک بات پر غور کر رہا تھا۔

اُسے کالج سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ اور پھر اُس پر یک دم ہی مہربان ہو جانا۔ بھائیوں کی طرح چاہنا۔ اور بے حد فرینکلی دوستوں کی طرح پیش آنا...... اُسے یاد آیا، وہ اُسے دیکھتے ہی کارڈز نکال لیا کرتے تھے۔

''آؤ میاں جبران، ایک آدھ بازی ہو جائے۔''

پھر ایک بار اُنھوں نے کھیلتے کھیلتے دس روپے کا نوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''میاں، دس روپے تو ہوں گے تمہارے پاس......؟''

''جی...... جی ہاں......؟'' اُس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

''نکالو ذرا......''

جبران نے روپے دیتے ہوئے اُلجھ کر اُنھیں دیکھا۔

''بھائی، اس طرح کھیل میں ذرا گرمی پیدا ہو جائے گی۔'' اُنھوں نے وضاحت کی۔ ''دس تمہارے اور دس میرے۔ کُل ہوئے بیس۔ اور یہ روپے جیتنے والے کے ہوئے۔''

''مگر سر...... یہ تو جواء ہوا۔'' اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میرے عزیز...... جواء تو لاکھوں ہزاروں کا ہوتا ہے، دو چار روپوں سے مجھے یا تمہیں کیا فرق پڑے گا...... جسٹ فار انجوائے منٹ۔ صرف جیت کی سنسنی خیز خوشی کو محسوس کرنے کے لئے، صرف تھوڑی سی دلچسپی کے لئے۔'' وہ بودی سی تاویل پیش کر رہے تھے۔ مگر اُس وقت اُسے یہ تاویل بودی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ اُس نے سوچا تھا کہ واقعی اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر کھیل میں تھوڑی سی دلچسپی پیدا کرنے کے لئے شرط لگائی جائے۔

اور پہلی بازی وہ جیت گئے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی وہ کئی بازیاں جیتے۔ یہاں تک کہ محبت کی بازی بھی۔

اب اُسے خیال آ رہا تھا کہ وہ اُسے جواء کھیلنے کی طرف راغب کر رہے تھے۔ یا پھر شاید جیت کر اُن کے اپنے ہی کسی جذبے کی تسکین ہوتی ہو۔ شاید اُسے ہرا کر وہ کسی قسم کی روحانی اور دلی خوشی محسوس کرتے ہوں۔ ایک بار وہ اُسے کلب بھی لے گئے تھے، جہاں رولٹ پر

بازیاں لگ رہی تھیں، اور کارڈز کھیلے جا رہے تھے۔ پروفیسر امین نے رولٹ پر بازیاں بھی لگائیں، اور کارڈز بھی کھیلے، اور حیرت کی بات تھی، کہ وہ وہاں بھی جیتے۔

''سر آپ یہاں بھی کھیلتے ہیں۔'' اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یوں ہی میاں کبھی کبھار۔ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔ اور میرے عزیز۔ تم بھی کنویں کے مینڈک نہ بنے رہو۔ گھومو پھرو۔ دنیا دیکھو۔ تجربے حاصل کرو۔''

پروفیسر امین کی منطق اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اور جب اُنہوں نے دوبارہ اُسے کلب لے جانا چاہا تھا۔ تو اُس نے بڑے سلیقے اور شائستگی سے انکار کر دیا تھا۔

''سر...... میں اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ اسے پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے معذرت خواہ ہوں۔

''میاں...... ہم تو تمہارا ہی بھلا چاہتے تھے کہ دنیا کے رنگ دیکھ لو۔ آگے تمہاری مرضی......'' اُن کے لہجے میں کچھ مایوسی سی تھی۔

''سر...... ہر کوئی آپ کی طرح بخت آور تو نہیں ہوتا کہ جیت اُس کا مقدر ہو۔ آپ تو وہاں پر بھی فتح پر فتح حاصل کرتے رہے۔ میں ہوتا تو شاید......''

''تم کیا سمجھ رہے ہو۔ وہاں کیا فیئر گیم ہو رہا تھا...... شارپنگ ہو رہی تھی، میاں شارپنگ۔ اور جیتنے کے لئے مخالف سے زیادہ اسرار و رموز معلوم ہونے چاہئیں۔ بس یہ ہے خاص نکتہ اور تم چاہو تو میں تمہیں بھی سکھا دوں گا۔''

جبران نے حیران ہو کر اُنھیں دیکھا تھا، پروفیسر امین کی شخصیت کا یہ پہلو اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مگر اب وہ اچھی طرح جان گیا تھا، کہ زندگی میں ہمیشہ فیئر گیم نہیں ہوتا۔ لوگ جیتنے کے لئے بہت شارپنگ کرتے ہیں۔

''سر، گیم تو فیئر ہونا چاہیے۔ چاہے کوئی جیتے چاہے ہارے۔'' اُس نے دبی زبان میں احتجاج کیا۔

''اور اگر کوئی ہمیشہ ہی جیتنا چاہے تو......'' اُنھوں نے اُسے گھورا۔

وہ لاجواب سا اُنھیں دیکھنے لگا۔

''میرے عزیز، جیتنے کے لئے صرف مقدر پر ہی بھروسہ نہیں کرنا پڑتا۔ عقل کے گھوڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی دوڑانے پڑتے ہیں۔ دماغ لڑانا پڑتا ہے...... میاں دماغ۔''

اور واقعی اُنہوں نے عقل کے گھوڑے خوب دوڑائے تھے۔ کس کسی طریقے سے اُنھوں نے اُسے چت کرنا چاہا تھا۔ اور کیسی کیسی راہیں نکالی تھیں۔ راستے کا جھاڑ جھنکاڑ دُور کرنے میں وہ اپنی سطح سے بھی گر گئے تھے۔ جبران کے اندر جوالا مُکھی پھوٹ رہا تھا۔ اور وہ جو مُنھی لڑتے سرامین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جو بہت عظیم، بہت اونچے تھے...... اور وہ جنھوں نے زلفی جیسے شخص کو اُس کے پیچھے لگا دیا تھا...... وہ زلفی، جس کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے تھے اور وہ رُوئیں رُوئیں سے زہر...... وہ پہلے اپنی مقناطیسی باتوں سے لوگوں کو سحر زدہ کرتا تھا اور پھر اُسے ڈس لیتا تھا۔ اُس کی زہریلی پھنکاروں سے جبران کا بدن بھی نیلا ہونے لگا تھا، مگر اُسے خدا نے بچا لیا۔

اور اب...... اب اُنھوں نے سارے پتے شو کر دیے تھے۔ وہ جو ہر اذیت، ہر دُکھ کو مقدر کا لکھا سمجھتا رہا...... جو محبت کی بازی ہار کر بھی اُنھیں بے قصور جانتا رہا...... جسے کبھی یہ خیال نہ آیا، کہ اُس کے گرد مکڑی کی طرح جال بُنا جا رہا ہے...... اب آگہی کے جان لیوا عذاب سے گزر رہا تھا۔ اُس کے دماغ کی رگیں چیخ رہی تھیں۔ اور دل میں ایک ہولناک ویرانی تھی۔

''تو سمن سے شادی محض اتفاق نہ تھا۔ ایک سوچا سمجھا منصوبہ...... اور مقصد صرف مجھے توڑنا، تباہ کرنا، اندر سے ختم کر دینا، کیا یہ منصب ایک ایسے شخص کو زیبا ہے، جو ایک مقدس پیشے سے وابستہ ہو...... اتنا باوقار اور سوبر سا شخص اور ایسی گری ہوئی حرکت......''

''کیا اُن کے مسلک میں صرف چھیننا، جھپٹ لینا، حاصل کر لینا ہی شامل ہے۔ کاش اُن کے ظرف کا پیمانہ اتنا چھوٹا نہ ہوتا۔ وہ تھوڑے سے فراخ دل ہوتے تو شاید یوں نہ ہوتا......'' اُسے گیٹ سے نکلتے کیپٹن ندیم کا خیال آ گیا۔

''کیپٹن ندیم اور سرامین کی بھانجی......'' وہ چونک اُٹھا۔

''تو کیا یہ بھی اُن کی کوئی چال تھی...... کیا وہ اس حد تک جا سکتے تھے کہ...... ہاں اُن سے کوئی بعید نہ تھا۔''

ایک وحشت کے عالم میں اُس نے ریسیور اُٹھایا اور منیب کے نمبر ڈائل کیے۔

''منیب، مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے...... اور خدا کے لئے مجھے بالکل سچ سچ بتانا

ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں......'' اُس نے تھکی تھکی، شکستہ، مجروح آواز میں کہا۔

''بندۂ خدا، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟'' منیب نے اُلجھ کر پوچھا۔

''تم نے بتایا تھا نا کہ کرنل جان محمد تمہارے کچھ عزیز ہوتے ہیں،

''ہاں مگر......''

''تم مجھے بتاؤ کہ اُنھوں نے کیپٹن ندیم کی منگنی کیوں توڑی تھی......؟'' جبران نے بے قراری سے اُس کی بات کاٹی۔

منیب لحہ بھر کے لئے چُپ سا ہو گیا۔

''جبران یار...... اب اس بات کا کیا فائدہ۔ کیپٹن ندیم کی تو شادی بھی ہو گئی ہے۔ اب گزری ہوئی باتوں کو کیا دُہرانا۔''

''مجھے کوئی فائدہ حاصل کرنا نہیں۔'' اُس نے ترشی سے کہا۔ ''اور مجھے کچھ بھی نہیں کرنا...... بس مجھے اپنے ذہن کا ایک شک دُور کرنا ہے۔ لیکن پلیز...... مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔'' اُس کے لہجے میں آگ دہک رہی تھی۔

''یار ایسے ہی...... شاید اُنھیں کسی نے ڈاکٹر شیرازی کے کلینک میں ہونے والا واقعہ کچھ غلط انداز میں بتا دیا تھا۔'' منیب نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بتایا...... ''اور وہ غالباً کسی ایسے خاندان سے ناتا نہیں جوڑنا چاہتے تھے، جس کا ایک فرد نفسیات کے سلسلے میں......'' منیب کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

''کس نے......؟'' اُس کے دماغ کی ساری طنابیں ٹوٹ جانے کو تھیں...... ''کیا سرامین نے......؟''

اُس کا ایک ایک رُواں جیسے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اے کاش، وہ نہ ہوں...... اُس کا اندازہ غلط ہو۔ کم از کم اس معاملے میں نہیں......

''ہاں......'' منیب ہچکچایا۔

''جب تمہیں معلوم ہے تو......''

اُس کے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے۔ مرے مرے ہاتھوں سے اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں سر اور نہیں...... مجھ میں اور حوصلہ نہیں۔"

اُس کی کنپٹیاں تڑخ رہی تھیں۔ اور سر جیسے پھٹ جانے کو تھا۔ درد کی شدت نے اُسے وقتی طور پر بے سُدھ کر دیا۔ اور رُوئیں رُوئیں کو جلاتی آگ نے اُسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پورے تین دن وہ تیز بخار میں جلتا رہا تھا۔ پتا نہیں، یہ موسمی بخار تھا، یا اُس کے اندر جلتے الاؤ نے بخار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سب پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔ عالیہ تو اُس کی پٹی سے ہی چپکی رہی۔ وہ اُس کی حد درجہ بے قراری کو دیکھ رہی تھی۔ کرب میں ڈوبی ہوئی اندرونی ملال سے سُرخ آنکھیں۔ بار بار اضطراب سے سر پٹخنا...... کچھ سوچنا اور پھر ان سوچوں سے پیچھا چھڑوانے کی ناکام سی کوشش...... کبھی اُٹھنا، کبھی بیٹھنا...... کبھی تکیے کو پکڑ کر اوندھا پڑ جانا...... یہ صرف بخار کی بے چینی نہیں تھی۔ وہ بار بار سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا تھا۔ جیسے کوئی پچھتاوا رہ رہ کر دامن پکڑتا ہو۔ کبھی کبھی بالوں کو مُٹھیوں میں جکڑ لیتا۔ جیسے کسی خیال سے پیچھا چھڑاتا ہو۔ کبھی کوئی بے نام سی آہ بے اختیار ہونٹوں سے نکل جاتی تو ہونٹ سختی سے بھینچ لیتا۔ جیسے کسی اندرونی درد کو چھپاتا ہو۔

عالیہ نے بے حد محبت سے پوچھا۔

"جبران بھائی، آپ کو کیا پریشانی ہے......؟"

جبران نے جلتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"بہت درد ہے سر میں...... کوئی سر کے اندر آرے سے چلاتا ہے۔ یا ہتھوڑے سے کوٹتا ہے۔ لگتا ہے، ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

"کوئی ٹینشن ہے کیا......؟" اُس نے نرمی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں......" وہ اُسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کیسے بتاؤں، کہ آج میں کتنا بے اعتبار ہو رہا ہوں۔ آج کے بعد میں کسی پر اعتبار بھی کر سکوں گا یا نہیں......"

"آپ کو سمن بہت یاد آتی ہے......" عالیہ نے چپکے سے پوچھا۔ تب اُس کے ذہن کی رسائی اتنی ہی تھی۔

"سمن...... شاید وہ بھی۔ مگر کچھ دُکھ اُس سے کہیں زیادہ ظالم ہوتے ہیں...... اتنے کہ انسانیت پر سے اعتبار اُٹھنے لگتا ہے......"

ایک بہت عظیم بُت جو اونچے سنگھاسن پر بڑی شان سے براجمان تھا، اُس کی آنکھوں کے سامنے پڑا تھا۔

"پروفیسر امین مر گئے ہیں عالی......" جبران نے کھوئی کھوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"پروفیسر امین......" عالیہ کا دل دھک سا ہو گیا۔ "مگر کیسے...... اور وہ سمن......؟"

"سمن...... ہاں...... وہ...... نہیں، وہ زندہ ہیں۔ اور زندہ رہیں گے، ہمیشہ۔" جبران کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی...... "ہاں البتہ جس کو اُنھوں نے مارنا تھا، مار دیا۔"

"جبران بھائی......" عالیہ خوف زدہ ہو گئی۔ تب وہ اُن کی بات نہیں سمجھ سکی تھی۔

یہ تو جبران نے بعد میں بتایا تھا کہ وہ جو اخلاقیات کا درس دیا کرتے تھے، انسانیت کے درجے سے کتنا گر گئے تھے۔

عالیہ پریشان ہو رہی تھی، کہ کہیں جبران بھائی کو سرسام تو نہیں ہو گیا۔ وہ گھبرا کر نادیہ کو بُلا لائی کہ آپی دیکھیں۔ جبران بھائی عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

نادیہ کو دیکھ کر جبران کی آنکھوں میں اضطراب کروٹیں لینے لگا۔

"نادیہ آپی۔ میں آپ کا مجرم ہوں...... آپ کی خوشیوں کا قاتل...... مجھے معاف کر دیں۔" اُس نے اُٹھ کر نادیہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"دیوانے ہوئے ہو۔ بخار سر پر تو نہیں چڑھ گیا۔" نادیہ نے تشویش سے اُس کی تپتی پیشانی کو چھوا۔

"توبہ...... آگ کی طرح تپ رہے ہو...... اُول فول تو بکو گے ہی...... میں ٹھنڈا پانی لاتی ہوں، سر پر پٹیاں رکھنے کے لئے۔" وہ عجلت میں باہر چلی گئی۔

"آپ نادیہ آپی کی وجہ سے پریشان ہیں...... مگر اس میں آپ کا کیا قصور...... اُن کی قسمت میں یونہی لکھا تھا۔"

جبران نے تپتی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور کچھ کہے بنا آنکھیں بند کر لیں۔ "ہاں، شاید سارا قصور قسمت کا ہی ہو۔"

بخار اُتر گیا تو بھی وہ بستر پکڑے رہا۔ کہیں جانے کو یا کچھ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اُس کے اندر سے زندگی ختم ہو رہی ہو۔ ایڈمیشن شروع تھے۔ ایاز اور علی کے فون بار بار آ رہے تھے۔ کہ "مارکس کم سہی مگر کہیں نہ کہیں تو داخلہ مل ہی جائے گا...... ٹرائی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرو...... ہمارے نمبر بھی تو کچھ زیادہ نہیں...... پھر کیا سال ضائع کردیں۔"

"کیا فائدہ؟" وہ بے زاری سے کہتا۔

"تو کیا پھر ری پیٹ کرو گے......؟" وہ پوچھتے۔

"پتا نہیں۔ ابھی کچھ سوچا نہیں......"

اُس کی آنکھوں کے سامنے سرامین آ کھڑے ہوتے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ایک معزز پیشے سے وابستہ۔ اور ایک جاہل گنوار کی طرح منتقم مزاج اور درندہ صفت...... جڑیں کاٹنے والے۔ اور سازشی قبیلے سے تعلق رکھنے والے۔ وہ جو آستینوں میں خنجر رکھتے ہیں۔ اور بڑے تپاک سے گلے لگاتے ہیں۔

"نہیں......" اُس نے فیصلہ کیا۔

"مجھے ایسا علم نہیں چاہیے' جو مجھے انسانیت سے دُور کردے۔" وہ منفی جذبات کی یلغار میں تھا۔

"مجھے سرامین نہیں بننا...... چاہے میں زندگی بھر ہارتا رہوں......"

"مگر سرامین کہتے تھے، جیت کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔ ایک الگ ذائقہ...... ایک سنسنی خیز کھنکتا سا احساس۔ جیسے لمحہ بھر کے لئے سارا جہان دسترس میں آجائے۔ یا جیسے کوئی زمین پر کھڑے آسمان کو چُھو لے۔ یا اچانک پنکھ اُگ آئیں اور وہ ہواؤں میں اُڑنے لگے۔"

اور اُنھوں نے کہا تھا۔

"آؤ، میں تمہیں جیتنا سکھاؤں...... تاکہ تم بھی یہ ذائقہ چکھ سکو......"

اُنھوں نے اُسے کئی گُر بتائے تھے۔ کئی رازہائے درونِ خانہ...... اور وہ محض اُن کا دل رکھنے کے لئے ساری باتیں غور سے سنتا رہا تھا...... مگر اب ایک دم سے اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی جیت کا مزہ چکھے۔ آخر ہار ہی اُس کا مقدر کیوں...... اور اگر وہ ہار بھی گیا تو چند روپوں کی حقیقت ہی کیا۔ وہ تو بہت کچھ ہار چکا ہے...... اپنا سنہرا مستقبل، زندگی کی خوشیاں، سارے اعتبار اور اپنی محبت...... وہ تمسخر سے اپنے آپ پر ہنسا۔

"چلو ایک تجربہ یہ بھی سہی"

اور حیرت کی بات تھی، وہ جیت رہا تھا۔ ہر بازی جیت رہا تھا۔ اُس کے سامنے ٹوکنوں

کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ پھر اُس نے آخری بازی بھی جیت کر سارے ٹوکن اپنی طرف کھینچ لیے۔ اُس کے مدِ مقابل نے پتّے پھینک دیے۔

"بس بھائی، آج تمہارا مقدر زوروں پر ہے۔ مبارک ہو۔"

"مقدر...... ہاہا......"

اُس نے ہنسنا چاہا...... مگر اُس کے اندر کہیں خوشی کا احساس نہ تھا...... وہ کھنکتا سا احساس جو ایک الگ مزہ، الگ ذائقہ رکھتا ہے۔

"تو پھر چلو مقدر کو مزید آزماتے ہیں۔"

اُس نے سارے ٹوکن سمیٹے۔ کاؤنٹر پر سے کیش کرائے اور رولٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ رولٹ کا چکر تیز تیز گھوم رہا تھا۔ اور سارے نمبر آنکھوں کے سامنے تیزی سے گزر رہے تھے۔

"نمبر سات......"

اُس نے بغیر سوچے سمجھے پکارا۔ اور جیتی ہوئی ساری رقم اُس پر لگا دی۔ رولٹ پر کھڑے شخص نے چکر گھمایا۔ پہلے پہیہ تیز ہوا پھر ہلکا ہونے لگا...... دو، تین، چار، پانچ...... سات۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا...... سُرخ ایرو کا نشان سات پر تھا...... اردگرد کھڑے دم سادھے لوگوں میں شور مچ گیا۔

اتنی بڑی جیت...... رقم دُگنی ہو کر اُسے مل گئی تھی۔ وہ کچھ مایوس سا ہوا۔ کلب کے اندر کھلبلی مچی تھی۔ لوگوں کی چہ مگوئیاں...... قہقہے...... رشک بھری نگاہیں...... وہ اُن سب سے بے نیاز میز پر روپوں کی ڈھیری لگائے بیٹھا تھا۔

"نمائش لگائے کیوں بیٹھے ہو۔ سمیٹو اسے...... یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ احتیاط کرو" کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

"خوش ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اُس نے نظریں اُٹھائے بغیر کہا۔

"تو کیا تم اتنا کچھ پا کر بھی خوش نہیں!" لہجے میں حیرانی تھی۔

"کتنا کچھ......" پہلی بار وہ دو بازیاں کھیلا تھا۔

"یہ کاغذ کے حقیر ٹکڑے۔" اُس نے زہرخند سے کہا...... جنھیں آگ لگا دوں تو راکھ ہو جائیں...... اور پھاڑ دوں تو بے مول......" جیت کر بھی اُس کی آنکھوں میں ایک ہاری ہوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سی کیفیت تھی۔

''عجیب آدمی ہو......'' اُس نے شانے اُچکائے اور اُس کے سامنے کرسی پر آبیٹھا۔

''دوستی کرو گے......؟''

''کس سے دوستی...... مجھ سے یا ان کاغذ کے ٹکڑوں سے......؟'' اُس نے میز پر پڑے روپوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اُس کی نگاہوں میں تندی سی جھلکی۔

''نہیں...... مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی...... بہت بے اعتبار ہے یہ لفظ......'' وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور باہر جانے کو لپکا۔ مگر اس خوشرو نوجوان نے پیچھے سے اُسے پکارا۔

''ارے، ارے ٹھہرو...... تم روپے یہیں چھوڑے جا رہے ہو......''

جبران ٹھٹک کر رُکا، مُڑا اور روپوں کے ڈھیر میں سے دو بڑے نوٹ اُٹھا لئے۔'' میری اصل پونجی بس اتنی ہی تھی......'' اُس نے وضاحت کی اور باہر جانے کے لئے قدم اُٹھائے تو اُس نے پھر روکا۔

''اور یہ باقی رقم......؟'' اُس نے حیران ہو کر اُسے دیکھا......

''یہ تم رکھ لو۔'' جبران نے بے نیازی سے کہا۔

''میں بھکاری نہیں......'' نوجوان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔

''تو پھر باہر فقیروں میں بانٹ دینا۔''

''بڑے دیالو ہو......'' وہ مسکرایا۔

''نہیں...... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ پا کر کھونا کیسا لگتا ہے......'' پہلی بار جبران کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔

''تو پھر ایسا کرو...... یہ نیک کام اپنے ہاتھوں سے ہی انجام دے دو......''

جبران لاچار سارے روپے سمیٹنے لگا۔

''سنو دوستی نہ سہی تعارف تو ہو سکتا ہے......'' نوجوان کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔

''تعارف...... ہاں...... میں جبران ہوں......'' اُس نے بے توجہی سے کہا۔

''اور میں آصف ہوں۔ میڈیکل میں پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ کچھ ناگزیر وجوہ کی بناء پر تعلیم اُدھوری چھوڑنی پڑی۔ اب جاب کرتا ہوں، ایک دواؤں کی فیکٹری میں۔'' اُس نے تفصیل سے اپنا تعارف کروایا۔'' سوچا...... چلو ڈاکٹری نہ سہی...... اسی طرح ذوق کی

تسکین ہوتی رہے، شاید۔'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا، مگر اُس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا...... شاید مقدر کے خلاف یا اپنے آپ سے......

جبران چند لمحے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر قہقہہ لگا کر ہنسا...... اور پھر دیر تک ہنستا ہی رہا۔

آصف نے اُلجھی اُلجھی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی، جس پر یوں بے طرح ہنسا جائے۔

''معاف کرنا دوست......'' بالآخر اُس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔'' میں تم پر نہیں، اپنے آپ پر ہنس رہا ہوں۔ حالات کی ستم ظریفی...... اور زندگی کا ادھورا پن...... سنو، مجھے بھی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ میرا اور میرے والدین کا خواب تھا کہ میں...... خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ تمہاری اس دواؤں کی فیکٹری میں میرے لئے گنجائش نکل سکتی ہے......''
اُس نے مذاق کیا۔

''اگر تم سیریس ہو...... تو شاید...... کوشش کی جا سکتی ہے۔'' حالات کی مشابہت پر آصف بھی حیران تھا۔

''ویسے میرا خیال ہے کہ یہاں اس شہر میں کوئی ایسی فیکٹری نہیں، جہاں دوائیں بنتی ہوں......''

وہ اپنی سوئی سوئی کیفیت سے باہر نکل رہا تھا۔ بیزاری، نفرت اور بے حسی کی چادر سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ذہن بے حد چوکنا ہو رہا تھا۔

''فیکٹری یہاں نہیں، لاہور کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے میں ہے۔ میں ایک ہفتے کی چھٹی پر یہاں آیا ہوں۔ والدہ کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔'' آصف نے بتایا۔

''فیکٹری کا مالک کون ہے......؟'' اُس نے سرسری سا پوچھا۔

''سیٹھ کرامت...... خاصی معروف شخصیت ہیں۔''

''خوب...... تم سے مل کر خوشی ہوئی......'' وہ روپے سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

''پھر ملاقات کی توقع کروں؟'' آصف نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ اُمید پہ دُنیا قائم ہے۔'' وہ ہنسا...... ''ملنا چاہو تو آواری میں آ جانا...... شام چھ بجے۔''

باہر ہوا میں خنکی تھی، جو اچھی لگ رہی تھی۔ اُس نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اگر عثمان بھائی یا ابو مجھے یوں کارڈز کھیلتے اور رولٹ پر بازیاں لگاتے دیکھ لیتے تو کیا ہوتا بھلا......" اُسے خیال آیا۔

"شاید صدمے سے اُن کا دل ڈوب جاتا یا سکتہ ہو جاتا۔ شاید اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا کہ یہ میں ہوں۔ اُن کا ہونہار بیٹا، جبران واسطی...... کس قدر بچگانہ حرکت سرزد ہوئی تھی اُس سے......اور وہ کس سے لڑ رہا تھا بھلا...... اپنی تقدیر سے ...... یا اپنے آپ سے......اور اتنا غصہ، اتنی ناراضی اور اتنی سرکشی کس لیے۔ وہ کیسے توڑ پھوڑ رہا تھا...... دُنیا کو اپنے آپ کو...... نقصان تو وہ صرف اپنی ذات کو پہنچا رہا تھا۔ ہاں، وہ صرف اپنے آپ کو توڑنا پھوڑنا یا تباہ کرنا چاہتا تھا...... وہ صرف اپنی شخصیت کو مسخ کرنا چاہتا تھا۔ اُسے نفرت ساری دنیا سے نہیں، صرف اپنے آپ سے ہو رہی تھی اور وہ صرف اسی ہی گردن مروڑنا چاہتا تھا......"

"اب میں ٹھیک ہوں...... وہ ایک جذباتی لہر تھی جو آ کر گزر گئی...... ایک وقتی ملال......" اُس نے سوچا۔

اور اپنے آپ کو یوں ضائع نہیں کرنا...... میری زندگی کا ایک مشن ہے......اور مجھے اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے کارآمد بنانا ہے۔ اور آج سے میں اپنی زندگی کا ایک ایک پل اس مشن کے لئے وقف کرتا ہوں......"

اُس نے فیصلہ کیا۔ رکشہ شیرازی کلینک کے سامنے رک گیا تھا۔ ڈاکٹر شیرازی اپنے کمرے ہی میں ملے...... کسی سے فون پر باتیں کرتے ہوئے۔ اُنھوں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ بیٹھا نہیں۔ اُن کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا...... جب بات ختم کر کے اُنھوں نے ریسیور رکھا تو اُس نے روپوں کا پیکٹ اُن کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ روپے کسی ایسے مریض پر خرچ کر دیجیئے گا جو افورڈ نہ کر سکتا ہو۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا اور واپسی کے لئے مڑا۔

"سنو لڑکے...... ٹھہرو...... بیٹھ جاؤ......"

"جی فرمایئے......" وہ رُک گیا مگر بیٹھا نہیں۔

"کیا نام ہے تمہارا...... ہاں جبران...... تو جبران، میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں غلط سمجھا۔" وہ معذرت کر رہے تھے۔

جبران کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا اس معذرت سے وہ سب کچھ مجھے مل جائے گا جو چھن گیا...... زندگی کی ساری خوشیاں، من چاہی رفاقتیں، مستقبل کے سنہرے خواب ...... اور میرا اپنا آپ......، تلخی اُس کے اندر بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہیں سر......کوئی بھی معذرت اتنے بڑے نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی۔"

اس نے سوچا......

"مگر آپ کا بھی کیا قصور...... ان حالات میں غلط فہمی ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا۔"

"نہیں سر...... قصوروار نہ آپ ہیں نہ کوئی اور...... سارا کھیل تو مقدر کا ہے۔ آپ نے اتنا بھی کہہ دیا تو بہت ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔

اُسی شام اُس نے چائے پیتے ہوئے بتایا کہ وہ ایڈمیشن نہیں لے رہا، بلکہ اپنی تعلیم کا سلسلہ یہیں پر ختم کر رہا ہے۔ پل بھر کے لئے جیسے سب ساکت سے ہو گئے۔ پھر ابّو جان سنبھلے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا......" اُنھوں نے غصّے سے اُسے گھورا۔ "پڑھو گے نہیں تو کیا ہل چلاؤ گے۔ آخر تم کن لوگوں کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے لگے ہو کہ نئی نئی باتیں سوجھنے لگی ہیں۔ خبردار جو اب ایسا سوچا بھی۔"

وہ سر جھکائے اُن کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا...... کچھ بولا نہیں...... نہ سر اُٹھایا...... مگر انداز سے لگ رہا تھا کہ جو ٹھان لی ہے، کر کے چھوڑے گا۔ ابّو جان اُسے خاموش دیکھ کر بغیر چائے پیئے ناراض سے اُٹھ گئے۔ نادیہ، عالیہ نے بہت سمجھایا۔ جواد اور بجیا کو معلوم ہوا تو وہ بھی دوڑے چلے آئے۔ بجیا ڈانٹتی رہیں۔ وہ سر جھکائے اُن کے پہلو سے بیٹھے نومی سے کھیلتا رہا اور اُن کی ڈانٹ سنتا رہا۔

"میں نے اُن کی اُمیدوں کے سنہرے پنکھ توڑ دیے ہیں۔ اور اُن کی آرزوؤں کے گلاب پاؤں تلے مسل ڈالے ہیں۔ اگر اس طرح اُن کا رنج و ملال اور دُکھ کم ہوتا ہے تو یونہی سہی۔"

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے...... کچھ تو بتاؤ ...... یہ خناس دماغ میں آیا کیوں؟" تنگ آ کر انہوں نے پوچھا۔

"بس یونہی...... کوئی بات نہیں......" اُس نے جیسے ٹالا۔ اور اُس کے بعد ہونٹوں پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک جامد چپ۔

سب پوچھ پوچھ کر اور سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔

عثمان بھائی بار بار فون کرتے۔

"دیکھوں جبران ...... مجھے معلوم ہے کہ اپنے مارکس دیکھ کر تم ڈس ہارٹ ہوئے ہو۔ مگر تم جتنے ڈسٹرب رہے ہو۔ ان حالات میں یہ بھی بہت ہے...... اور اگر تمہیں بہت ہی افسوس ہے تو ری پیٹ کرلو...... یوں نہ کرو......"

"نہیں عثمان بھائی ...... دل ہی نہیں چاہتا......"

"بھائی، اپنے دل کو سمجھاؤ۔ یوں اپنے پیاروں، اپنے چاہنے والوں کو نہیں آزماتے۔"

"عثمان بھائی...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ فون رکھ دیتا۔

"جبران میرے بھائی...... آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" وہ بے بسی سے پوچھتے۔

"کوئی مسئلہ نہیں عثمان بھائی...... آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ نرمی سے تسلی دیتا...... آپ نے بہت پڑھا۔ عثمان پڑھ رہا ہے۔ ایک میں نے نہ پڑھا تو قیامت نہیں آجائے گی۔"

"ہر ایک کی اپنی اپنی اہمیت ہوتی ہے بے وقوف۔" وہ جھنجھلا جاتے ...... کرو گے کیا آخر......؟"

"جاب...... میں جاب کرنے والا ہوں......"

"ایسا کرو...... تم یہاں آجاؤ میرے پاس...... پھر اس معاملے کو ڈسکس کریں گے۔" اُنھوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میں فیصلہ کر چکا ہوں عثمان بھائی......" اُس کے لہجے میں پختہ ارادے کی جھلک تھی۔

عثمان بھائی چپ ہوگئے۔ مگر مایوس ہونے کے باوجود بھی وہ اُسے فون کرتے اور سمجھاتے رہے۔ لیکن اُس کا فیصلہ اٹل تھا۔

پتا نہیں، وہ سارا سارا دن کہاں مارا مارا پھرتا تھا...... اکثر رات گئے گھر آتا۔ ابو جان اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے...... وہ اُس سے بات نہیں کرتے تھے۔ دل ہی دل میں وہ اُس سے بہت ناراض تھے۔ اُنھیں اُس پر بہت غصہ تھا کہ کس طرح اُس نے بے سوچے سمجھے اُن کی تمناؤں کو آگ لگا دی تھی۔ ذرا لحاظ نہ کیا۔ ساری اُمیدوں کو خاک کر دیا۔ امی جان کچھ کہتی نہ تھیں مگر اُن کی آنکھیں شکوہ کرتی تھیں۔

اُس دن جب وہ تھکا تھکا سا اُن کے گھٹنوں پر سر رکھے لیٹا تھا، تو اُنھوں نے اُس کے بکھرے بال سنوارتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا۔

"بچے...... آخر تو ہمیں کتنے دُکھ دے گا......؟"

اور پھر اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اس کے چہرے پر گرنے لگے تھے۔

"امی جان ......" وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا......"میں بہت مجبور ہوں، امی جان ...... مجھے معاف کر دیجیے۔"

اُس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اور اس لمحے وہ اتنا مجبور، بے بس اور لاچار لگ رہا تھا کہ امی جان نے بے اختیار اُس کی پیشانی چوم لی۔

"بچے، جیسے تیری خوشی......"

وہ چپ ہوگئیں تو وہ پھر اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ کتنے دنوں بعد وہ اس طرح لیٹا تھا۔ جب کبھی اُسے بہت لاڈ آتا تھا۔ یا وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ تو اسی طرح اپنا سر اُن کی گود میں رکھ کر آنکھیں مُوند لیتا تھا۔ مگر آج...... وہ اُسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ آج وہ خوش نہیں تھا۔ بہت الجھا اُلجھا سا متفکر...... اور شاید اندر سے بہت دُکھی۔

"بچے...... کیا روگ لگا لیا ہے تو نے......؟" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

"امی جان......" اُس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ "ایک بات کا یقین رکھیے گا کہ میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا۔"

اور ابھی وہ اُس کی بات کو پوری طرح سمجھ بھی نہ سکی تھیں کہ وہ اُٹھ کر چل دیا۔

اور وہ دیر تک بیٹھی سوچتی رہیں کہ آخر اُس نے ایسا کیوں کہا۔

اُس دن کے بعد وہ کلب تو نہیں گیا، لیکن آصف سے تقریباً روز ہی ملتا رہا تھا۔ جانے کیوں آصف اُس سے بہت متاثر ہوگیا تھا۔ وہ ہر بات اُس سے کہہ دیا کرتا تھا۔ باپ کی ناگہانی موت...... ماں کی بیماری...... قریبی عزیزوں کی طوطا چشمی...... بہنوں کی شادی...... تعلیم اُدھوری رہنے کا غم۔ سب ہی کچھ تو اُس نے جبران سے کہہ دیا تھا۔ اور وہ زیادہ تر سُنتا ہی رہا تھا۔ ان دس دنوں میں وہ آصف کے بارے میں تقریباً سب کچھ جان گیا تھا۔ اپنے بارے میں اُس نے صرف اتنا بتایا تھا، کہ وہ نوکری کی تلاش میں ہے۔

آصف سوچ میں پڑ گیا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہماری فیکٹری میں تنخواہیں تو خاصی پُرکشش ہیں۔ شاید کوئی ویکنسی نکل ہی آئے۔ منیجر سے بات کروں گا......"

"بہت سے لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔ دیکھو کہاں بات بنتی ہے۔" جبران نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے اور موضوع بدل دیا۔ جیسے وہ بہت بیزار ہو چکا ہو۔ اور اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ مگر بڑی عجیب بات ہوئی تھی۔ آصف کو گئے ابھی ہفتہ بھر بھی نہ ہوا تھا کہ اُس کا فون آ گیا۔

"اب تو مجھے یقین آ گیا ہے کہ تمہارا ستارہ واقعی عروج پر ہے" اُس نے خاصے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"میرا ستارہ ...... ہاں......" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "بقول تمہارے...... مقدر زوروں پر ہے......"

"بالکل ......" وہ اپنے ہی جوش میں تھا...... "یہاں اتفاقاً...... بالکل اچانک ایک شخص کو نوکری چھوڑنی پڑ گئی ہے۔ اور میں نے تمہارے لیے بات کر لی ہے۔ اور حیرت یہ ہے کہ منیجر نے بات مان بھی لی ہے۔ حالانکہ مجھے کوئی خاص توقع نہ تھی۔ یہاں وہ اپنے اعتماد کے آدمیوں کو رکھتے ہیں......"

"کیوں نہ رکھتے......" وہ بھی کُھل کر اپنے آپ پر ہنسا۔ ستارہ جو عروج پر ہے......"

اُس کے اندر کڑواہٹ بھر گئی۔

"تو بس فوراً آجاؤ...... وقت ضائع نہ کرو......" اُس نے مشورہ دیا اور پھر اپنا ایڈریس سمجھا کر فون رکھ دیا۔

"ہاہا...... مقدر کا ستارہ ...... جو کہیں اندھی گھاٹیوں میں غروب ہو گیا ہے۔ یا اندھیرے راستوں میں گم ...... عروج پر ہے......۔"

پتا نہیں کیسا درد تھا، جو ہولے ہولے اُس کے دل کو بھینچ رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی اُداسی دم بدم چھاتی دُھند کی طرح اُسے اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ اور جانے اُسے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا کہ آنکھیں سُلگ اُٹھیں۔ اور وہ رُوم رُوم میں اُٹھتی درد کی ٹیسوں کو برداشت کرتا بہت نڈھال سا امی جان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا...... وہ خاموشی سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر اُس نے اپنے چہرے پر ٹپ ٹپ گرتے اُن کے آنسوؤں کو بھی محسوس کیا۔

اور اُن کے اندر کے دُکھ کو بھی۔ وہ ماں تھیں۔ اُسے برباد دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور وہ اُنھیں یہ یقین دلاتا کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہا' اٹھ گیا۔

اُسی رات کھانا کھاتے ہوئے اُس نے سرسری سے انداز میں بتایا۔

"ابو جان، مجھے جاب مل گئی ہے اور صبح میں جا رہا ہوں۔" پانی پیتے پیتے ابو جان ٹھٹک سے گئے۔ پھر گلاس رکھتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"تم اپنی مرضی کے مالک ہو صاحبزادے۔ قطعی خودمختار۔ میں کون ہوتا ہوں، تمہیں روکنے والا۔ یا کوئی مشورہ دینے والا۔" وہ خفا بھی تھے اور سخت رنجیدہ بھی۔

پتا نہیں، اُن کے سعادت مند، ہونہار اور حد درجہ فرماں بردار بیٹے کو کیا ہو گیا تھا، جو وہ اپنی زندگی تباہ کیے دے رہا تھا۔ اور کوئی تاویل اور کوئی جواز سُننے کو تیار نہ تھا۔ امی جان نے توڑا ہوا لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا تھا اور اُسے ایک ٹک بہت دُکھ بڑی حسرت سے دیکھے جا رہی تھیں۔ جیسے اپنی آنکھوں میں سمو لینا چاہتی ہوں۔ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور نادیہ کے چہرے کا رنگ بُجھ گیا تھا۔ مگر وہ سب سے بے خبر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جاتے ہوئے وہ زبردستی ابو جان کے گلے لگ گیا۔

"ابو جان۔ میں اور ہی راہوں کا مسافر ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔"

پتا نہیں اُس کے لہجے میں کیا تھا، کہ ابو جان کا ہاتھ بے اختیار اُس کے سر پر ٹک گیا۔

پھر وہ وہاں ٹھہرا نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

جانے سے پہلے وہ حامد رانا کو فون کرنا نہیں بھولا تھا۔ "یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔" اُس کی آواز سنتے ہی وہ پھٹ پڑے تھے۔ "بہت دن ہوئے، میں نے تمہیں کلب میں دیکھا تھا...... عادی جواریوں کی طرح بازیوں پر بازیاں لگاتے۔ اور پھر جیتتے ...... مجھے تو تم مشکوک سے لگنے لگے ہو......"

"اچھا......" وہ کُھل کر ہنسا۔ "تو آپ بھی وہیں تھے۔ میری نظر تو نہیں پڑی......"

"تھوڑی دیر کے لئے میں گیا تھا۔ کسی سے ملنے۔ اور تم کیسے دیکھتے...... تمہاری نظریں تو رولٹ کے نمبروں سے اُلجھ رہی تھیں......" اُنھوں نے جل کر کہا۔

"یہ تو ہے......" اُس نے اعتراف کیا۔ "ویسے سرکمائی بڑی زبردست ہے۔ ایک کے لاکھ بنا لو منٹوں میں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بکومت......" اُنھوں نے ڈانٹا......" میں جانتا ہوں، تم نے کتنے کمائے اور وہ کہاں گئے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ، کن چکروں میں پھنسے ہوئے ہو......"

"چکر تو کوئی نہیں سر...... جسٹ فار اے چینج...... ویسے مجھے جاب مل گئی ہے، دواؤں کی فیکٹری میں......اور اب میں آپ کے سامنے ثبوت کے ساتھ ہی آؤں گا؟"

"اوہ......تو تم......" وہ کچھ مضطرب سے ہوگئے......" مگر تمہاری تعلیم...... کیا تم اسے اُدھورا چھوڑ دو گے......"

"تعلیم سر...... کیا فائدہ ایسی تعلیم کا' جو ایک اُجڈ، گنوار اور منتقم مزاج آدمی اور ایک مہذب تعلیم یافتہ شخص میں فرق نہ کر سکے۔" اُس کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی۔

"اور سر میری زندگی کا جو مشن ہے، وہ تعلیم سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور تعلیم ہی کیا سر......میری زندگی، میرا مستقبل، میری ساری خوشیاں اس کے سامنے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔"

"لڑکے۔ تم بہت خطرناک کھیل کھیل رہے ہو...... ایسا نہ ہو، اپنے ہاتھ جلا بیٹھو......"

اگرچہ اُن کی عمر کوئی بہت زیادہ نہ تھی، مگر اُن کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی، اور قدرے تشویش بھی......

"سر...... میرے ایک اُستاد ہوا کرتے تھے...... بڑے عالم فاضل، عظمت کے مینار پہ ایستادہ......کوئی لائٹ ہاؤس...... یا قطبی ستارہ......" اُس کے لہجے میں طنز کے ساتھ ساتھ کچھ ملال بھی گھل گیا تھا......" فرماتے تھے۔ تجربے کرتے رہنا چاہیے۔ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو سر...... ایک تجربہ یہ بھی سہی۔ جل اُٹھے تو اپنا ہی تماشا کریں گے۔ اور نہیں تو کچھ اندھیرے ہی دُور کر جائیں گے۔ سو ڈونٹ وری سر...... ایک زندگی ہی تو ہے نا...... جو جیت گئے تو کیا کہنے...... ہارے بھی تو بازی مات نہیں......"

اُس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی تھی۔ جیسے وہ زندگی کو پرِکاہ برابر جانتا ہو۔ جیسے اُسے اس زندگی سے کوئی خاص دلچسپی نہ رہی ہو۔ جیسے اُسے کسی چیز کی بھی پروا نہ رہی ہو...... اور جیسے وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ زندگی کی قیمت پر بھی......" کیا ہوا ہے اس لڑکے کے ساتھ جس نے اُسے زندگی سے بے زار کر دیا ہے......" وہ سوچ رہے تھے۔

"دیوانے ہو گئے ہو...... خودکشی کرنا چاہتے ہو...... تو پھر شوق سے کرو، میں کیا کر سکتا

ہوں......" وہ کچھ خفا بھی تھے اور جھنجلائے ہوئے بھی۔

"دیوانے ہی کچھ کر گزرتے ہیں سر...... فرزانے تو عقل و خرد کی گتھیاں ہی سُلجھانے میں لگے رہتے ہیں۔" وہ پُرعزم بھی تھا اور پُراُمید بھی......

حامد علی لاجواب ہو کر رہ گئے۔

"مجھے بس آپ کی دُعا چاہیے سر......"

"بہت بڑی بازی کھیل رہے ہو...... مگر خیر...... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"شکریہ سر...... میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" اُس کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

مگر حامد رانا متفکر تھے۔ جانے یہ لڑکا کیا کرنے والا ہے۔ اپنی جان سے کھیل رہا ہے، اور اتنا سرسری سا انداز۔ جانے کیوں ہر چیز اُس کے لئے اتنی غیر اہم ہوگئی ہے۔ مگر کہتا درست ہے۔ ایسے جیالے ہی کچھ کر گزرتے ہیں۔"

جبران جب گاؤں پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ اور آصف اُس کا منتظر تھا۔

"آبادی سڑک سے ذرا ہٹ کر ہے اس لئے سوچا، میں خود ہی آجاؤں تمہیں لینے۔" اُس نے گرمجوشی سے کہا۔

"مہربانی......" جبران نے بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یار، اب ہم نے ایک ہی جگہ رہنا ہے۔ اور جانے کب تک۔ اس لئے ان تکلفات کو چھوڑ دو۔" آصف نے بے تکلفی سے کہا۔

"چھوڑ دیا......" جبران نے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے کسی پرندے کو ہوا میں اُڑا رہا ہو۔

آصف ہنس پڑا......" آدمی دلچسپ ہو......"

پھر دونوں باتیں کرتے پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ آصف اُسے گاؤں کے متعلق بتانے لگا۔

"آبادی کچھ زیادہ نہیں...... مگر لوگ اچھے ہیں اور مہمان نواز۔ شہر جیسی سہولتیں تو نہیں مگر تمہیں زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ اور تمہارے آنے میں سب سے بڑا فائدہ میرا ہے۔ یہاں جہاں شام ہوتے ہی گلیاں سُنسان ہو جاتی ہیں۔ ایک ہم ذوق کے بغیر وقت گزارنا کارِ دارد ہے، سو میں بہت خوش ہوں۔"

جبران ہوں ہاں کرتا اپنی ہی سوچوں میں کھویا رہا۔ رات کھانے کے بعد دونوں دیر تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باتیں کرتے رہے۔ آصف اُسے فیکٹری کے متعلق بتاتا رہا۔ بیچ بیچ میں جبران بھی کوئی سوال کرتا رہا۔ پھر آصف اُسے سونے کی تلقین کرتا اُٹھ گیا...... وہ تو جلد ہی سو گیا۔ مگر جبران دیر تک کھلی آنکھوں سے اندھیرے میں دیکھتا رہا۔ اجنبی جگہ تھی اور غیر مانوس سا ماحول...... شاید اسی لیے نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے کے باہر پُر ہَول سی ویرانی۔ اور کبھی کبھی کسی گیدڑ یا کتے کی آواز۔ جو سناٹے کو مجروح کرتی اُسے چونکا دیتی۔ اس خاموشی، ویرانی اور سناٹے میں جانے کیا کچھ اُسے یاد آتا اور اُداس کرتا رہا۔ پھر جانے کب اُسے نیند آگئی۔

اگلی صبح وہ آصف کے ساتھ فیکٹری آگیا۔ منیجر نے اُس سے چند رسمی سے سوالات پوچھے اور پھر پیکنگ کی نگرانی اُس کے سپرد کر دی۔

"فی الحال یہ ملازمت عارضی ہے...... آزمائشی سمجھ لو۔ مگر اسے مستقل بھی کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ دیانت سے کام کرو۔ اور فیکٹری کے مفادات کا خیال رکھو۔" منیجر نے وارن کیا۔

"یس سر...... آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جاؤ اور اپنے کام سے کام رکھو۔ اور یہاں کی کوئی بات باہر نہ جانے پائے۔ میرا مطلب ہے، ہر ادارے کے اپنے کچھ سیکرٹ ہوتے ہیں، جن کی حفاظت ادارے کے ہر فرد پر لازم ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں سر......"

"تو جاؤ۔ آصف تمہیں سب کام سمجھا دے گا۔"

منیجر نے بات ختم کی تو وہ آصف کے ساتھ چلا آیا۔ آصف نے اُسے تمام ضروری باتیں سمجھا دیں۔ کام زیادہ مشکل نہ تھا۔ بس پیکنگ کی نگرانی اور حساب کتاب رکھنا تھا۔ پیکنگ کے دوران وہ گہری نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ مگر اُسے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ ہر شخص خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ بھی اپنے کام میں لگ گیا۔

اگرچہ جبران شروع دن سے ہی کھوج میں تھا، مگر اُسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آرہی تھی۔ فیکٹری میں سارا دن معمول کے مطابق کام ہوتا، دوائیں تیار ہوتیں۔ پیک کی جاتیں اور پھر مختلف سینٹرز پر روانہ کر دی جاتیں۔ اب تو وہ کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔ شاید اُس نے غلط ہی سُنا ہو۔ بڑے لوگوں کے دشمن بھی تو بہت ہوتے ہیں۔ شاید سیٹھ کرامت کے

خلاف بھی کسی نے بے پر کی اُڑائی ہو۔

وہ گاؤں میں آصف کے ساتھ ہی مقیم تھا۔ آصف نے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان لے رکھا تھا۔ ایک بوڑھی عورت کھانا پکانے اور صفائی کرنے کے لئے موجود تھی۔ جو کام کر کے چلی جاتی تھی۔ آصف ایک اچھے ساتھی کے ملنے پر بہت خوش تھا۔ مگر جبران کھویا کھویا سا رہتا۔ ہر وقت کسی فکر میں ڈوبا ڈوبا ہوا۔ بہت خاموش، شاید کچھ اُداس بھی۔ آصف نے کئی بار اُس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ پھر اسے اُس کی عادت سمجھ کر مطمئن ہوگیا۔ کچھ بھی تھا، وہ جبران کو پسند کرنے لگا تھا۔ اُس نے اُس کی تنہائیاں بانٹ لی تھیں۔ اور جب کبھی وہ موڈ میں ہوتا تو وقت بہت اچھا گزر جاتا تھا۔ پھر آصف کو اپنی ماں کی وجہ سے جانا پڑا تو جبران کو احساس ہوا کہ اس اُجاڑ، ویران گاؤں میں تنہا رہنا واقعی مشکل ہے۔ آصف کا وجود غنیمت تھا۔ اُس نے نہ صرف چھوٹے موٹے کئی کام سنبھال رکھے تھے بلکہ کبھی اُسے اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔

رات اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے میں کچھ گھٹن سی تھی۔ یہ پریشانی بھی تھی، وہ ابھی تک کچھ نہیں کر سکا تھا، تھوڑی دیر وہ گھر کے باہر ٹہلتا رہا۔ کھلی فضا میں گھٹن کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے فیکٹری کی طرف نکل آیا۔ وہاں لوگوں کی گہما گہمی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ بڑے بڑے کارٹن ٹرک پر لوڈ کیے جا رہے تھے۔ مگر اتنی خاموشی کے ساتھ جیسے وہاں کام کرنے والے جیتے جاگتے انسان نہ ہوں، بلکہ روبوٹ ہوں۔ جبران اندھیرے میں درخت کے ساتھ کھڑا اندھیرے کا ایک حصّہ بنا اُنھیں دیکھتا رہا۔ سارا کام ہلکی روشنی میں ہو رہا تھا۔ جب ٹرک لوڈ ہو کر جا چکا اور مدھم روشنیاں گُل ہوگئیں تو جبران بھی واپس لوٹ آیا۔ وہ دیر تک اس معمّے کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوئی نہ کوئی بات تھی ضرور۔ ورنہ رات کے اس پہر اتنا پُر اسرار انداز۔ اُسے کچھ اُمید سی ہونے لگی۔ کہ شاید اُس نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔

اگلے دن اُس نے چوکیدار کو کُریدا تو معلوم ہوا کہ یہاں رات کو بھی ایک شفٹ ہوتی ہے۔ اور یہ کہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے وہ نہیں ہوتے' جو دن کو کام کرتے ہیں۔ البتہ اُن کی نگرانی منیجر ہی کرتا ہے۔ چوکیدار سے سرسری سی بات کر کے جبران اپنے کام میں مصروف ہوگیا، مگر اُس کا ذہن اسی سوچ میں اُلجھا رہا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ کلیو تو مل ہی گیا تھا۔ اب اُسے صرف یہ معلوم کرنا تھا، کہ کیا رات کی شفٹوں میں بھی کوئی عمل قابلِ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گرفت نہیں۔ اُس نے اپنی کوششیں تیز تر کردیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر وہ فیکٹری کی نگرانی کرتا مگر کچھ پتا نہ چلا۔ اندر مکمل خاموشی اور اندھیرا ہوتا۔ اُسے حیرت ہوتی کہ اندر اندھیرے میں وہ لوگ کیسے کام کرتے ہیں۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ فیکٹری کے اندر رہ کر دیکھے گا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اس طرح اُسے معلوم ہوا کہ فیکٹری کے اندر خاموشی اس لیے ہوتی ہے کہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے فیکٹری کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانوں میں کام کرتے ہیں۔ ایک بار وہ ان تہہ خانوں میں گھسنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہاں صرف پیکنگ کا کام ہو رہا ہے۔ دو کارکنوں کی باتوں سے اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہاں ہیروئن کی پیکنگ ہو رہی ہے۔ اور یہ ہیروئن کسی اور جگہ تیار ہوتی ہے۔ اور یہاں پر کسی زمین دوز سرنگ کے ذریعے لائی جاتی ہے۔

کئی دن کی کوشش کے بعد اُسے اور بھی کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ حتیٰ کہ اُس نے سرنگ کے دہانے اور اُس جگہ کا بھی پتا چلا لیا۔ جہاں ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔

آصف ابھی تک چھٹی پر تھا۔ شاید اُس کی والدہ زیادہ بیمار ہوگئی تھیں۔ اسی لیے جبران بے فکر ہوکر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ جب اُسے خاطر خواہ معلومات حاصل ہوگئیں تو اُس نے قریبی قصبے سے حامد رانا کو فون کر کے ساری تفصیلات بتائیں۔ آخر میں اُس نے کہا کہ اگر لوڈنگ سے پہلے اور پیکنگ کے بعد چھاپا مارا جائے تو ہیروئن کی ایک بہت بڑی مقدار برآمد کی جاسکتی ہے۔"

حامد رانا سوچ میں پڑ گئے۔

"بات یہ ہے کہ وہ علاقہ میرے ایریے میں نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ایک بار پہلے بھی کسی مخبر کی اطلاع پر چھاپا مارا گیا تھا، مگر کچھ نہ ملا۔ تہہ خانوں میں رجسٹرڈ دواؤں کا اسٹاک تھا، اور بس۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ چھاپے کی اطلاع ملتے ہی وہ زمین دوز سرنگ سے ہیروئن کہیں اور منتقل کر دیتے ہوں گے۔ آخر اُن کے مخبر بھی تو ہوں گے آپ کے محکمے میں۔"

"اس کا علاج تو ہے میرے پاس۔ یعنی کسی کو بھی آخر وقت تک نہ بتایا جائے کہ چھاپہ کہاں مارا جا رہا ہے۔ اور ہر ممکن احتیاط و رازداری برتی جائے۔" اُنھوں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "مگر چھاپے کے بعد بھی کچھ نہ ملا تو بڑی سبکی ہوگی۔"

"سر! میں اُس جگہ کی نشاندہی بھی کرسکتا ہوں، جہاں ہیروئن تیار کی جاتی ہے۔ اور سرنگ کے دہانے کی بھی۔ اگر دہانے کی نگرانی کے ساتھ ساتھ بیک وقت دونوں جگہوں پر چھاپے مارے جائیں تو وہ ہیروئن کہیں اور منتقل نہ کرسکیں گے۔"

"ممکن ہے۔ مگر اور بھی کئی قباحتیں ہیں۔ وہ جگہ بھی میرے ایریے میں نہیں۔ پھر کئی مسئلے اور بھی ہیں۔" وہ کچھ متفکر سے تھے۔

"تو کیا سر! میری ساری تگ و دو لا حاصل تھی۔" اُس نے مایوسی سے پوچھا۔

"نہیں خیر۔ ایسی بات بھی نہیں۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔ تم کل اسی وقت مجھے فون کرنا پھر ہی کچھ کہہ سکوں گا۔"

جبران متفکر تھا کہ جانے کیا ہو مگر اگلے دن جب اُس نے دوبارہ فون کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ تمام معاملات طے ہوگئے ہیں۔ اتفاق سے اُن کے ایک عزیز اُس علاقے میں تعینات ہیں اس لیے اُنھیں کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ پھر وہ اُس سے پوچھنے لگے کہ پیکنگ کب ہوتی ہے اور لوڈنگ کس دن۔؟

جبران نے تمام باتیں تفصیل سے بتائیں۔ وہ ضروری باتیں پوچھتے رہے۔ سُرنگ اور فیکٹری کا محلِ وقوع سمجھ لینے کے بعد اُنھوں نے کہا۔

"ہم رات کو ریڈ کریں گے۔ بیک وقت تینوں جگہ پر چھاپا مارا جائے گا۔ مگر تمھیں پسِ پردہ رہنا ہے اس لیے تم گھر تک محدود رہو گے۔"

"مگر سر۔ کیا سُرنگ کے دہانے تک رہنمائی کے لئے میری ضرورت نہیں ہوگی۔"

"نہیں۔ کیونکہ میں نے سب کچھ اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اور ہمارا کوئی آدمی دن کے وقت ان مقامات کا جائزہ لے لے گا۔ ابھی مجھے کئی انتظامات کرنے ہیں۔ کل کا دن بلکہ رات بھی بڑی مصروفیت کی ہے۔ شاید مقابلے کی نوبت بھی آجائے۔"

"مگر سر، خیال رہے کہ دن کی شفٹ میں کام کرنے والے اس معاملے سے لاعلم ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے مگر رسمی کارروائی تو کرنی پڑے گی۔ معمولی پوچھ گچھ کے بعد اُنھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ تم فی الحال اپنی غیر معمولی سرگرمیاں فوراً ترک کر دو۔ اور گھر تک محدود رہو۔"

"او کے سر۔ وِش یو دا بیسٹ لک۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تھینک یو۔ اپنا خیال رکھنا۔" اُنھوں نے فون بند کر دیا۔

جبران کچھ مضطرب سا تھا۔ کل تک کا وقت کاٹنا اُس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بار بار اُسے وہم سا اُٹھتا کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوگا کہ اُنھیں اطلاع ہو جائے گی اور چھاپہ ناکام ہو جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ چھاپہ اتنا مکمل اور کامیاب تھا کہ آخر وقت تک کسی کو پتا نہ چلا۔ مقابلے کی تو نوبت ہی نہ آئی۔ سُرنگ کے دہانے اور فیکٹری کی ناکہ بندی اتنے منظم طریقے سے کی گئی تھی، کہ کسی کو فرار ہونے کا موقع نہ ملا۔ جس حویلی میں ہیروئن تیار کی جاتی تھی، وہاں بھی کئی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ جبران اور کچھ دوسرے کارکنوں کو معمولی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ وہ اس سارے معاملے سے لاعلم تھے۔ سیٹھ کرامت حسین کو فوری طور پر گرفتار کرلیا گیا اور فیکٹری سیل کر دی گئی۔

اب گاؤں رہنا فضول تھا، اس لیے جبران بھی گھر واپس آ گیا۔ حامد رانا اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ جبران کی پھر اُن سے بات نہ ہو سکی۔ مگر اخبارات کے ذریعے اُسے کافی خبریں مل رہی تھیں۔ اخبار ہی سے اُسے معلوم ہوا کہ سیٹھ کرامت حسین کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ پھر اگلے دن اخبار میں اُن کا بیان چھپا کہ ہیروئن کے اس کاروبار سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ فیکٹری بلاشبہ اُن کی ہے۔ مگر منیجر اس کی آڑ میں جو کچھ کرتا پھر رہا ہے، وہ اُس سے قطعاً بے خبر تھے۔ اور چونکہ وہ سیاست میں آ رہے تھے اور قومی اسمبلی کی سیٹ پر کھڑے ہونے والے تھے، اس لیے اُن کے خلاف یہ گھناؤنی سازش کی گئی ہے۔ اور یہ کہ منیجر ضرور اُن کے کسی دشمن کا آلۂ کار ہے۔

بہر حال بیان بازیاں ہوتی رہیں۔ کچھ اخبارات حامد رانا کی حمایت میں لکھ رہے تھے اور کچھ مخالفت میں۔ اصل بات کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

جبران کے ذہن میں کئی سوالات تھے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ پریشان ہو کر اُس نے ایک بار پھر حامد رانا سے بات کرنے کی کوشش کی اور اس بار اتفاق سے وہ اُسے مل بھی گئے۔

"سر۔ بہت دنوں سے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر آپ مل نہیں رہے تھے۔"

"ایسا کرو، اسی وقت آ جاؤ۔ میں فارغ ہوں۔" اُن کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

جبران تو خود یہی چاہتا تھا، فوراً روانہ ہو گیا۔ حامد رانا آرام کرسی پر نیم دراز کسی سوچ

میں کھوئے ہوئے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی بولے۔

"لڑکے، ویل ڈن۔ تم نے جو کہا کیا۔ اور میرا خیال ہے، تم ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے ہو۔"

"شکریہ سر۔ مگر یہ اخباروں میں کیا آ رہا ہے؟"

"یہ تو چلتا ہے۔ سیٹھ کرامت کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اور اس سلسلے میں مجھ پر بہت دباؤ ہے۔ مگر میں جما ہوا ہوں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ وہ اس معاملے سے اس طرح نکل جائے گا' جیسے مکھن میں سے بال۔"

"مگر سر! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فیکٹری اُن کی ہے۔ ملازم اُن کے ہیں۔ محض اُن کے کہنے پر۔"

"محض اُن کے کہنے پر نہیں، وہ مکمل ثبوت پیش کریں گے۔ سب سے بڑھ کر منیجر کا بیان جو ابھی آف دا ریکارڈ ہے کہ اس سارے معاملے سے سیٹھ کرامت کا کوئی تعلق نہیں اور اُس نے یہ سب کچھ اپنے طور پر کیا ہے۔" حامد رانا نے بتایا۔

"تو کیا واقعی۔؟" جبران نے حیران ہو کر اُنھیں دیکھا۔

"نہیں شاید ایسا نہیں ہے۔ مگر شاید کوئی دھمکی یا کوئی لالچ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ زبان نہیں کھولے گا۔"

"تو پھر کیا ہمارا مشن ناکام ہوا۔" جبران نے مایوس ہو کر کہا۔

"نہیں۔ یہ بات بھی نہیں، اگرچہ ہمارے ہاتھ بندھے ہیں۔ مگر ہم پوری کوشش کریں گے اور اگر ناکام ہو بھی گئے تو یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیں گے کہ یہ جو اتنی زیادہ ہیروئن اور چرس برآمد کر کے ضائع کی گئی ہے، کم از کم یہ لوگوں تک نہیں پہنچ سکی۔"

"مگر جب تک ناگ کا سر نہ کچلا جائے گا کیا مزید زہر پیدا نہ ہوگا؟"

"ہاں۔ مگر ہم حتی الامکان کوشش کرتے رہیں گے، شاید کبھی کسی ناگ کا سر کچلنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو۔؟"

"دیکھو۔ ہمارا کام تو چراغ جلانا ہے۔ اب اگر ہوا کا کوئی جھونکا اُسے بجھا دیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم چراغ ہی نہ جلائیں۔" وہ اُسے سمجھانے لگے۔ "ہم تو چراغ جلائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اندھیروں کو دُور کرنے کی سعی کرتے رہیں گے۔"

جبران غور سے اُنھیں دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی وہ اُسے بالکل عثمان بھائی کی طرح لگتے تھے۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔؟"

"دیکھ رہا ہوں سر! کہ ان حالات میں بھی آپ کتنے پُر اُمید ہیں۔"

"جب تک تم جیسا ایک نوجوان بھی موجود ہے، میں اس ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں" اُن کے لہجے میں اُمید کی کھنک تھی۔

وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ پھر جب وہ اُن کی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلا تو اتنا مایوس نہیں تھا۔

اُسی شام جبران اخبارات کے صفحوں سے اُلجھا سیٹھ کرامت کے بارے میں صحافیوں کا ردِعمل پڑھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو۔" اُس نے بے دھیانی سے ریسیور کانوں سے لگایا۔

"ہیلو۔"

یہ آواز۔ اُسے کچھ یوں ہی محسوس ہوا۔ یہ آواز تو وہی ہے' جو کبھی اُس کے اندر جلترنگ سا بکھیر دیتی تھی۔ مگر نہیں۔ وہ کیسے ہوسکتی ہے۔ اُس نے غیر یقینی سے سوچا۔

"کون۔ آپ کون؟ کس سے بات کرنی ہے؟" اُس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"اب پہچانتے بھی نہیں۔ میں سمن ہوں۔" لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"جی فرمایئے۔ کیوں زحمت فرمائی۔؟" جبران کا لہجہ خود بخود طنزیہ ہوگیا۔

"جبران۔" اُس نے کچھ رُک رُک کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"

جبران کے جسم میں جیسے آگ سی لگ گئی۔

"تو کیا اب تمہارے افسوس سے کوئی فرق پڑ سکتا ہے؟" اُس نے انتہائی برف جیسے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"شاید نہیں۔ مگر تم مجھے معاف کردو تو شاید میرے دل کو۔"

"دل۔ تمہارے دل کی تسلی کے لئے کیا پروفیسر امین کافی نہیں۔؟" اُس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی' جو چیرتی چلی جائے۔

"وہ۔ وہ مجھے تمہارے نام کے طعنے دیتے ہیں۔ کچوکے لگاتے ہیں۔ اور اُن کا رویّہ پچھتاوے کے احساس کو بڑھا دیتا ہے۔ اُن کے اندر اتنا کینہ بھرا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ شاید میں نے عجلت میں بہت غلط فیصلہ کیا۔" سمن کے لہجے میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔

"سمن بیگم۔ تمہارے پیچھے سارے دروازے بند ہوچکے ہیں۔" جبران ایک دم سفاک ہوگیا۔ حالانکہ کبھی اس دشمن جاں کا احساس اُس کے دل کو موم کی طرح پگھلا دیا کرتا تھا۔ اُس کے لہجے کی تلخی بڑھتی جارہی تھی۔

"اور مجھے افسوس ہے، سمن بیگم۔ کہ نہ تم اچھی محبوبہ بن سکیں، نہ اچھی بیوی۔" اُس نے تپے تپے لہجے میں کہا۔ "اور پلیز، آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔" اُس کے کانوں میں سیسہ اُنڈیل کر اُس نے ریسیور پٹخ دیا۔

"کیا کوئی کسر رہ گئی تھی جواَب۔"

اُداسی اُس کے اندر گہر کی طرح گرنے لگی۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔ بہت سے اَن کہے دُکھ اور سفاک لمحے' جو اُس پر سے گزر گئے تھے۔ مگر اپنا نقش چھوڑ گئے تھے۔ دل پر جانے کیا کچھ مرتسم تھا جو مٹائے نہیں مٹتا تھا۔ اور وہ ظالم خنجر اُٹھائے پھر نئے نقش اُبھارنے آگئی تھی۔

"آدمی کوئی کانچ کا کھلونا نہیں ہے جو بار بار توڑا اور جوڑا جائے۔ اور نہ ہی اتنا گرا ہوا انسان ہوں کہ پروفیسر امین کی بیوی سے عشق لڑاؤں۔ واٹ آ ربش۔ کتنا گھٹیا سمجھا ہے اُس نے مجھے۔"

وہ کتنی ہی دیر اپنا خون جلاتا اور بال نوچتا رہا۔

جبران کا خیال تھا کہ اُس نے بہت محتاط ہو کر کام کیا ہے، مگر وہ جو دوا ور دو چار کرنے کا ہُنر جانتے تھے، سارا حساب کتاب لگا چکے تھے شاید۔

اُس دن جبران کسی کام سے نکلا تھا، مگر پھر اپنے پاؤں پر واپس نہ لوٹ سکا۔ پتا نہیں کون ظالم تھا، جس نے اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ اچانک ہی وہ سفید گاڑی کہیں سے نمودار ہوئی تھی اور گولیوں کی بوچھاڑ کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ جبران کو تو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ جو وہ اپنے دفاع کا سوچتا۔ وہ ہنستا مسکراتا، جیتا جاگتا، زندگی سے بھرپور لڑکا، جو بُرائیوں کے خلاف جہاد کرنے نکلا تھا، چُور چُور ہوچکا تھا۔ اُس کا سفر بیچ راستے میں ختم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوگیا تھا۔ پھر جانے کس نے اُسے پہچانا اور کس نے گھر خبر پہنچائی۔ ہر طرف ایک کہرام سا مچ گیا۔ امی جان کو تو سکتہ ہوگیا تھا۔ عالیہ، نادیہ، عفان چیخ چیخ کر اُسے پکار رہے تھے۔ مگر وہ شاید اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے بہت دُور نکل گیا تھا۔ اُس کی ذہانت سے بھرپور خوبصورت، روشن آنکھیں بند تھیں۔ جیسے دنیا کی ناانصافیوں کو دیکھ دیکھ کر تھک چکی ہوں۔ اُس کا اُمنگوں بھرا دل خاموش تھا اور جسم پر زخم ہی زخم، امتیازی تمغوں کی طرح سجے ہوئے۔ اور گو اُس کا سارا جسم خون خون تھا۔ مگر چہرہ بالکل صاف شفاف اور بے داغ۔ اور لبوں پر دھیمی سی مسکان۔ جانے آخری لمحوں میں کون سی بات یاد آئی تھی، جو مسکراہٹ کی صورت ہونٹوں پر منجمد ہوگئی تھی۔ عفان سہم کر رہ گیا تھا۔ کبھی روتا، کبھی ایک ایک کے آنسو پونچھتا۔ عثمان بھائی دیواروں سے سر ٹکراتے۔ جبران اُن کا بھائی ہی نہیں دوست اور غمگسار ساتھی بھی تھا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا، کہ اُسے زندہ کر کے اپنے سامنے بٹھالیں۔ چاہے بدلے میں ساری دنیا ہی کیوں نہ دینی پڑے، پر اُسے جانے نہ دیں۔ اُنھیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ کہ یہ پل بھر میں کیا ہوگیا۔ وہ تو اچانک اس لیے آگئے تھے، کہ اُسے سمجھا بُجھا کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ کیا معلوم تھا کہ ہمیشہ کا ساتھ چُھوٹتا ہے۔ وہ جبران جو اُنھیں بے حد عزیز تھا۔ جو کہا کرتا تھا۔

''عثمان بھائی میرا جی چاہتا ہے، دُنیا کے سارے دُکھوں، مصیبتوں اور آنسوؤں کو ایک بوتل میں بند کر کے دریا میں بہا دوں' وہی حد درجہ محبت کرنے والا بھائی اُن کی جھولی میں اتنا بڑا دُکھ ڈال کر چلا گیا تھا۔

ابّو جان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی تمام تر توانائیاں اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے صرف کر دی تھیں۔ اُن کی تو کُل پونجی یہی بچے تھے۔ خون میں لت پت جبران کو دیکھ کر صرف اتنا کہہ سکے۔

''بیٹے۔ باری تو ہماری تھی۔ تم نے کیوں اتنی جلدی کی۔ پھر وہ بے حال ہو کر اُس پر گر پڑے۔ جوان بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر اُن کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔

مگر نہ اُن کی چیخ و پکار اُسے روک سکی، نہ فریادیں۔ وہ بہنوں کا لاڈلا، بھائیوں کا دُلارا، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ اُن کے دیکھتے دیکھتے خاک کی تہہ میں جاچُھپا۔ اور وہ سب کچھ بھی نہ کر سکے۔ بس بہتی آنکھوں اور روتے دل سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ حامد رانا نے سُنا تو دوڑے دوڑے آئے۔ اُنھیں یقین نہیں آرہا تھا۔ کہ وہ جو عزم ویقین کی روشنی

آنکھوں میں لیے اُن کے گھر سے نکلا تھا، اتنی جلدی موت کی اندھیری وادیوں میں کھو گیا۔ وہاں کسی کی حالت بھی ایسی نہ تھی، کہ وہ اپنا تعارف کراتے۔ بس ابّو جان کے پاس بیٹھے افسوس کرتے رہے۔

اِردگرد عجیب سی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر شیرازی کے اسپتال والا واقعہ، پھر نادیہ کی منگنی کا ٹوٹنا۔ اور آخر میں اُسے بیچ بازار میں موت کے گھاٹ اُتارنا۔ دبی دبی زبان میں شبہات۔ کہ جبران کا تعلق ضرور کسی خطرناک گروہ سے تھا۔ حامد رانا کے کانوں میں کچھ باتیں پڑیں۔ اُنھیں بہت افسوس ہوا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے، جو ایسے موقع پر بھی باز نہیں آرہے تھے۔ اُنھوں نے ابّو جان کے جُھکے ہوئے سر اور بھری بھری آنکھوں کو دیکھا۔ بیٹے کی جوانمرگی کا غم الگ، لوگوں کی باتیں بھی اُنھیں بہت اذیت دے رہی تھیں۔ بے اختیار اُنھوں نے انہیں تسلی دی۔

''وہ آپ ہی کا بیٹا تھا صاحب۔ اور بڑے اونچے مقاصد لے کر نکلا تھا۔ یہ اور بات کہ عمر نے وفا نہ کی۔'' اِس سے زیادہ کہنا انہیں کچھ مناسب نہ لگا۔

اُس وقت تو وہ چلے گئے۔ مگر جب دوبارہ آئے تو اُنھوں نے ساری باتیں تفصیل سے بتائیں، کہ کس طرح جبران اُن کے پاس آیا تھا۔ اور کتنے تھوڑے سے وقت میں اُس نے کیا کچھ کیا۔ اور یہ کہ وہ اُسے کتنا پسند کرنے لگے تھے۔

''مجھے لگتا ہے، جیسے میرا کوئی اپنا، جیسے میرا سگا بھائی مجھ سے جُدا ہوگیا ہو۔'' حامد رانا نے افسردگی سے کہا۔ ''شاید، میں اسے سمجھا بُجھا کر واپس بھیج دیتا تو ایسا نہ ہوتا۔''

''وہ پھر بھی واپس نہ آتا۔'' ابّو جان کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔ ''اُس نے کہا تھا کہ وہ اور ہی راہوں کا مسافر ہے۔ اور میں سمجھتا رہا کہ وہ غلط صحبت میں پھنس گیا ہے۔''

''میں پہلے ہی کہتا تھا کہ میرا جبران ایسا نہیں ہے۔'' عثمان کی آنکھیں ضبط سے گلابی ہونے لگیں۔

''جب اُس نے آگے پڑھنے سے انکار کیا تو میں حیران تھا کہ جبران تو بہت سمجھ دار بہت محنت کرنے والا ہے۔ پھر کیوں نہیں مان رہا۔ وہ ہر بات مجھے بتاتا تھا۔ مگر اتنی بڑی بات چُھپا گیا۔ اور سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنا سُنہرا مستقبل، قیمتی زندگی اور ہماری ساری خوشیاں۔''

''مگر ایک بڑے مقصد کے لیے۔'' حامد رانا نے آہستہ سے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہم تو اُسے کھو بیٹھے۔ میرا دوست، میرا بھائی ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ کاش، میں کسی طرح اُسے بچا سکتا۔ اپنی جان دے کر بھی' مگر تقدیر سے کون لڑ سکا ہے۔'' اُن کی آواز بھرانے لگی۔

امی جان چُپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر اتنی بے بسی، مظلومیت اور بے بسی تھی، جیسے اُن کی زندگی کا سارا سرمایہ اُن کی آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہو گیا ہو۔

حامد رانا بے اختیار اُن کے گھٹنے چُھو کر بولے۔

''ماں جی، آپ کا بڑا نقصان ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے بیٹے کو نہ بچا سکا۔ اور گو تلافی نا ممکن ہے، مگر مجھے بھی جبران کی جگہ سمجھیں۔''

''بچے، اس میں تمہارا کیا قصور، میری اپنی تقدیر۔''

پھر وہ ایسی پھوٹ کر روئیں کہ حامد رانا کو اپنا جگر کٹتا محسوس ہوا۔ اور عالیہ، نادیہ گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

بڑی دیر بعد وہ سنبھلیں تو اُنہوں نے حامد رانا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''عالیہ، اپنے اس بھائی کے لیے چائے بنا لاؤ۔ میں نے اُسے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔''

حامد رانا منع کرتے رہے، مگر عالیہ لپک کر چائے بنا لائی،

اور ان سب کے ساتھ چائے پیتے اور باتیں کرتے ہوئے پل بھر کے لئے بھی حامد رانا کو کسی اجنبیت یا غیریت کا احساس نہ ہوا۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہوتی گئی۔ کبھی ہفتہ بھر وہ چکر نہ لگا پاتے تو امّی جان فون کر کے اُنھیں بلوا لیتیں۔ اُن کی والدہ اور بہنیں بھی کئی بار آئیں۔ پھر یہ فیملی ٹرمز اُس وقت اور زیادہ بڑھ گئے، جب حامد رانا کی والدہ نے نادیہ آپی کا رشتہ حامد رانا کے لئے مانگا۔ حامد رانا اُن کے لیے دیکھے بھالے تھے۔ پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے اور ایک اعلیٰ پوسٹ پر فائز اس لیے کسی کو تردد نہ ہوا۔ اور نادیہ آپی دلہن بنی حامد رانا کے ساتھ میکے کی دہلیز پار کر گئیں۔

جبران کا قاتل گرفتار نہ ہو سکا۔ اگرچہ حامد رانا نے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ سب کے لیے قصۂ پارینہ بن گیا۔ مگر گھر کے افراد اُسے فراموش نہ کر سکے۔ خاص طور پر عالیہ۔ نادیہ کے جانے کے بعد وہ اور بھی تنہا ہو گئی تھی۔ امی جان اور ابو جان تو اپنے ہی غموں میں مبتلا سارے

جگ سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ امّی جان نے گویا تخت ہی پکڑ لیا تھا۔ بیٹھی لمبے لمبے وظائف کرتیں اور اپنے بچوں کی درازی عمر کے لیے دعائیں مانگا کرتیں۔ ذرا کھٹکا ہوتا تو دل تھام لیتیں۔ لگتا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہے۔ ابو جان کتابوں پر جُھکے جانے کن سوچوں میں کھوئے رہتے۔ وہی گھر جہاں سب بہن بھائیوں کی ہنسی گونجتی تھی۔ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اُداسی جیسے در و دیوار سے ٹپکتی۔ مسکرانا جُرم لگتا۔ تو ہنسنا گناہ۔ عالیہ سارا وقت تنہا بیٹھی سوچتی رہتی۔ ''یہ اُن کے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔'' نادیہ، فریحہ آ جاتیں یا کبھی عثمان بھائی یا عفان تو کچھ رونق ہو جاتی۔ ورنہ وہی تنہائی اور سناٹا۔ عالیہ کبھی غور کرتی یا حالات کے تانے بانے ملاتی تو اُسے سارا قصور پروفیسر امین کا نظر آتا۔ وہ جو خضر صورت رہزن تھے۔ اور اپنی آستینوں میں خنجر چُھپائے پھرتے تھے۔ کبھی وہ خدا سے شکوہ کرتی۔ کبھی تکیے میں مُنہ چُھپائے گُھٹ گُھٹ کر روتی۔ اور مُنہ بھر بھر کر پروفیسر امین اور جبران کے قاتلوں کو بددُعائیں دیتی۔ پھر بھی دل کو تسلی نہ ہوتی تو بار بار قسمیں کھاتی کہ چاہے کچھ بھی ہو، کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی راستے، کسی موڑ پر وہ اس پروفیسر امین سے ضرور بدلہ لے گی۔ اُس کے چہرے کی نقاب کھینچ کر لوگوں کو اُس کا اصل چہرہ دکھائے گی۔ اُسے بھری محفل میں رُسوا کرے گی۔ کہ لوگو دیکھو، یہ ہے وہ چہرہ۔ جو جبران کے خون سے آلودہ ہے۔ یہ ہے وہ بھیڑیا' جس کے پنجے اُس کی ہتھیلیوں میں چُھپے ہوئے ہیں۔

مگر ہوا کیا۔ جب وہ بدلہ لینے پر قادر ہوئی تو ساری قسمیں بھول گئی۔ تب وہ سیکنڈ ائیر میں تھی، جب معین ملک نے اُن کے کالج میں داخلہ لیا۔ وہ مائیگریٹ ہو کر وہاں آیا تھا۔ جب اُس نے اپنی فرینڈ سے ٹاپ کرنے والے لڑکے معین ملک کا نام سُنا تو فوراً سمجھ گئی کہ یہ پروفیسر امین کا وہی بھائی ہے' جس کی خاطر اُنہوں نے جبران کے پاؤں تلے انگارے بچھا دیے تھے۔ پہلی بار جب عالیہ نے اُسے دیکھا تو اُس کے اندر غیظ و غضب کا ایسا طوفان اُٹھا کہ اُس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ دانتوں کو ہونٹوں تلے کاٹتی، انتہائی نفرت سے اُسے دیکھتی وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ اگرچہ فورتھ ایئر میں تھا، مگر ایک کالج میں رہتے ہوئے کبھی نہ کبھی مُڈ بھیڑ ہو ہی جاتی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایسی آسودہ سی مسکراہٹ ہوتی کہ عالیہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ ایک احساسِ تفاخر سا کہ کوئی اُس کا مدِ مقابل نہیں۔ برتری کے احساس سے تنی تنی سی گردن۔ عالیہ کا جی چاہتا کہ اُس کی مسکراہٹ نوچ لے۔ اُس کے اُگ-

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انگ سے ٹپکتی طمانیت کو مجروح کردے۔ اُس کی آنکھوں میں کانٹے چبھو دے۔ اور اُس کے سارے جسم کو خون خون کر دے۔ مگر وہ کچھ نہ کرسکتی تھی، صرف بے بسی سے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔

اُنہی دنوں اُس کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے اُسے کالج میگزین کا ایڈیٹر منتخب کیا گیا۔ اور چونکہ معین ملک ڈرامیٹک سوسائٹی کا سیکرٹری تھا' اس لیے اُس کا واسطہ اکثر اُس سے پڑنے لگا۔ وہ اُسے دیکھ کر راستہ بدل دیتی۔ کترا کر گزر جاتی۔ اور اگر کبھی انتہائی مجبوری کے عالم میں بات کرنا پڑتی' تو اُس کی آنکھوں میں اتنی نفرت اور بیزاری ہوتی کہ حد نہیں، مگر معین نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ یا شاید اُس نے کبھی دھیان نہ دیا ہو۔ ہاں کبھی اُسے تعجب ہوتا کہ وہ اُس سے اتنا کتراتی کیوں ہے۔ اُسے دیکھتے ہی راستہ کیوں بدل دیتی ہے۔ یا شاید اُس کی یہی ادا اُسے بھا گئی۔ وہ کالج میگزین کے لئے مواد چھانٹ رہی تھی کہ وہ اُس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''عالیہ! کیا تم جانتی ہو کہ تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو۔ اپنی ساری کج ادائیوں کے ساتھ۔'' اُس نے ایک دم سے کہا۔

پل بھر کے لیے عالیہ ساکت سی ہوگئی۔ پھر نفرت کے اس طوفان پر قابو پانا اُس کے لئے ناممکن ہوگیا، جو کبھی کبھی اُسے جکڑ لیتا تھا۔

''اور آپ جانتے ہیں کہ آپ سے مجھے کتنی نفرت ہے؟''

اُس کی آنکھوں میں آگ سُلگ رہی تھی اور شاید کسی نامعلوم سے غم کا احساس۔ معین ملک ششدر رہ گیا۔ ظفر جو معین ملک کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ہنس پڑا۔

''کیا فلمی ڈائیلاگ ہے۔''

''شٹ اَپ۔'' معین سُرخ چہرہ لیے باہر چلا گیا۔

عالیہ نے اُسے یوں باہر جاتے دیکھا تو اُسے اپنے اندر جلتی آگ پر اوس سی پڑتی محسوس ہوئی۔

عالیہ کا خیال تھا، کہ اب وہ اُس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ مگر وہ تو اور بھی اُس کے اردگرد چکر لگانے لگا۔ جب بھی پاس سے گزرتا کوئی نہ کوئی معنی خیز اور شوخ جُملہ اُس کی طرف اُچھال دیتا۔ وہ کتنی بھی نفرت، بیزاری اور سرد مہری ظاہر کرتی، وہ خاطر میں نہ لاتا۔ شاید اُسے ضد ہوگئی تھی یا وہ واقعی اُسے پسند کرنے لگا تھا۔

عالیہ کی فرینڈز پوچھتیں۔ اُس میں کمی کیا ہے۔ اتنا لائق فائق۔ خوش شکل۔ عالیہ کا بتاتی، اُس میں کمی کیا ہے۔ کبھی سوچتی۔ واقعی اُس کا رویّہ مناسب نہیں۔ کبھی پلان بناتی، وہ اُس سے نرمی سے پیش آئے گی۔ ہر ممکن حوصلہ افزائی کرے گی۔ اور جب وہ اتنا دُور نکل آئے گا کہ واپسی اُس کے لئے ناممکن ہوجائے گی، تو وہ اُسے بیچ چوراہے پر لاکر دُور ہٹ کر اُس کا تماشا کرے گی۔ امین ملک نے جبران کی محبت چھینی تھی۔ وہ معین ملک کے دل پر ضرب لگائے گی۔ مگر اُس کے سارے پلان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ قریب جانے کی کوشش کرتی تو پاؤں پیچھے کی طرف ہٹتے۔ نرمی سے بات کرنا چاہتی تو آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ ہنسنا چاہتی تو آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے۔ اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے نفرت کا اظہار کرتی ہٹ جاتی۔

ایک بار ایسے ہی کسی موقع پر معین نے اُسے روک کر کہا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، جیسے تمہیں مجھ سے شدید نفرت ہے۔ مگر کیوں؟''

''تو گویا ابھی شک ہی ہے۔'' وہ تحقیر سے ہنسی۔

''مگر کیوں؟'' اُس کا چہرہ سُرخ پڑتا محسوس ہوا۔

''مجھے اُن چھچھورے لڑکوں اور نالی کے کیڑوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا' جو دل ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔'' اُس نے بڑے ضبط سے کہا۔

''بس یا کچھ اور۔'' وہ اُسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اور کیا...... یہ وجہ کافی نہیں۔'' اُس کی بے نیازی برقرار رہی۔

''تو پھر یقین رکھو کہ میں ایسا لڑکا نہیں۔'' اُس نے مطمئن ہو کر کہا۔

بعد میں رخسانہ نے بتایا کہ۔ ''وہ دوستوں میں کہتا پھرتا ہے۔ میں اس موم سی گڑیا کو پگھلا کر چھوڑوں گا۔''

''میں موم کی گُڑیا نہیں۔ آئرن گرل ہوں۔ اُسے بتا دینا، کسی خوش فہمی میں نہ رہے۔'' اُس نے تپ کر کہا۔

معین کو پتا چلا تو سیدھا اُس کے پاس چلا آیا۔

''سنو چاہے تم آئرن گرل ہو۔ یا پتھر کی کوئی مخلوق' میں تمہیں پگھلا کر چھوڑوں گا۔''

''یہ ناممکن ہے اور تمہاری خوش فہمی۔'' اُس نے حقارت سے کہا۔ ''میرے بھائی کا قاتل۔'' اُس کی آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا۔ بڑی شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ معین ملک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا گلا گھونٹ دے۔ وہ اُس پر جھپٹنے کو بڑھی بھی' مگر پھر اُسے ہوش آ گیا۔ اُسے خوف سا محسوس ہوا کہ اگر یوں ہی طنابیں اُس کے ہاتھ سے چھوٹتی رہیں تو شاید کبھی وہ اُسے قتل ہی کر ڈالے یا پھر کوئی اور انہونی ہو جائے، پھر کیا اُس کے والدین زندہ رہ پائیں گے۔"

"نہیں۔" اُس نے فیصلہ کیا۔ اُسے سارے قصے کو ختم کر دینا چاہیے فی الفور۔

"میں انگیجڈ ہوں' اور اُس کی گریس فل شخصیت کے سامنے سب کچھ، ہیچ۔ سو تمہاری ساری کوششیں لاحاصل ہیں' اور سب جدوجہد لایعنی۔"

وہ اُسے اپنی ہی نظروں میں گراتی اُس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ مگر بعد میں اُسے بہت افسوس ہوا، نہیں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کہ میں اسے جکڑ لیتی آکٹوپس کی طرح۔ مگر شاید میں بہت بزدل ہوں' بہت کم حوصلہ' اور اتنی بڑی بڑی قسمیں کھانے کے باوجود میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اس دن گھر آ کے وہ جبران کو یاد کر کے بہت روئی۔ "کاش" جبران بھائی میں آپ کا بدلہ لے سکتی۔ مگر میں بہت کم ہمت ہوں، بہت بزدل اور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ سوائے اپنا آپ نوچنے کے۔"

کتنے دن وہ ڈسٹرب رہی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے، اُس کی ذہنی ٹینشن معین کو دیکھ کر بڑھ جاتی اور پھر وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ وہ امی جان اور ابو جان کو کوئی دُکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے خاموشی سے اپنی مائیگریشن کروالی۔ ذہنی ٹینشن کچھ کم ہوئی تو وہ یکسوئی سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ ماضی کی تلخیوں کو بھلانے میں بہت وقت لگا۔ اب وہ ظاہر مطمئن تھی۔ مگر کبھی کبھار کوئی کسک سی دل میں جاگ اُٹھتی تھی' جو بے ساختہ پلکیں بھگو دیتی۔ پھر وہ پہروں جبران کو یاد کیے جاتی۔ وہ کالج میں لیکچرار تھی' اور ایک مقدس پیشے سے وابستہ۔ بے حد سنجیدہ اور سوبر سی۔ مگر آج اتنے سالوں بعد پروفیسر امین ملک کو دیکھ کر اُسے کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں۔ مندمل زخم اچانک یوں ہرے ہوئے کہ وہ بے قابو ہو گئی۔ شاید مدت سے اُس کے لاشعور میں جو ایک خواہش پلتی رہتی تھی' کہ وہ اس شخص کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب ضرور سرکائے گی' یہ اسی کا شاخسانہ تھا۔ اسی کی کولیگ اور دوست مسز ثمینہ ظہور بار بار اُس سے پوچھتیں کہ اُس دن اُسے کیا ہوا تھا۔ وہ بے بسی سے اُنہیں دیکھ کر رہ جاتی۔ وہ مصر تھیں' اور عالیہ بے چین۔ "اب کیا بتاؤں کہ کیا ہوا تھا۔ اور کیوں حواس کھو بیٹھی تھی۔" وہ کھڑکی میں جھک گئی۔

"تم نے جبران کو دیکھا ہوتا تو شاید میرے زخموں کا اندازہ کر سکتیں۔ اُس جیسے بھائی کو کھو دینا' اور پھر اس انداز میں کھونا۔ حیرت ہے، میں زندہ کیسے رہی۔ مگر مجھے جینا ہے، اس آس میں کہ کبھی تو کوئی میرے بھائی کے قاتلوں کو سزا دے گا۔ کوئی تو انصاف کرے گا۔ مگر قاتل کون ہے۔ پروفیسر امین یا وہ دیوانہ شاعر جو اب گلیوں میں بچوں کو کنکر اُچھالتا پھرتا ہے۔ سیٹھ کرامت حسین' جو شاید اپنی کوئی کرامت دکھا گیا تھا۔ یا وہ شخص جس نے اُس کے اُمنگوں بھرے دل کو، اُس دل کو' جو ساری دنیا کے لوگوں کو دُکھوں اور پریشانیوں سے بچا لینا چاہتا تھا۔ زخم زخم کر دیا۔ سارا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا' یا پھر موت کے وہ سوداگر' جو گلیوں' محلوں اور شہروں میں موت بیچتے پھرتے ہیں' اور کوئی اُنہیں روکنے والا نہیں۔"

اُس نے مُڑ کر دیکھا، ثمینہ ظہور اُسے اُلجھی اُلجھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اگرچہ اپنے دل کے زخم عیاں کرنا اُسے پسند نہ تھا' مگر اب جبکہ اس کے ہاتھوں میں ثمینہ ظہور کے کیپٹن بھائی کی انگوٹھی چمک رہی تھی، تو اُسے رشتے کی نزاکتوں کا احساس بھی تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔

"ثمینہ تم پریشان مت ہو۔ بس کچھ پرانے زخم تھے' جو اُدھڑ گئے۔" اُس نے دھیمے سے کہا۔ پھر وہ اُس کے پاس بیٹھ کر اپنے دل میں چبھا ایک ایک کانٹا باہر نکالنے لگی۔ اور اُس کے ساتھ ساتھ ثمینہ کی آنکھیں بھی بھیگتی رہیں۔ بالآخر اُس نے آنسو پونچھ کر ثمینہ کی طرف دیکھا۔

"اب تم ہی بتاؤ۔ میں کس کس سے بدلہ لوں' اور کیونکر ایک کمزور اور بے بس لڑکی کر ہی کیا سکتی ہے، آخر۔ سو میں نے اپنا حساب خدا پر چھوڑ دیا۔ اور بدلہ لینے سے دستبردار ہو گئی، مگر آج جانے کیسے امین ملک کو دیکھتے ہی مجھے خود پر اختیار نہ رہا۔"

وہ تھک کر چپ ہو گئی' تو ثمینہ نے اُسے گلے لگا لیا۔

"عالیہ! میری جان! کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، کہ آدمی کا اختیار خود پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ سو تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں' اب بس کرو۔ بہت رو چکیں۔ مانا تمہارا دُکھ بہت بڑا ہے، مگر جانے والا تو لوٹ کر نہیں آئے گا نا۔ آؤ اُس کے ایصالِ ثواب کی دُعا کریں۔"

"ہاں، اس کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وضو کے لئے اُٹھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

”کیا میرے بھائی جبران کی قربانی رائیگاں جائے گی۔ اُس نے جس زہر کو معاشرے میں پھیلنے سے روکنے کے لئے جان دی۔ وہ تو یوں ہی پھیل رہا ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص نہیں' جو اس زہر کو پھیلنے سے روکے، اس سرطان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے۔ شاید کوئی ہو۔ کوئی ایسا مسیحا' جو کبھی آئے اور نیلے پڑتے بدن سے سارا زہر چُوس لے' اور ہاتھوں میں پھول تھما دے۔ کوئی ایسا جو خزاں رُتوں کو گلاب کر دے۔ ہاں شاید...... کبھی نہ کبھی...... کوئی آئے۔ مگر تب تک مجھے انتظار کرنا ہے۔ مجھے بھی اور اُنہیں بھی جو پیالہ بھر بھر زہر پیتے ہیں' اور انتظار کرتے ہیں کسی ایسے شخص کا' جو اُن کے ہاتھوں سے پیالہ چھین کر توڑ دے۔ جو روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں' اور اپنے تڑپنے کا تماشا کرتے ہیں۔ جانے کب اُن کا انتظار ختم ہوگا۔ جانے کب......“

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

Download Free Urdu Books, Urdu Islamic books, Urdu Novels and Urdu dictionaries free from www.iqbalkalmati.blogspot.com